نوائے ادب بمبئی

ندوی نمبر

تاریخ اشاعت ۱۵ جنوری ۱۹٦۹

جلد ۲۰	جنوری ۱۹٦۹	شمارہ ۱

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	عبدالرزاق قریشی	۲
۲	آہ ! سید نجیب اشرف ندوی صاحب	صباح الدین عبدالرحمٰن	۵
۳	ندوی صاحب کی طرز تحریر	عبدالحلیم ساحل	۲۵
۴	ندوی صاحب اسماعیل کالج میں	شریف احمد	۳۹
۵	نجیب اشرف ندوی : ایک تاثر	علی جواد زیدی	۵۰
٦	استاد مرحوم	عبدالرزاق قریشی	۵٦
۷	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ	خورشید نعمانی	٦۷
۸	نجیب اشرف صاحب کے چند خطوط	مختار الدین احمد	۷۴
۹	مکتوبات ندوی صاحب بنام.... ثم کراچوی		۸۲
۱۰	تبصرے	(ڈاکٹر) آدم شیخ	۸۵

۳۴۶ وحید النساء
چند دکھنی مرثیہ‌گو شعراء
(سب‌رس ، حیدرآباد ، ۶۹ جولائی)
ایک دکھنی شاعر «سالک» کے مرثیوں کا نمونہ پیش کیا ہے ۔

۳۴۷ وزیر آغا ڈاکٹر
غالب کا ذوقِ تماشا
(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹، ۲۳۵ تا ۲۴۰)
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب حیات و کائنات کا تماشہ کرنے کے لئے فاصلے کا نہیں قرب کا قائل ہے اور زندگی کے ہر مظہر میں اس کے خاص وصف کی نسبت سے دلچسپی لیتا ہے ۔

۳۴۸ وزیر آغا ، ڈاکٹر
غالب ــــ ایک جدید شاعر
(صحیفہ ، لاہور جنوری ۶۹ ۴۰۱ تا ۴۳۱)
غالب کو جدید شاعر ثابت کیاہے ۔

۳۴۹ وصی احمد علیگ ، ڈاکٹر
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر
(فروغ اردو، لکھنؤ ، دسمبر و نومبر ۶۸ ، ۵۹ تا ۶۶)
نمونے کے طور پر چند الحاقی عناصر جو کلام غالب کے ساتھ روا رکھے گئے ہیں پیش کئے ہیں۔

۳۵۰ یسین علی خاں میر
غالب کی اصلاحیں خود اپنے کلام پر
(سب‌رس ، حیدرآباد، ۶۹ فروری)
غالب کی اصلاحوں کے نمونے بتائے ہیں اور ان کی مناسبت پر اظہار خیال کیا ہے ۔

۳۵۱ یوسف جمال انصاری
کلام غالب میں طنز و ظرافت
(قسط اول)
(صحیفہ ، لاہور، اپریل ۶۹ ، ۹۸ تا ۱۰۸)
غالب کے طنز و مزاح پر روشنی ڈالی ہے ۔

۳۵۲ یونس جعفری ، ڈاکٹر
خطوط سرور
(نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی ۶۸ ، شمارہ ۳ ، ۱۲ تا ۲۶)
رجب علی بیگ سرور کے ۸ غیر مطبوعہ خطوط پیش کئے ہیں جو کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مربیوں کو لکھے تھے ۔

تاریخ و سیاسیات

۳۵۳ آصف فیضی
گاندھی جی اور اقلیتیں
(آجکل، دہلی ، اکتوبر ۶۹ ، ۲۹ تا ۳۲)
یہ بتایا ہے کہ گاندھی جی کی نظر میں ہندو مسلمان سب برابر تھے ، اقلیتوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دی ۔

۳۵۴ ابو النصر محمد خالدی
قاموس الوفیات لاعیان الاسلام

شذرات

(پروفیسر) سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی وفات پر شہر کی چند علمی و تعلیمی انجمنوں کے مشترکہ اہتمام سے ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا جس میں ندوی میموریل فنڈ کی بھی ایک تجویز پاس ہوئی تھی۔ تجویز کے مطابق فنڈ کی رقم سے ایک ماہانہ اسکالرشپ جس کا نام ندوی میموریل اسکالرشپ ہوگا، ایک ایسے طالب علم کو دی جائے گی جو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اردو کے کسی موضوع پر دانشگاہ بمبئی سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیق کرے گا رقم کی فراہمی کا کام شروع ہوچکا تھا۔ لیکن انجمن کی بعض دوسری اہم تر اور فوری مصروفیتوں کی وجہ سے عارضی طور پر رک گیا۔ اب اسے دوبارہ شروع کیاجارہاہے۔ مرحوم کے احباب اور تلامذہ سے خصوصاً درخواست ہے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔ رقم جنرل سکریٹری، انجمن اسلام (دادا بھائی نوروجی روڈ، فورٹ، بمبئی) کے نام خواہ نقد کی صورت میں یا منی آرڈر یا چک کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔

بمبئی یونیورسٹی الحاقی یونیورسٹی ہے۔ صرف سماجیات اور معاشیات میں پوسٹ گریجوئٹ طلبہ کے لئے اس کا تدریسی شعبہ تھا۔ اس سال (۱۹۶۹ء) سے اس نے چار نئے تدریسی شعبے، ہندی، گجراتی، مراٹھی اور سندھی کے پوسٹ گریجوئٹ طلبہ کے لئے کھولے ہیں۔ بمبئی میں مراٹھی کے بعد سب سے زیادہ بولی اور لکھی اور پڑھی جانے والی زبان اردو ہے۔ بمبئی یونیورسٹی نے اس کی طرف سے بے توجہی برت کر اس کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ اسی طرح یونیورسٹی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ جون ۱۹۷۱ء سے اس سے ملحق کالجوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی کے علاوہ مرہٹی، گجراتی اور ہندی بھی ہوگا۔ اس معاملے میں بھی اردو سے بےانصافی کی گئی ہے۔ یونیورسٹی کی پرانی روادارانہ روایات کے پیش نظر اس کی اردو سے

سرد مہری اور اس کے ساتھ بے انصافی پر حیرت ہے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ سینٹ کے اردو داں ممبر اور اردو بورڈ کے اساتذہ یونیورسٹی کی اس بے انصافی پر بالکل خاموش رہے۔ اردو کے حق کے لئے لڑنا تو الگ رہا ان کی «احتیاط» نے ان کی زبان پر حرف شکایت بھی نہ آنے دیا۔

سعدی از دست خویشتن فریاد

تقریباً ڈیڑھ سال پہلے بمبئی کے چند اردو دوست حضرات کی تحریک پر بمبئی میں اردو کمیٹی کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک طرف اردو کی تحریک کو منظم اور پُراثر بنانا تھا اور دوسری طرف اردو کی تمام اہم شخصیتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا تھا۔ مجلس نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں وغیرہ کو بھی اس میں شریک کیا جائے گا تا کہ تنگ نظر و تنگ دل لوگ اردو تحریک کو صرف مسلمانوں کی تحریک کہہ کر فرقہ واریت کا زہر نہ پھیلا سکیں۔ کمیٹی کو بمبئی کے تقریباً ہر نقطۂ نظر کے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں وغیرہ کا تعاون حاصل ہوگیا تھا اور اس نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ لیکن دو، تین سرگرم ارکان کی شدید علالت کی وجہ سے کام کی رفتار پہلے سُست پڑگئی اور پھر رُک گئی۔ چند مہینے ہوتے ہیں اسے از سرِنو شروع کیا گیا ہے اور اب یہ قطعی طے پا گیا ہے کہ دسمبر ۱۹۶۹ء کے آخری ہفتے میں اردو کمیٹی کا آل انڈیا کنونشن ہوگا۔ کمیٹی نے اس کے افتتاح کے لئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی رضامندی بھی حاصل کرلی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے چوٹی کے ادیبوں، شاعروں وغیرہ نے کمیٹی کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کنونشن کے انعقاد سے گوناگوں خوشگوار نتائج نکلیں گے اور اردو تحریک میں ایک نئی روح پیدا ہوسکے گی۔

پچھلے چند مہینوں میں اردو و فارسی دنیا کی تین اچھی شخصیتیں اٹھ گئیں: ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر محمد اسحٰق، علی عباس حسینی۔ ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے صدر تھے اور اردو دنیا

میں مختلف حیثیتوں سے متعارف تھے۔ ان کی تحریروں میں اکثر «سنسنی خیزی» کا التزام ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے تو یہ انداز بدل گیا۔ وہ زبان و بیان کو اہمیت دینے والے ادیبوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر محمد اسحٰق کی وفات سے ہندوستان کی فارسی دنیا میں جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کے پُر ہونے کے لئے ایک مدت چاہئے۔ ان کا آبائی وطن بہار تھا۔ لیکن انہوں نے کلکتے میں سکونت اختیار کرلی تھی اور ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز و انجام بھی وہیں ہوا۔ وہ کلکتا یونی ورسٹی میں فارسی کے پروفسر اور صدر شعبہ رہ چکے تھے۔ انہیں جدید فارسی سے خصوصاً لگاو تھا یہی لگاو انہیں دوبار ایران لے گیا۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف جدید ایرانی ادب کا مطالعہ کیا بلکہ وہ ایرانی دانشوروں اور شاعروں سے بھی متعارف ہوئے۔ انہیں کی کوششوں سے کلکتے میں ایران و ہند سوسائٹی وجود میں آئی اور انہیں کی مساعی سے ایران و ہند نام کا ایک سہ ماہی علمی مجلہ جاری ہوا۔ جدید فارسی ادب سے متعلق کئی تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

علی عباس حسینی ہماری زبان کے ایک مشہور افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر اوسط درجے کے تعلیم یافتہ مسلم گھرانوں کی معاشرتی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ لیکن انہوں نے دیہاتی زندگی کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان کے بہت سے افسانوں کا محور دیہات ہے اور ان میں بعض افسانے ایسے ہیں جو اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ آخر عمر میں انہوں نے مزاحیہ نگاری کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ اردو ناول نگاری کی ایک تاریخ بھی ان کی یادگار ہے۔ اُن کا آبائی وطن غازی پور تھا۔ لیکن پنشن لینے کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ کچھ دنوں ان کا قیام بمبئی میں بھی تھا۔ وہ متین و مہذب اور لکھنؤ کی شستہ تہذیب کے پیرو تھے۔

*صباح الدین عبدالرحمٰن

آہ! سید نجیب اشرف صاحب ندوی

مصائب اور تھے پر ان کا جانا عجیب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

اس مقالہ میں ہم کو ایک ایسی ممتاز اور پر دلعزیز شخصیت کا ماتم کرنا ہے۔ جس میں علمی رعنائیوں، ادبی دلآویزیوں اور انسانی خوبیوں کی بڑی رنگارنگی تھی۔ جناب سید نجیب اشرف ندوی (جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) ایک اچھے مؤرخ تھے، ایک اچھے ادیب بھی، ایک اچھے نقاد بھی، ایک اچھے اڈیٹر بھی اور بہت ہی محبوب استاد بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بہت شریف انسان بھی تھے جن کا دل محبت، شفقت، موانست اور اخلاص کی خوشبوؤں سے عطر بیز تھا۔

مجھکو شروع سے ان کی زندگی کے مختلف جلوؤں کو دیکھنے کی سعادت حاصل رہی۔ وہ میرے شفیق بزرگ اور ہموطن تھے میرا بچپن کا زمانہ تھا تو ان کا عنفوان شباب تھا۔ جب میرا عنفوان شباب تھا تو وہ جوان رعنا تھے۔ میں جب جوان ہوا تو وہ سن کہولت کو پہنچے اور جب میں سن کہولت کو پہنچا تو وہ بوڑھے تھے۔ اور جب میں بوڑھا ہونے کو آیا تو ان کو تسنیم و کوثر کے کنارے کھڑا پاتا ہوں جہاں وہ اس وقت کہہ رہے ہوں گے:

ہماری یاد جب آئے تو دو آنسو بہا دینا

لیکن ہم میں سے ہر شخص اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے:

جب نام تیرا لیجیے تب اشک بھر آوے

ان کے عنفوان شباب ہی سے مجھکو ان کی یہ خوبی دیکھنے میں آئی کہ وہ اپنے ہموطن چھوٹے عزیزوں میں اپنی رس بھری باتوں سے علمی و ادبی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی ان کو چھیڑ کر بیت بازی میں مشغول کردیتے۔ کبھی اصلاحی قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے پر آمادہ کرتے۔ کبھی سنجیدہ ادب کی طرف رغبت دلاتے۔ کبھی تحریری اور تقریری مقابلہ کراکے انعام و اکرام سے

---

* سید صباح الدین عبدالرحمان ایم۔ اے (علیگ)، رفیق و شریک ناظم دارالمصنفین، اعظم گڑھ (یوپی)، مصنف بزم تیموریہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام وغیرہ

خوش کرتے۔ میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو میرے ایک مضمون پر انہوں نے مجھکو پانچ روپئے کا انعام دیا تھا۔ اس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مضمون نگار یا مصنف ہونا دنیا کی سب سے بڑی عزت اور دولت ہے۔ میرے ایک عزیز ہموطن دوست سعیدالحق مرحوم کو انہوں نے ان کی ایک تقریر پر ایک قیمتی فاؤنٹن پین عطا کیا تھا۔ جس سے ان کا اتنا حوصلہ بڑھا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں پٹنہ یونیورسٹی کے بہترین مقرروں میں شمار ہونے لگے۔

اگر مطالعۂ کتب کو کسی پیکر میں کوئی دیکھنا چاہتا تو وہ جناب سید نجیب اشرف ندوی مرحوم کو دیکھ کر مطمئن ہوسکتا تھا۔ ان کو بچپن سے کتابوں کے جمع کرنے اور مطالعہ کرنے کا ذوق تھا۔ وہ اپنے شبستاں عیش میں چراغ نیم شبی کے سامنے کتابوں کے ساتھ وقت گزارنا لازمی سمجھتے، ورنہ ان کو نیند نہ آتی۔ ان کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں سنہ۱۸۹۸ میں ایک کتب خانہ قائم ہوا، جو سنہ ۱۹۴۷ تک ہندوستان کے نہیں تو صوبۂ بہار کے مشہور ترین کتب خانوں میں شمار ہونے لگا۔[1] اس میں بیس ہزار سے زیادہ اردو کی کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ اس کی آدھی سے زیادہ کتابیں یا تو مرحوم کی دی ہوئی یا کسی نہ کسی ذریعہ سے فراہم کی ہوئی تھیں۔ وہ جہاں بھی ہوتے کچھ نہ کچھ کتابیں ضرور جمع کرلیتے۔ کسی سواری پر سے کسی کتب فروش کو فٹ پاتھ پر کتابیں بچھائے ہوئے دیکھ لیتے تو وہیں اتر جاتے اور کتابوں کی چھان بین شروع کردیتے۔ اسی ذوقِ جستجو کا نتیجہ تھا کہ کلکتہ کے ایک فٹ پاتھ پر ان کو عمر خیام کی رباعیات کا ایک ایسا مصور نسخہ ملا جو اس فلسفی شاعر کی رباعیات کا قدیم ترین مصور نسخہ تسلیم کیا گیا۔ لنڈن السٹرینڈ ٹائمس ویکلی میں اس پر ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا۔

وہ اپنی طالب علمی ہی سے اپنی ذہانت کے لئے مشہور تھے۔ سنہ ۱۹۱۸ میں انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک فرسٹ ڈویزن میں پاس کیا ۱۹۲۰ع میں انٹرمیجیٹ میں بھی وہ فرسٹ ڈویزن لائے۔ اسی نوجوانی ہی میں ان کو مضمون‌نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا پہلا مضمون پان کی کہانی کے عنوان سے پردہ نشین،

---

۱ یہ کتب خانہ اب اورینٹل پبلک لائبریری، بانکی پور، پٹنا کا ایک سکشن ہے۔

آگرہ میں میری نظر سے گذرا ۔ وہ جب بی ۔ اے ۔ کے دوسرے سال میں تھے تو خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں زوروں پر چل پڑی تھی ۔ وہ مذہبی اور قومی جذبہ سے سرشار ہوئے اور اپنی تعلیم چھوڑکر ان تحریکوں میں شریک ہوگئے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے جوہر کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا ، اور اپنی محبت میں ان کو اپنا حقیقی چھوٹا بھائی کہتے تھے ، گو وہ سگے بھائی نہ تھے ۔ انہوں نے ان کو دارالمصنفین ، اعظم گڈھ بلا لیا ، جو اس وقت ایک اہم علمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی سرگرمیوں کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں آ کر مرحوم نے خلافت تحریک میں پورا حصہ لیا اور اپنی تنظیمی صلاحیت کا بھی ثبوت دیا ۔ کم سنی کے باوجود انہوں نے خلافت اور کانگریس کے کارکنوں کی بڑی اچھی رہنمائی کی ۔ پنڈت موتی لال نہرو ، گاندھی جی ، پنڈت جواہر لال نہرو ، مولانا شوکت علی ، مولانا محمد علی ، ان کی والدہ بی اماں جب جب اس ضلع کے دورے پر آتے تو مرحوم ان کے ساتھ ہوتے ۔ بی اماں تو ان کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھیں ۔ وہ جلسوں میں تقریریں بھی کرتے ، بعض موقعوں پر ان کی تقریریں اتنی باغیانہ اور آتش بار ہوجاتیں کہ دارالمصنفین کے رکن رکین مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کہتے کہ یہ ایک روز ہم سب کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دینگے اسی زمانہ میں انہوں نے گاندھی جی کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ اردو میں سوراج کے نام سے کیا جو اردو داں حلقے میں شوق سے پڑھی گئی ۔

وہ دارالمصنفین کے علمی کاموں میں لگے تو حضرت سید صاحب ان کی علمی صلاحیتوں کے بڑے معترف ہوئے ۔ ان کے لئے جو تعریفی کلمات کہتے رہے وہ دارالمصنفین کے اور رفقا کے متعلق شاید انہوں نے نہیں کہے ۔ ان کی کمسنی کے باوجود ان کو معارف کا اڈیٹر بھی بنا دیا ۔ اس فرض کو انہوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا ۔ اس رسالہ میں تلخیص و تبصرہ اور اخبار علمیہ کے مستقل عنوانات ہوتے تھے جن کے لئے وہ آٹھ سال تک بڑے اچھے اچھے علمی اور سائنسی معلومات فراہم کرتے رہے ۔ معارف کے شذرات کے بعد یہی حصے زیادہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ، اور ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں نقل ہوتے رہتے ۔ معارف میں ریویو کے لئے جو کتابیں آتیں ان پر ریویو بھی وہی کرتے ، جس سے ان میں وسعت نظر پیدا ہوتی گئی ۔ اس رسالہ میں ان کے مضامین بھی مختلف

عنوانات پر چھپتے رہے جن میں سے کچھ یہ ہیں: بابر یا باُبر (اگست ۱۹۲۲ع)؛ علامہ فضل اللہ کے خطوط (جنوری ۱۹۲۳ع)؛ کتب خانۂ مشرقی پٹنہ (مارچ ۱۹۲۳) دیوان حافظ اور سلاطین مغلیہ (جون ۱۹۲۳ء)؛ ایک تاریخی غلطی کی اصلاح (ستمبر ۱۹۲۴ء)؛ ناشاد بخارا (نومبر ۹۲۴ ء)؛ عمر خیام، ایک افسانہ (مارچ ۱۹۲۷ء)؛ دو اہم تاریخی دستاویز (مارچ ۱۹۲۸ء)؛ کیا داراشکوہ مسیحی مرا؟ (اپریل ۱۹۲۸ء)؛ ایک تاریخی معما، شاہجہاں نامۂ صادق (ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۸ء)۔

ان مضامین سے خصوصاً آخری مضمون سے ان کا گہرا تاریخی رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ لاہور کے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں ایک کتاب تاریخ شاہجہانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ یہ منشی محمد صادق کی تصنیف ہے۔ مرحوم نے یہ کتاب منگوائی اور اس کا گہرا مطالعہ کر کے یہ بتایا کہ یہ صرف ایک شخص کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس میں نصف درجن سے زیادہ مصنفوں کی تحریریں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ صادق خاں کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اسی زمانے میں انہوں نے رسالہ اردو (اورنگ آباد) میں ایک مضمون «بہار میں اردو» کے عنوان سے لکھا۔ وہ ہمایوں (لاہور) جامعہ (دہلی) نیرنگ خیال (لاہور) زمیندار (لاہور) انقلاب (لاہور) اور ہمدرد (دہلی) میں بھی مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے الناظر (لکھنؤ) کے لئے اردو کے عناصرِاربعہ پر ایک مضمون لکھ کر پورے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ حالی نذیراحمد اور آزاد کے مقابلے میں علامہ شبلی کو انشا پردازانہ فوقیت اور برتری حاصل ہے۔

اس زمانے کی مضمون نگاری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی طرف سے نیاز فتحپوری کی ایک کتاب «تاریخ الدولتین» شائع ہوئی۔ یہ دراصل مصر کے مشہور دوست نما دشمنِ اسلام عیسائی مورخ جرجی زیداں کی ایک عربی کتاب کی تلخیص کی تھی۔ نیاز فتحپوری نے اپنے تصنیفی داؤ پیچ سے اس کو اپنی تصنیف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مرحوم نے اگست ۱۹۲۴ع کے معارف کے ایک تبصرہ میں یہ دکھایا کہ نیاز فتح پوری نے اس کو کس طرح اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اسی تبصرہ میں انہوں نے جرجی زیدان کے اسلام اور اسلامی تاریخ سے متعلق زہریلے مخالفانہ اور فقروں کی نشاندہی کرکے یہ بھی بتایا کہ نیاز فتحپوری جیسے سادہ مزاج، بے پرواہ مصنف یا مولف یا مقبس یا ملخص یا مترجم بکمال

بخافل ایسے مقامات سے گذر گئے ہیں . اس میں عربی الفاظ کے جو غلط ترجمے ہیں ، ان کو واضح کرکے نیاز فتحپوری کی عربی دانی کی بھی قلعی کھولی ، اوز یہ بھی بتایا کہ ان کو علمی سرقے میں بڑی مہارت ہوگئی ہے کیونکہ اسی زمانہ میں انہوں نے دارالمصنفین کی ایک شائع کردہ کتاب اُسوۂ صحابیات ، کا چربہ اتار کر صحابیات کے نام سے اسکو صوفی بک ڈپو سے شائع کرنے کی جرأت کی تھی . اس سے پہلے مرحوم کا ایک مضمون جولائی ۱۹۲۲ع کے رسالۂ زمانہ ، کانپور میں جدو ناتھ سرکار اور حضرت نیاز ، کے عنوان سے شائع ہوا تھا . جس میں انہوں نے نیاز کے ایک علمی سرقہ کا انکشاف کیا تھا . اس زمانہ میں نیاز فتحپوری کے لئے مرحوم ایک علمی دہشت بن گئے تھے .

مرحوم کا نام اس وقت بھی خاص طور پر نمایاں ہوا جب محمود شیرانی کی کتاب « پنجاب میں اردو » پر اگست ۱۹۲۸ع کے معارف میں ان کا ایک بہت ہی محققانہ تبصرہ شائع ہوا اور اس کی خامیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کی گئی مرحوم کی عمر اس وقت ستائیس برس کی رہی ہوگی . یہ عمر علمی زندگی میں قلم پکڑنے کی نہ کہ معرکہ آرائی اور مردانگی کی ہوتی ہے .

حضرت سید صاحب کو اپنے اس علمی سہراب پر بڑا نـاز اور اعتماد تھا . انہوں نے ان کو اس زمانہ کے ایک بہت ممتاز اور تجربہ کار مؤرخ جدو ناتھ سرکار کے مقابلے میں لا کھڑا کیا جنہوں نے اورنگ زیب عالمگیر پر پانچ جلدیں لکھ کر بڑی شہرت حاصل کرلی تھی . ان پانچ جلــدوں کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر کو ایک ایسا بدترین حکمراں ثابت کیا جائے جو خیال میں بھی نہیں آسکتا . اس کے ثابت کرنے میں انہوں نے اپنی تحقیق محنت ، ریاضت اور دیدہ وری کا پورا جوہر دکھایا . گو اس سے پہلے علامہ شبلی نے اپنی کتاب «مضامین عالمگیر » کے ذریعہ سے اس مغل بادشاہ کے متعلق مسلمانوں کا جو ذہن بنادیا تھا اس کو دور کرنے میں جدو ناتھ سرکار کی تحقیقات کارگر نہیں ہوسکیں ، پھر بھی غیر مسلموں کو وہ عالمگیر سے بدظن کیا بلکہ متنفر کرنے میں کامیاب ہوگئے . مرحوم ان کے مقابلہ میں تحقیقی میدان میں خم ٹھوک کر اترے . جدو ناتھ سرکار پٹنہ کالج میں ان کے استاد رہ چکے تھے ، اس لئے انہوں نے اپنی تحریروں میں ان کا احترام پورے طور پر باقی رکھا جو ان کی شرافت اخلاق کی دلیل ہے .

اس اثناء میں ترک موالات اور خلافت کی تحریکیں مدھم ہوکر ختم ہورہی تھیں۔ اس لئے ان کو اپنی ادھوری تعلیم کو پورا کرنے کا خیال ہوا۔ حضرت سید صاحب نے بھی اس کی تائید کی۔ انہوں نے کلکتہ جا کر بی۔ اے۔ فارسی آنرز میں داخلہ لیا۔ کلکتہ جانے کا سبب یہ ہوا کہ وہ وہاں رہ کر جدو ناتھ سرکار کے کتب خانہ کے عالمگیریات پر اپنی تحقیقات کو بھی جاری رکھ سکیں۔ وہاں وہ چار سال رہے۔ ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے آنرز فارسی کے امتحان میں ان کی پوزیشن اول آئی۔ پھر ۱۹۲۶ء میں ام۔ اے فارسی کے امتحان میں وہ اول آئے اور ان کو انعام میں ایک طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں بھی ملیں۔ ان چار برسوں میں ان کا تعلق دار المصنفین سے برابر قائم رہا۔ انہوں نے عالمگیر کے رقعات کا ایک بیش بہا ذخیرہ بھی کلکتہ کے قیام میں جمع کرلیا۔ دارالمصنفین واپس آکر انہوں نے مقدمۂ رقعات عالمگیر لکھا اور رقعات عالمگیر کی پہلی جلد مرتب کی۔ جو نہ صرف ان کی زندگی کا بلکہ دار المصنفین اور تاریخ و ادب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ حضرت سید صاحب کو بھی ان جلدوں کی اشاعت پر بڑی مسرت ہوئی۔ انہوں نے رقعات عالمگیر کو حضور نظام حیدر آباد کے نام سے معنون کیا۔ جن کی علمی سرپرستی کے غلغلہ سے اس وقت پورا ہندوستان گونج رہا تھا۔

رقعات عالمگیر میں اورنگ زیب عالمگیر کی شہزادگی کے زمانے کے رقعات ہیں، اور مقدمۂ رقعات عالمگیر میں اس شہزادگی کے عہد کی بڑی مضبوط اور مفصل تاریخ ہے جو مصنف مرحوم کے قلم کی گلکاری، تحقیق کی دیدہ وری اور ذہن کی نکتہ آرائی کی بڑی اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں فن انشاء کی اجمالی تاریخ کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اس کے ناظرین کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔ اس کو لکھے ہوئے ۲۷ سال ہوگئے، لیکن اس میں مکتوب، فرمان، منشور، مثال، عریض، رقعہ، شقہ، احکام، نشان، عرضداشت، فتحنامہ، حسب الحکم، احکام، رمز، اشارہ، سند، پروانہ، دستک اور محضر وغیرہ کی نوعیت کی جو تفصیلات بتائی گئی ہیں وہ آج بھی پڑھنے والوں کے لئے قیمتی اور تازہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ اس میں فن انشاء کی جن جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لئے ابھی تک شمع راہ ہیں۔ اس کے بعد اورنگ زیب کی مکتوب نگاری کی جو خصوصیات ساٹھ صفحے میں بتائی گئی ہیں۔ اس سے بہتر

س وقت تک اس موضوع پر کوئی اور نہیں لکھ سکا ہے۔ پھر سیرت اورنگ زیب کے ماخذ کے عنوان سے ۱۷۳ کتابوں کی جو فہرست دی گئی ہے وہ میرے خیال میں عالمگیریات کے ماہر جدو ناتھ سرکار کی دی ہوئی فہرست سے زیادہ مکمل ہے اور ان کا جو تعارف ہے وہ معلومات کا اب بھی خزانہ ہے۔ اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کی شہزادگی کے زمانے کی سرگرمیوں کی تفصیلات جس مؤرخانہ بصیرت اور محققانہ ژرف نگاہی کے ساتھ پیش کی گئیں ہیں۔ وہ ہندوستان میں مغلوں کی تاریخ کا ایک بہت ہی قیمتی سرمایہ بن گئی ہیں۔ اس میں اس زہر کا تریاق بھی موجود ہے جو اورنگ زیب عالمگیر کے مخالفوں نے اس کے خلاف پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اس مغل فرمانروا پر ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے دو بھائیوں داراشکوہ اور مراد کو قتل کرایا۔ اور اپنے باپ کو نظر بند رکھا۔ راجستھان کے راجاؤں کی تاریخ اس قسم کے الزامات سے بھری پڑی ہے۔ لیکن ان کے ان الزامات کو اچھالنے کی بجائے ان کی بہادری اور جان نثاری کے قصے بڑے ولولہ انگیز طریقے سے لکھے جارہے ہیں۔ خود جدو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ:

«کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو ایک راجپوت زمین کی خاطر نہ کرتا باپ بیٹے کو ہلاک کرتا۔ بیٹا باپ کو قتل کردیتا۔ اعلیٰ ترین نسل کی عورتیں اپنے معتمد رشتہ داروں کو زہر دے دیتیں۔ راجا اپنے وفادار منتریوں کو مروا ڈالتے۔ کسی کو بھی حتیٰ کہ دیوتا رام کے خاندان کا اعلیٰ سے اعلیٰ فرد بھی خانگی تنازعہ کے فیصلہ کرانے میں بیرونی لٹیروں کی مدد لینے میں نہ جھجکتا[1]»

مغلوں کے شاہی خاندان میں راجپوتوں کا بھی خون آ گیا تھا۔ اس لئے باپ بیٹوں اور بھائیوں کی یہ عداوتیں تعجب انگیز نہیں۔ مرحوم نے اورنگ زیب اور اس کے بھائیوں کی جنگ جانشینی کے جہاں اور گونا گوں اسباب بتائے ہیں، وہاں پہلی دفعہ ایک نئے تاریخی نکتہ کی طرف ذہن یہ لکھ کر منتقل کیا کہ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی جنگ صرف تخت و تاج کی جنگ نہ تھی بلکہ دو تحریکوں کا تصادم تھا۔ اورنگ زیب حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک کا حامی تھا۔ اکبر کے

---

۱ فال آف مغل امپائر، جلد اول ص ۱۳۱۔

دین الٰہی سے جو ذہن بنا تھا۔ اس کا علمبردار داراشکوہ بن گیا تھا۔ اس لئے دونوں کی فتح و شکست میں دو تحریکوں کی فتح و شکست کا بھی سوال پیدا ہوگیا تھا۔ مرحوم کی اس مؤرخانہ بصیرت کی داد جوے شیر اسلامیہ کے فرہاد حضرت مولانہ سید سلیمان ندوی نے بھی دی، اور اسی کے بعد ان کو یہ کہنا پڑا کہ اگر داراشکوہ تخت پر بیٹھتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام ختم ہوگیا ہوتا۔ اورنگ زیب تخت پر بیٹھا تو اس کے بعد مسلمانوں کو سخت زوال آ گیا۔ لیکن ہندوستان میں اسلام باقی رہ گیا۔

مرحوم کی اس کتاب کو شائع ہوئے تقریباً چار قرن گزر گئے ہیں۔ لیکن اس کی افادیت اور مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ مسلم یا غیرمسلم مؤرخ جو بھی اورنگ زیب پر اب کچھ لکھتا ہے، اس کتاب کا حوالہ دینا اس کے لئے ناگزیر ہوجاتا ہے۔ ابھی کچھ دنوں پہلے آسٹریلیا کی ایک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے مجھکو لکھا کہ وہ اس کتاب سے استفادہ کے لئے بےچین ہیں۔ اس کے بھیجنے میں خواہ کتنا ہی خرچ ہو، ہوائی ڈاک سے جلد از جلد بھیج دی جائے۔ امریکہ اور روس کی مختلف یونیوسٹیوں میں بھی یہ کتاب بھیجی گئی ہے۔ اس طرح اس کی شہرت باہر کے ملکوں میں بھی پہنچی ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ چونکہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانے کا صحیح پس منظر سامنے آجاتا ہے اس لئے اس کے دورحکومت کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں خود بخود دور ہوجاتی ہیں۔

اس کتاب کے لکھتے وقت مرحوم پر علّامہ شبلی کی روح چھائی رہی۔ اس لئے علامہ کے طرز تحقیق اور اسلوب بیان دونوں کی کچھ جھلک اس میں موجود ہے۔ مرحوم حضرت سید صاحب کی نگرانی میں کام کرتے رہے۔ اس لئے ان کے طرز فکر اور انداز بیان سے بھی متأثر ہوئے۔ علامہ شبلی کی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دل آویزی اور تحقیق کی گہرائی دونوں کو برابر قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔ حضرت سید صاحب بعض اوقات اپنی تحقیق کی گہرائی اور گیرائی کی خاطر اپنی انشا پردازی کو کہیں کہیں قربان کردینے کے لئے بھی تیار رہتے۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اپنی انشا پردازی کو تحقیق کی خاطر بھینٹ چڑھانا گوارا نہ کرتے۔ مرحوم اس معاملہ میں حضرت سید صاحب سے

زیادہ قریب ہیں۔ وہ ان ہی کی طرح جب تحقیقات میں ڈوب جاتے تو ان سے انشا پردازی کا دامن چھوٹ جاتا۔ لیکن جب ڈوب کر اُبھرتے تو پھر انشا پردازی کی گلکاری کے لئے بے چین ہوجاتے جس کے نمونے اس کتاب میں جا بجا ملتے ہیں۔ مثلاً اورنگ زیب کے واقعات کی بوقلمونی کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

«اورنگ زیب کے خطوط گلہائے رنگا رنگ کا بہترین مجموعہ ہیں۔ کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہارِ خیال ہے تو کہیں سیاسی و معاشری واقعات پر تنقید، کہیں شوقِ وصال بے چین کئے ہوئے ہے تو کبھی دردِ فراق نے مضطرب کر رکھا ہے۔ کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے تو کہیں کسی کی موت کا ماتم۔ کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے تو کہیں تنبیہ۔ اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالات سے مملو ہے تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر۔ کہیں عتاب ہے تو کہیں عنایت۔ کبھی گرم جوشی ہے تو کبھی سرد مہری۔ کہیں الزامات کی صفائی ہے تو کہیں دوسرے کے خلاف شکایت۔ غرضکہ وہ کون سی چیز ہے جو اس مجموعہ میں نہیں ہے، اور پھر وہ کون سی شے ہے جس میں حقیقت نگاری کے ساتھ کمالِ ادب کو جگہ نہیں دی گئی ہے۔»

اس رنگینی کے ساتھ اِن کے یہاں خطیبانہ انداز کے زور بیان کی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

«اس بدقسمتی کا کیا علاج ہو سکتا ہے کہ وہی چیز جو تمام حکومتوں اور فرمانرواؤں کے لئے طرۂ امتیاز اور تمغائے افتخار ہو، وہی کارروائیاں جو سلاطین اور کشور کشاؤں کے حالات میں کارنامے کہے جائیں، غریب اورنگ زیب کے لئے ذلت و بدنامی، رسوائی و شرمساری کا موجب ہوں رومنوں نے قدیم دنیا کے تینوں بر اعظموں کے بیشتر حصے کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل دیا۔ لیکن یہ ان کی عظمت و شوکت کا سبب بن گیا۔ سکندر اعظم نے مقدونیہ سے لے کر پنجاب تک تمام متمدن ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لیکن یہی بربریت اس کی بڑائی کا ذریعہ ہے۔ دور کیوں جائیے۔ خود مغلوں کے سب سے زیادہ نیک دل، غیر متعصب، وسیع المشرب بادشاہ اکبر نے بہار، بنگال، مالوہ، گجرات اور راجپوتانہ کو ہضم کر کے نربدہ پار کی مسلم ریاستوں

---

۱ مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۵۶۔ ۵۵

پر حملہ کیا۔ خاندیس برار اور احمد نگر وغیرہ پر قبضہ کیا۔ اس غاصبانہ قبضہ کا صلہ کیا تھا؟ کوئی مخالفانہ تنقید؟ کوئی منصفانہ فیصلہ؟ نہیں بلکہ اسے اعظم کا خطاب دیا گیا۔ جہانگیر و شاہ جہاں نظام شاہی اور قطب شاہی حکومتوں سے تمام عمر لڑتے رہتے ہیں تو مؤرخوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ لیکن جب اسی نا مکمل و نا تمام کام کو اورنگ زیب مجبوراً کرتا ہے تو اسے ظالم، غاصب غیرسیاست داں اور متعصب کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جو اپنے ذرائع میں وسعت کا طلب گار اور اس کے لئے کوشاں نہیں ہے؟ آج تک دنیا میں وہ کون سی حکومت رہی ہے جس نے اپنے کو ابتدا سے انتہا تک صرف ایک مربع کے اندر محدود رکھا ہے؟ اور کیا آج اس تمام ادعائے تمدن و تہذیب اور صدائے جمہوریت و اشتراکیت کے باوجود جوع الارض اور شہنشاہیت کا بھوت ہمیشہ سے زیادہ مضبوط طریقہ پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کئے ہوئے ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کچھ ہوتا تھا۔ اس کا تمام تر دار و مدار ایک شخص واحد پر ہوتا تھا اور اب تمام ملک اور ساری قوم متحدہ طریقہ سے اس جرم میں شریک ہے۔ اس لئے جرم کی نوعیت زیادہ سخت، زیادہ مہلک اور زیادہ تباہ کن ہو گئی۔ مگر پھر بھی یہ تمدن و تہذیب کا دور اور حریت و آزادی کا زمانہ ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے کسی آئین کے خلاف انگلی بھی اٹھا سکے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا[1] »

« ان کے طرز ادا کی دل آویزی کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو:

شاہ جہاں کی عظمت، اس کی بزرگی، اس کی برتری، اس کی مذہبی پابندی اور اس کی علوم نوازی سے کون انکار کرسکتا ہے؟ ہندوستان کے مسلمان سلاطین میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو جس کا جمالیاتی پہلو اتنا دیر پا اثر نہ صرف صفحات تاریخ بلکہ روئے زمین پر چھوڑ گیا ہو۔ شاہ جہاں کی تعمیری عظمت اور اس کے وزیر علامی سعد اللہ خاں کی حکمت و تدبر نے اس کے عہد حکومت کو اس طرح گھیر رکھا ہے اور ان کی روشنی اس قدر تیزی سے پڑ رہی ہے کہ اس کی چمک میں کسی دوسری

---

۱ مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۴۲ - ۱۰۱

چیز پر آنکھ ٹھیک سے نہیں جمتی۔ تاج کا مرمری گنبد، لال قلعہ کی سرخ دیواریں، دیوان عام و دیوان خاص کی زرین نقش آرائیاں، جامع مسجد کی شوکت، تخت طاؤس کی ضیاء پاشی اور کوہ نور کی نور افشانی ہم کو شاہ جہاں کی دوسری کاروائیوں سے بالکل بے خبر کردیتی ہے۔ وہ سرتاپا حسن و شعریت نظر آتا ہے[1]۔»

مرحوم کی یہ ساری سرگرمیاں اٹھائیس سال کی عمر کے اندر ہی بروئے کار رہی تھیں۔ حضرت سید صاحب ان کے ان علمی و ادبی کارناموں کو اپنی نجی صحبتوں میں غضب کا علمی الھان کہا کرتے تھے۔ اس سے وہ ابھی پوری طرح شادان و فرحاں بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ یکایک مرحوم کو نہایت ناگزیر اسباب کی بناء پر دارالمصنفین چھوڑنا پڑا، اور وہ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج (احمدآباد) میں فارسی کے استاد ہوکر چلے گئے جہاں سے وہ ۱۹۳۱ء میں اسماعیل کالج اندھیری (بمبئی) میں اردو کے استاد مقرر ہوکر آئے۔ حضرت سید صاحب کے لئے ان کی مفارقت ایک بڑا علمی سانحہ تھا۔ ان کو ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک علمی کان سے کوہ نور نکالا تھا۔ اس کو ابھی دارالمصنفین کے علمی لال قلعہ کے جس تخت طاؤس پر وہ بیٹھے تھے۔ اس میں اچھی طرح لگانے بھی نہ پائے تھے کہ کسی نے اس کو ان سے چھین لیا۔ دارالمصنفین کے اس علمی نقصان پر ان کو آخر وقت تک بڑا افسوس رہا۔ خود مرحوم کو بھی حضرت سید صاحب سے بڑی عقیدت اور محبت رہی۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں ان کی وفات ہوئی تو انھوں نے نوائے ادب کے شذرات میں لکھا:

«حقیقت تو یہ ہے کہ گو ہندوستان کی مردم خیز زمین نے سات سو برسوں میں بڑے بڑے محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، ادیب، مؤرخ، سوانح نگار، نقاد، انشا پرداز، مدرس اور خطیب پیدا کئے اور انفرادی حیثیت سے ان میں بہت سے اپنے علم و فن میں بہت بلند ہوں، لیکن مجموعی حیثیت سے علامہ کا درجہ کسی سے کم نہیں تھا۔ ان کی تصانیف میں متعدد ایسی کتابیں ہیں جن میں سے ہر ایک ان کو غیر فانی بنا سکتی ہے۔ سیرۃ النبی، ارض القرآن، سیرت عائشہ، خیام ان میں سے چند ہیں[1]۔»

---

۱ نوائے ادب جلد ۵ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۵۴ء)

مرحوم کو بمبئی کی زندگی میں ہر قسم کا اعزاز حاصل ہوا۔ لیکن ان کو محسوس ہوتا رہا کہ ان کے علم کے مشک کے لئے دار المصنفین ہی کا ختن ضروری تھا۔ ان کی تحریروں کے حسن کا کنعان دارالمصنفین ہی کا سواد تھا، اور ان کی تحقیقی کاوشوں کی بار آورین قوس قزح کے لئے دار المصنفین ہی کا افق چاہئے تھا۔ ان کو دارالمصنفین کی یاد برابر ستاتی رہی۔ ان سے جب جب ملاقات ہوتی وہ کہتے کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ وہ تعلیمی شعبہ کو چھوڑ کر پھر دار المصنفین ہی کے گوشۂ عافیت میں آ کر پناہ لیں۔ وہ عالمگیر کی تاریخ کی بقیہ جلدوں کی تکمیل کے لئے دار المصنفین سے بہت سی کتابیں اور مواد ساتھ لے گئے تھے۔ لیکن ان کو اپنی ملازمت کی مشغولیتوں میں بقیہ جلدوں کی ترتیب اور تدوین کی فرصت نہیں ملی۔ جو ایک بہت بڑا علمی حادثہ ہے۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ ان جلدوں کی تکمیل کے لئے علامہ شبلی کا مزار نظروں کے سامنے رہنا ضروری ہے اور پھر دار المصنفین کے باورچی خانہ کی گرم گرم ٹکیوں اور سہالیوں ہی کو کھاکر ان کا قلم رواں دواں ہوسکتا ہے۔ وہ یہاں کے آموں کے باغ کی ہری ہری ڈالیوں اور اُس کے چمن کے سرو و شمشاد کے سایوں کو یاد کرتے اور کہتے کہ ان ہی کے نیچے بیٹھ کر وہ علم و ادب کی کرنیں پھوٹتی ہوئی پھر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں دار المصنفین کو منبع علم و فضل اور گلستان ادب و انشا کہتے اور اپنے کو علامہ شبلی کے خوان ادب کا زلہ خوار کہتے رہے۔ ان کو دارالمصنفین کے ہر چھوٹے بڑے فرد سے قلبی لگاؤ رہا۔ ہم لوگوں سے ان کی بات چیت بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہم لوگوں کے پیار پر ان کو غصہ آتا اور ان کے غصے پر ہم لوگوں کو پیار آتا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں دار المصنفین آئے تو مجھ سے کہہ گئے کہ ان کا پرانا کمرہ ان کے لئے پھر سے خالی کردیا جائے تاکہ وہ یہاں آکر اپنے ادھورے کام کو پورا کرسکیں۔ پھر ۱۹۶۵ء میں دار المصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر آئے تو وہ یہی کہہ کر گئے کہ بہت جلد دار المصنفین واپس آ جائیں گے۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہندوستان کے علمی ماحول کا یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ یونیورسٹی میں آ کر کوئی ٹھوس علمی کام کرنا بھی چاہتا ہے تو کر نہیں پاتا۔ اسی لئے علمی اداروں کے بوریہ نشین اپنی بے سرو سامانیوں اور مالی پریشانیوں کے باوجود جو کام کرجاتے

وہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بڑے آرام دہ ایوانوں میں نہیں ہو پاتے۔ مثلاً رت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہ ہزار سے زیادہ صفحات ے۔ اس طرح مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے تقریباً آٹھ ہزار صفحات قلمبند ،۔ یونیورسٹی کا شاید ہی کوئی استاد اس کمیت کا دعویدار ہوسکتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ علمی قوت حیدری کا بھی مدار نان شعیر ہی پر ہے۔

ان کا وطن بہار تھا۔ بچپن مدھیہ پردیش میں گذرا۔ تعلیم بنگال میں پائی۔ ، جوانی کی بہترین ایام یو-پی میں گذارے۔ ملازمت بمبئی میں کی اور یہیں سپرد ک بھی ہوئے۔ ان پانچوں صوبوں میں رہنے کی وجہ سے ان میں پنچ شیل کی تعصبی، رواداری، فراخدلی، سیر چشمی اور حقیقت پسندی آ گئی تھی۔ ان میں قائی تعصب بالکل نہ تھا۔ وہ اپنے وطن سے زیادہ بمبئی کو محبوب رکھنے لگے ،۔ بمبئی کی تعریف میں ان کے زبان و قلم دونوں سحر آفریں اور جادو نگار جاتے۔ بمبئی کی تعریف میں وہ لکھتے ہیں:

"اگر موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائی، تجارتی کساد بازاری، اور ہماری علمی و تعلیمی رہبانیت کو دور کردیا جائے تو بمبئی اپنی گونا گوں دلچسپیوں اپنی لا تعداد دلفریبیوں، اپنی بے شمار کششوں اور اپنی ان گنت ان حسین چہروں کے لئے جو بقول حافظ صرف محسوس کی جا سکتی ہیں کہ ع بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست، ایک دنیائے رنگ و بو، ایک جہان حسن و جمال، ایک عالم نزاکت و لطافت، ایک معمورۂ تمنا، ایک شہر آرزو ہے۔ یہ وہ جنت ارضی اور فردوس خاکی ہے جہاں حسن اپنی دلکشیوں، ضیا پاشیوں اور رنگینیوں میں جلوہ گر ہے، جہاں ملکۂ جمال و رعنائی کی حکومت ہے۔ یہ پروان مذہب عشق کے لئے وہ ارض مقدس اور حریم ناز ہے جہاں تصوف کا اعلیٰ درجہ اور بلند مرتبہ حاصل کیا جاسکتا ہے، یعنی جہاں ہماری توقعات کے خلاف محبوب عاشق کے لئے سرگرداں ہے، جہاں پروانہ کے لئے شمع آتش بداماں ہے۔ جہاں مجنوں کی تلاش میں لیلیٰ سرگرداں ہے، جہاں ہارون کی جستجو میں زبیدہ حیران ہے، جہاں عذرا وامق کی طالب ہے، شیریں فرہاد کے لئے جوئے خوں بہا رہی ہے ... آپ ان حسین نغموں کے روح افزا اثر کے رقص رنگیں کے کمال کو کیا

کہہ سکتے ہیں جن سے کہ سر زمین حسن و عشق اور بلدۂ شعر و موسیقی کا عالم لطیف پُر ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ چوپاٹی و اپالو، ورلی کا آغوش آبی، مالابار کا فردوس معلق، جوہو اور باندرہ پائنٹ، تھیٹر اور سنیما، ہوٹل اور ریسٹوران بمبئی کے دلچسپ مقامات اور تفریح گاہ ہی نہیں بلکہ

واں حسن پہ عشق مچلتا ہے، واں پریم کا ساغر چلتا ہے۔"

ایک موقع پر مجھ سے کہنے لگے کہ بمبئی میں یورپ کی اچھائیاں زیاد اور برائیاں کم ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان کے ایک دوسرے بڑے شہر نام لیتے ہوئے کہا کہ وہاں ایشیا کی اچھائیاں کم اور خباثتیں زیادہ ہیں۔

بمبئی کی زندگی میں ان کا علمی حلقہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ وہاں کا شاید ہی کوئی اہل علم ہو جس سے ان کے مراسم پیدا نہیں ہوئے۔ باہر سے کوئی اہل علم یہاں آجاتا، تو وہ اس سے ضرور ملتے۔ اس کو اپنے یہاں مدعو کرتے۔ رخصت کرتے وقت کوئی نہ کوئی تحفہ بھی دیتے۔ ارباب علم کے ساتھ جو بھی وہ لمحہ گذارتے اسکو اپنی زندگی کی عزیز ترین دولت سمجھتے، بمبئی کی کوئی سرکاری یا غیر سرکاری علمی یا ادبی کمیٹی بنتی تو وہ اسکے رکن ضرور بنائے جاتے۔ بمبئی سے باہر کے اہل علم سے بھی ان کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ وہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں یا تو ممتحن یا کسی کمیٹی کے ممبر بناکر بلائے جاتے۔ آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ جہاں جاتے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے۔ پٹنہ اور دہلی میں تو میں نے خود دیکھا کہ وہ باہر نکلتے تو ان کے آگے پیچھے ادیبوں اور شاعروں کی ایک چھوٹی سی جماعت ضرور ہوتی وہ اپنی قیامگاہ پر ہوتے تو معلوم ہوتا کہ وہ ایک انجمن ہیں جہاں علم و ادب کے نغمے الاپے جارہے ہیں۔ ان کی مجلس ادبی لطیفوں اور چٹکلوں سے زعفران زار بنی رہتی۔ ان کی اسی محبوبیت کی بدولت ان کی وفات پر نہ صرف بمبئی بلکہ علی گڈھ، گورکھپور، لکھنؤ، دہلی، اعظم گڈھ، پٹنہ اور حیدرآباد میں وہاں کے اہل علم دوستوں نے بڑے رنج و قلق سے ان کا سوگ منایا۔ کسی نے لکھا کہ ایک روشن چراغ تھا نہ رہا، کسی نے ان کو باغ و بہار سے پر شخصیت، کسی نے پرانی بزم کا ممتاز رکن اور ندوہ کا مامور فرزند، کسی نے اردو زبان کا

دیرینہ خدمت گذار ، کسی نے محقق اور کسی نے عالم بتایا۔ کسی نے ان کی تاریخ وفات یہ کہ کر نکالی ع آج جاخلد میں نجیب اشرف (۱۳۸۸ھ)

وہ سنہ۱۹۵۵ء میں اسماعیل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی علمی تشنگی انجمن اسلام ، بمبئی کے اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ڈائرکٹری سے بجھتی رہی۔ یہ ادارہ سنہ ۱۹۴۷ء میں قائـــم ہوا ۔ یہاں رہ کر مرحوم نے کئی طلبہ کو پی۔ ایچ۔ ڈی بنایا[1] ۔

اس ادارہ کے ڈائریکٹری کے زمانے میں ۱۹۶۲ء میں مرحوم کی لغات گجری شائع ہوئی جس میں انہوں نے اپنی اس تحقیق ، تلاش ، محنت اور دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے جو انہوں نے رقعات کی ترتیب و تدوین میں دیا تھا۔ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعمیر میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت حاصل ہے ۔ ان کی اس رائے کو اردو کے محققین اور مؤرخین نے اب تسلیم کرلیا ہے ۔ اس لحاظ سے مرحوم کا یہ بڑا کارنامہ ہے۔ لغات گجری کو شائع کرکے انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ اردو لغت نویسی کی طرف پہلا قدم ہے ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لغت نویسی پر بحث کرکے لغتوں کی جو فہرست دی ہے وہ لغت پر کام کرنے والوں کے لئے بڑا مفید اور قیمتی مواد ہے ۔ اس کو ایڈٹ کرنے میں انہوں نے جو غیر معمولی محنت کی ہے وہ ان کی تحقیقی مہارت اور لسانیات اور زبان اردو کے ساتھ غیرمعمولی شغف کا بین ثبوت ہے ۔ وہ اس میں بڑے وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں کہ :

« آرین قوم جب سندھ و پنجاب ہوتی ہوئی دلی تک پہنچی اور اس کے اطراف میں اپنی مرکزیت قائم کی تو دیسی اور پردیسی کے میل ملاپ سے ایک مشترک زبان پیدا ہوگئی ۔ جب اس علاقہ سے آریوں نے مشرق و مغرب میں پھیلنا شروع کیا تو اسی زبان کی دو شاخیں ہوگئیں۔ ایک برج سے لےکر دہلی میں مشرقی پنجاب ' ہریانہ ہوتی ہوئی راجستھان کے مختلف علاقوں سے گذرتی ہوئی گجرات ہی نہیں بلکہ مہاراشٹر کی آخری حد تک پہنچتی ہے، اور دوسری مشرق کی طرف پھیلتی ہوئی اودھ ، بہار،

---

۱ مضمون نگار کو سہو ہوا ہے۔ اسٹی ٹیوٹ سے مرحوم کی نگرانی میں صرف ایک طالب علم نے پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ مکمل کیا اور اسے اس پر ڈگری ملی ان کے باقی چار شاگردوں نے جنھیں پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری ملی اسماعیل یوسف کالج میں داخلہ لیا تھا ۔ (ایڈیٹر)

بنگال، اڑیسہ سے لے کر آسام تک چلی جاتی ہے۔ لیکن یہ مہاجرت ایک وقت میں ایک ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے جو موجودہ زبان دہلی اور برج کے علاقہ سے جتنی دور ہے اس میں اس مخلوط زبان کے اتنی ہی پرانے شکل کے الفاظ اور جملے ملتے ہیں۔ جنوب و مغرب میں یہی زبان تھی جسے برج، زبان اسلام آباد متھرا، برج بھاشا، زبان بھاکا، بھاکھا اور بھاشا کہا جاتا ہے، اور یہی زبان تھی جس نے موجودہ بولیوں میں سب سے پہلے ادبی درجہ حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ چند بردائی کی پرتھوی راج راسو ہی جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے اس زبان کی پہلی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں اس سے قبل کی بھی بعض نظموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ مشرقی شاخ بڑی حد تک پالی اور مگدھی سے متاثر ہے۔ ان جنوب و مغرب کی زبانوں کی ماں سورسینی ہے۔ دہلی میں جب برج کی بولی ایک معیاری درجہ حاصل کرلیتی ہے اور اس میں الفاظ کی شکلیں موجودہ برج بھاشا سے مختلف ہوجاتی ہیں تو ہندی اور ہندوی بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کا نام بھی پاتی ہے۔ اور اسی مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے پہلے ریختہ، پھر زبان اردوے معلی، پھر زبان اردو اور آخر میں اردو کا لفظ استعمال ہونے لگتا ہے»۔[1]

اسی کے بعد گجرات میں اردو کو جو مقام حاصل رہا ہے اس کے متعلق وہ رقمطراز ہیں:

«یہ مغربی شاخ . . . بڑھتے بڑھتے گجرات تک پہنچ چکی تھی، اور وہاں ایک خاص نہج پر ترقی کررہی تھی۔ لیکن ایک طرف تو اس کے ساحل کے تجارتی مرکزوں سے ہندوستان سے مغرب کے ایشیا افریقائی ممالک کا تعلق، دوسری طرف مذہبی حیثیت سے متعدد و متنوع مذاہب کا مرجع اور تیسری طرف اسلامی عہد میں اس کے سیاسی حیثیت سے دہلی کے ماتحت آجانے کی وجہ سے اس زبان کے الفاظ کو ایک خاص صورت ملی۔ «جملوں کی ہئیت میں ایک خاص انداز پیدا ہوا» اور ذخیرۂ الفاظ میں ایک خاص اضافہ ہوا۔ الفاظ کے اسی تغیر ہیئت کے اسی انداز اور ذخیرۂ الفاظ کے اسی اضافہ سے اس نے جو شکل اختیار کرلی اسی

---

۱ لغات گجری ص ۱۰ ۹

کا نام ہماری زبان و ادب میں گجری، گرجری اور بولی گجرات ہے۔ گجرات والوں کے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما سے لے کر عہد مغلیہ کے تقریباً ابتدائے زوال تک یہ علاقہ اردو کی حیثیت سے اہم اور لائق عزت مقام کا حاصل رہا ہے۔[1]

اوپر کے اقتباسات میں وہی تحریری وزن، وقار اور متانت ہے جو حضرت سید صاحب کی تحریروں کا امتیازی رنگ ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ مرحوم اپنی سنجیدہ تحریریں لکھتے وقت یا تو اپنے محبوب بھائی اور استاد کو سامنے رکھتے یا ان کی علمی روح ان پر چھائی رہتی۔

انجمن اسلام کے اردو ریسرچ انسٹیوٹ کے ترجمان نوائے ادب کے ذریعہ گجرات کے قدیم اردو شاعروں، ادیبوں، صحافت نگاروں کی اور لغت نویسوں کے جو کارنامے منظر عام پر آئے ہیں ان سے اردو و ادب کی بڑی مفید خدمت ہوئی ہے۔ اس میں مرحوم کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ تقریباً سترہ سال تک اس کے اڈیٹر رہے۔ کوئی معیاری رسالہ پابندی سے نکالنا بڑا مشکل کام ہے۔ مضامین کا فراہم کرنا، ان کی زبان اور طرز ادا کو درست کرکے رسالہ کے مزاج اور معیار کے مطابق شائع کرنا، تصنیف و تالیف کے کام سے کم اہم نہیں۔ پھر ان کی کتابت و طباعت میں خون پسینہ ایک کرنا ہوتا ہے۔ ان صبر آزما دشواریوں کا اندازہ رسالہ کے پڑھنے والوں کو نہیں بلکہ اس کے نکالنے والوں کو ہوتا ہے۔ مرحوم کا گوشت و پوست علم و ادب کا بنا ہوا تھا۔ اس لئے ان تمام مشکلوں سے عہدہ برآ ہونے ہی میں ان کو لذت ملتی اہل نظر کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ نوائے ادب نے تحقیق کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ اور اس میں مقالہ نما کے عنوانات سے جو کچھ شائع ہوتا رہا۔ اس کی طرح سب سے پہلے اسی نے ڈالی۔

مرحوم نے اس میں جو شذرات لکھے ہیں وہ ان کے علمی و ادبی رجحانات اور قلبی احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ وہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے نئے ڈھانچے میں اردو کو ایک با وقار سنگھاسن پر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ملک کی دوسری زبانوں کے بھی ہمدرد تھے۔ وہ مسلمانوں کو ان کے سیکھنے اور ان میں کمال پیدا کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ وہ اپنے ایک شذرہ میں لکھتے ہیں؛

---

۱ لغات گجری ص ۱۰ - ۹

«وہ (یعنی مسلمان) تو ہندی اور علاقائی زبانوں کو اپنی زبانیں سمجھ کر پڑھتے ہیں، اور انشاءاللہ وہ بہت جلد ملک میں اس حیثیت سے ایک اعلیٰ جگہ پیدا کرلیں گے . . . ہم اردو دوستوں سے درخواست کرینگے کہ ہندی اور علاقائی زبانوں کی تصانیف کو اردو کا جامہ پہنا کر ان کی تحریکوں . تحقیقوں اور رجحانوں سے اردو داں طبقے کو استفادہ کا موقع دیں[1]».

لیکن اسی کے ساتھ وہ اردو زبان کا اس کا جائز حق بھی چاہتے رہے . انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی کہ اردو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے . انہوں نے بڑے دکھ و درد کے ساتھ لکھا:

«تقسیم کے بعد ہی اس بات کی زبانی اور عملی سرگوشی شروع ہوگئی تھی کہ اردو ہندی کا ایک مخصوص اسلوب ہے، اور دکنی تصانیف و تخلیقات ہندی دکھنی روپ ہے . اس کے ساتھ قطب مشتری، دیوان محمد قلی قطب شاہ وغیرہ کو ہندی کا لباس ہی پہنایا گیا بلکہ دکنی ادب پر کتابیں اور پی اچ . ڈی کے مقالے لکھے گئے . یہاں تک تو کوئی حرج نہ تھا کہ آدمی مفید اور کارآمد چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے . لیکن اس کے ساتھ جو اس بات کی شاطرانہ تبلیغ شروع کی گئی کہ اگر اردو کو ہندی لپی میں لکھا جائے تو اس طرح لاتعداد عربی و فارسی کے الفاظ غیر شعوری طور پر ہندی میں داخل ہوجائیں گے. لیکن اب یہ تحریک عوام سے گذرکر اور خواص سے بڑھ کر حکومت کے ایوان تک پہنچ گئی ہے، اور وہاں سے یہ تجویز پیش کی جارہی ہے کہ قومی اتحاد کے ساتھ ہی ساتھ لسانی اتحاد کے لئے اردو کو بھی دیوناگری کا جامہ پہنا دیا جائے . ہم نہایت ادب سے لیکن صاف طریقہ سے یہ عرض کریں گے کہ اردو دراصل نام ہی ہندوستان کامل کی عام مشترک زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کا ہے. اور اگر اس کا یہ واحد امتیاز مٹا دیا گیا تو یہ اردو کی موت ہوگی. اس لئے اردو والے اس تجویز کو کبھی قبول نہیں کریں گے.»[2]

وہ برابر اردو زبان کی وکالت کرتے رہے . جولائی ۱۹۶۳ء کے نوائے ادب میں انہوں نے جو پر زور شذرات لکھے تھے، وہ گویا ان کی طرف سے ہندوستان

---

۱ نوائے ادب، جلد ۱۵، شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۶۴ء) شذرات ص ۲ ۲ ایضاً

میں اردو کے حامیوں ہمدردوں اور خدمت گذاروں کے لئے ایک اہم پیام ہے ۔ ہم اس کو یہاں پھر دہراتے ہیں :

« ہم نے نوائے ادب کے صفحات میں بار بار اردو دوست اصحاب کی توجہ اس حقیقت کی طرف منعطف کرانے کی کوشش کی ہے کہ اگر کسی قوم میں اپنے اور اپنی بلند ترین روایات کو باقی رکھنے کی سچی لگن نہیں ہے تو نہ تو وہ جماعت خود با عزت زندگی بسر کرسکتی ہے اور نہ اس کی روایات میں جان باقی رہ سکتی ہے ۔ ہم کو دوسرے معاملات سے بحث نہیں ۔ ہم صرف اردو زبان و ادب سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر ہم کو اردو کی اہمیت اور اس کے زندگی بخش بلند مقام پر یقین کامل نہیں ہے تو پھر اس کی بقا و ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ لیکن اسے ہم ملکی یکجہتی، ثقافت ، تہذیب اور روایات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو اس کا ثبوت لمبی لمبی تقریریں پُر زور بیانات اور دل خوش کن تجاویز ہی تو نہیں ہونا چاہئیے ۔ بلکہ ہم کو اس کی بقا کے لئے تن من اور دھن کی بازی لگا دینا چاہئیے، اور کسی جماعت یا حکومت کی حکمت عملی کی پرواہ کئے بغیر خود اپنے اوپر اعتماد کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر اس کی حفاظت کا عملی عزم بالجزم کرلینا چاہئیے، ورنہ :

جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے »

ہندوستان و پاکستان میں اردو زبان و ادب کے کسی بھی ادیب ، شاعر ، صاحب فن اور خدمت گذار اردو کی وفات کی خبر مرحوم سن لیتے تو بے چین ہوجاتے ۔ پھر شذرات میں ان کی تحریریں آنسو کی بوندیں ہوجاتیں ۔ انہوں نے ایسے جن اصحاب فن کا ماتم کیا ہے ان کی فہرست بڑی طویل ہے ۔ وہ کسی کو ایک مستقل انجمن ، کسی کو روایت و تمدن کی شمع ، کسی کو ایوان ادب کا چراغ ، کسی کو علم و فن کا حسین امتزاج ، کسی کو ممتاز مفکر ، کسی کو ماہر فن ، کسی کو خاص دبستان انشاء کا بانی ، کسی کو ژرف نگاہ محقق ، کسی کو بلند پایہ نثر نگار ، کسی کو سراپا عمل ، کسی کو مجسم ایثار اور کسی کو نڈر علمی مجاہد کہہ کر اس پر آنسو بہاتے ۔

اے علم کی شمع کے پروانے، اے اردو زبان و ادب کی زلف گرہگیر کے اسیر، اس دنیا میں تو اپنے علم و ادب کے خرام رنگیں کا ایک حسیں نقش چھوڑکر اس وقت وہاں ہے جہاں وہ لوگ بھی ہیں جن کا تو نے ماتم کیا تھا۔ اب ہم تیرے سوگ میں آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا تیری زندگی علم و ادب کا ایک پیام رنگیں ہے۔ اقبال نے کہا ہے:

عشق کچھ محبوب کے مر جانے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

اس شعر کی صداقت اس وقت سمجھ میں آئے گی جب تیری یاد ہمارے دلوں میں آئے گی اور برابر آئے گی، اکثر آئے گی۔ جانے والے تجھ پر سلام، ہزاروں سلام۔ کاش تیری رنگا رنگ خوبیوں کی وجہ سے تیری روح کسی حور کے گیسو میں خوشبو کی طرح سما گئی ہو! تیری تربت پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو۔ تیری شرافت، تیری محبت اور تیرا اخلاص خود تیرے رفیق آخرت ہوں گے۔ بار الٰہی، تو اس کو اپنے اسی فیض و کرم سے نواز جس کا وہ محتاج ہوکر تیرے حضور میں گیا ہے۔ آمین، ثم آمین۔

---

*عبدالحلیم ساحل

ندوی صاحب کی طرز تحریر

مرحوم سید نجیب اشرف ندوی کی طرز تحریر کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کے اس ماحول پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے جس میں انہوں نے اپنی علمی و ادبی دلچسپیوں کا آغاز کیا. ندوی صاحب مولانا سید سلیمان ندوی کے چچازاد بھائی تھے ، اس تعلق سے سید صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے جس درسگاہ کا انتخاب کیا وہ ندوۃالعلماء (لکھنؤ) کا اسلامی دارالعلوم تھا. خود سید صاحب نے اسی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور اس کے نامور ترین فارغ التحصیل طلبہ میں سے تھے. اس لئے بجاطور پر انہوں نے اپنے ہونہار عم زاد بھائی کو بھی اسی دارالعلوم میں داخل کرایا. لیکن بعض وجوہ کی بنا پر وہ زیادہ دنوں تک یہاں تعلیم نہ پاسکے ، مگر سید صاحب اور ان کے استاذ مولانا شبلی کی تحریروں کا ایک ہلکا سا ان اثر کے ذہن پر قائم ہوچکا تھا.

ندوۃالعلماء سے الگ ہونے کے بعد انہوں نے انگریزی کی تحصیل شروع کی. دوران تعلیم میں وہ دارالمصنفین سے منسلک ہوگئے. اس ادارے کے ایک رفیق کی حیثیت سے انہوں نے رقعات عالمگیر کی تنقیح و تشریح کا کام شروع کیا اور اسے حسن و خوبی سے سرانجام دیا. رقعات کی روشنی میں انہوں نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا. عہد عالمگیر کے محققین کے لئے اس مقدمہ کا مطالعہ ناگزیر ہے.

مقدمہ رقعات عالمگیر ندوی صاحب کی ذہنی شادابی جودت طبع ، وسعت معلومات ، تحقیقی ذوق اور تاریخی تنقید کا مظہر ہے. ساتھ ہی وہ ان کے حسن انشاء کا بھی ایک عمدہ نمونہ ہے. مقدمہ رقعات کے بعد لغات گجری کے علاوہ ان کا کوئی اہم تصنیفی کارنامہ منظر عام پر نہ آسکا. اس لحاظ سے ان کا مقدمہ

---

* مولوی عبدالحلیم صاحب ساحل سلطان پوری ، استاد عربی ، انجمن اسلام ہائی اسکول ، بمبئی

رقعات عالمگیر سے اپنے عہد شباب میں فارغ ہونا ان کی اردو شیفتگی یا بقول میر « وفا پیشگی » کی ایک بین دلیل ہے ۔

دارالمصنفین کا رنگ

سطور بالا سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ندوی صاحب نے اپنی مضمون نگاری کی بنیادیں (علامہ) شبلی اور سید سلیمان ندوی کی طرز نگارش پر استوار کیں ، اور غالباً انہیں کی پیروی میں اپنی تحریروں کا موضوع تاریخ ہی کو قرار دیا۔ چنانچہ مقدمہ رقعات اس کا ایک بیّن ثبوت ہے ۔

(علامہ) شبلی کی تحریریں ہوں یا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ، ان سب میں تنوع عبارات کے ساتھ ساتھ ایک باوقار اسلوب بیان اور پر جوش خطابت کا جوہری عنصر نمایاں ہے۔ یہی اسلوب بیان ، ندوی صاحب کی تحریروں میں بھی پایا جاتا ہے ، چنانچہ ایک جگہ مقدمـــــہ میں خطوط کی ہمہ گیری دکھاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

« اورنگ زیب کے خطوط اسی قسم کے گلہائے رنگا رنگ کا بہترین مجموعہ ہیں ۔ کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے۔ تو کہیں سیاسی و معاشری واقعات پر تنقید کہیں شوق وصال بے چین کئے ہوئے ہے تو کہیں درد و فراق نے مضطر کر رکھا ہے ۔ کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے تو کہیں کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے تو کہیں تنبیہ ، اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالا۔ سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر کہیں عنایت ہے تو کہیں عتاب ، کبھی گرم جوشی ہے تو کہیں سرد مہری، کہیں الزامات کی صفائی ہے تو کہیں دوسرے کیے خلاف شکایت، غرضیکہ وہ کونسی چیز ہے جو اس مجموعہ میں نہیں ہے۔ » (مقدمۂ رقعات عالمگیر ، صفحہ ۵۵)

جوش خطابت میں صحیح جذبات و واقعات کی تصویر کشی سے وہ کبھی قطع نظر یا تسامح نہیں برتتے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کوشش کرتے ہیں کہ سلاست الفاظ کی پوری رعایت اور قوی دلائل کی روشنی میں مدعا ایک واجب التسلیم حقیقت بن کر سامنے آ جائے ۔ اس طرز نگارش کی ایک عمدہ مثال وہاں

ملتی ہے جہاں انھوں نے رقعات کے مقدمہ میں خانگی مراسلت اور ذاتی روز ناموں کے مقابل نجی خطوط کی اہمیت کو سمجھانے کی سعی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

«ممکن ہے کہ ایک شخص جو ظاہرا زہد و اتقا کا پیکر مجسم ہو، اپنی اندرونی خباثت کو منظر عام سے تمام عمر چھپانے میں کامیاب ہوجائے لیکن اپنے ذاتی حالات سے واقف لوگوں سے جب وہ خط و کتابت کریگا تو وہ اپنی خباثت کو اس کی تمام عریانی کے ساتھ ظاہر کردے گا۔ بہت ممکن ہے کہ ایک حاکم جو اپنے کو سب سے بڑا دیانت دار اور منصف حکمراں ظاہر کرتا ہے، باطن میں اس کا دل حرص و ہوس، طمع و ظلم اور بے ایمانی کا مرکز ہو، ایسے حالات میں اس کی وہ تحریریں جو وہ دنیا کی نظروں سے چھپا کر لکھتا ہے اس کے حقیقی اخلاق پر بہترین شاہد ہوں گی۔» (مقدمۂ رقعات عالمگیر، صفحہ ۳۰)

جوش کتابت کے ساتھ جہاں کہیں طنز و تعریض کا موقع ہاتھ آتا ہے تو ندوی صاحب اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ یوں بھی زندگی میں شگفتگی مزاج و مزاح کے ساتھ ساتھ طنز و تعریض کے تیر و نشتر اکثر چلایا کرتے تھے۔ مذکورۂ بالا عبارت کے ساتھ ذیل کا لاحقہ ملاحظہ ہو، جس میں انھوں نے «مرحوم» انجمن اقوام متحدہ کے «چودھریوں» پر کاری ضربیں لگائی ہیں:

«ایک حکومت جو ببانگ دہل امن و آشتی اور خلاف جنگ معاہدوں کی ظاہرا سب سے بڑی مدعی و حامی ہو جب دوسری سلطنتوں سے اسلحہ و اسباب، جنگ کی خاموشی زیادتی کے متعلق معاہدہ کرتی ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس کے «درون خانہ» کا خیال «بیرون در» والوں کو کچھ نہ معلوم ہوگا اور وہ تمام دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکتی رہے گی۔ جب کبھی «رندان مست» کی بے احتیاطی اسی معاہدہ کی «لوح محفوظ» منصّۂ شہود پر آجاتی ہے تو دنیا محو حیرت ہوجاتی ہے، صلح و آشتی کا طلسم یک بیک ٹوٹ جاتا ہے اور وہ گربۂ مسکین، شیر غراں کی شکل میں دانتوں کو نکالے اور ناخنوں کو تیز کئے مہیب نظر آتی ہے . . . .»

«لیکن ہم اس جگہ اس بات کو بھی ظاہر کردینا چاہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں مغل سلاطین کے لکھے ہوئے تزک اور روز نامچے وہ خاص اہمیت

نہیں رکھتے جو خانگی خطوط کو حاصل ہے ۔ کیونکہ ان خطوط کو لکھتے وقت اس کا ہرگز خیال یہ نہ ہوتا تھا کہ وہ ہمیشہ «کتاب مکنون» کی طرح چھپے رہیں گے ۔ بلکہ وہ ان کو خود بھی دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے ، چنانچہ جہانگیر نے تو خود ۱۲ سال کے حالات لکھنے کے بعد اس کی متعدد نقلیں مختلف اشخاص کے پاس روانہ کی تھیں ۔ اور جب وہ خود نہ لکھ سکا تو اس نے یہ کام دوسرے شخص کے حوالہ کردیا ۔ ۔ ۔ ۔ ان حالات کی روشنی میں اگر ہم کو اورنگ زیب جیسی متنازع فیہ تاریخی شخصیت کے خطوط مل جائیں اور ہم ان سے اس کے اصلی اور صحیح حالات کو ترتیب دیں تو اس سے بہتر کونسی چیز ہوسکتی ہے (مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۳۲-۳۱)

انہوں نے اورنگ زیب کی شاہزادگی کے زمانہ کو اس کے پنجاہ سالہ دور حکومت میں شامل کرلینے کی تجویز کی توجیہ بھی اسی انداز سے کی ہے لکھتے ہیں :

«یوں تو کہنے کو اورنگ زیب کا عہد حکومت پنجاہ سالہ تھا ، لیکن ہمارے خیال میں اس کی شاہزادگی کے دنوں کو بھی ان میں شریک کرلینا چاہئے ، کیونکہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا اس وقت سے تخت حکومت پر متمکن ہونے تک ملک کے تمام اہم کاموں کا ہیرو وہی رہا ہے ۔ بندیلکھنڈ کی لڑائیاں ، دکن کی فتوحات بلخ و بدخشاں کی تسخیر ، مہم قندھار کی قیادت گولکنڈہ سے جنگ ، اور بیجا پوری علاقہ کا الحاق ، مختصراً وہ تمام اہم کام جو عہد شاہجہاں میں ہوئے ۔ ان سب میں اسی کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں اور اسی کا ہاتھ سب سے زیادہ کارفرما نظر آتا ہے ۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس کے پنجاہ سالہ عہد حکومت کے واقعات در اصل اس کی چہل سالہ عہد شاہزادگی کو اچھی طرح سمجھ لیا تو ہم کو اس کے عہد حکومت کے واقعات پر مطلقاً کوئی استعجاب نہ ہوگا (مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۳۴)

اسی طرح دارا شکوہ کی یا وہ گوئیوں اور اس کے برخود غلط و بلند بانگ دعووں کا پول کھولتے ہوئے ندوی صاحب کے زور قلم اور قوت استدلال کے تیور ملاحظہ ہوں :

«دارا شکوہ کم از کم لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اب وہ اس درجہ و مرتبہ کو پہنچ چکا ہے ، جہاں کہ کفر و اسلام ، الحاد و ایمان

نور و نار، خیر و شر، ظلمت و ضیا، عبد و معبود کا سوال باقی نہیں رہتا، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس نے یہ کتاب (حسنات العارفین) لکھ کر خود اپنا پردہ فاش کردیا، کیونکہ کسی خاص کیفیت و حالت کے ماتحت بعض وقت، بعض بزرگوں کی زبان سے جو جملے نکل گئے ہیں، ان کی سچائی یا صداقت پر انہوں نے کبھی بحث نہیں کی ہے۔ اور نہ ان کو اس کی پرواہ رہی ہے کہ اس جملے کے کون شخص کیا معنی پہناتا ہے، یا اس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے، کیا دنیائے تصوف کا کوئی واقف کار ہم کو اس قسم کی کوئی ایک بھی مثال دے سکتا ہے۔ منصور سولی چڑھ گیا، لیکن اس نے اپنے الفاظ واپس نہیں لئے، سرمد نے عریانی کو باقی رکھنے کے لئے جسم کا چولہ بھی اتار ڈالا، مگر اپنے اصول سے باہر قدم نہ رکھا، حضرت شہاب‌الدین سہروردی رحمۃاللہ علیہ اپنے عقائد ہی کے لئے شہید ہوئے، مگر ان میں سے ایک نے بھی اپنی مدافعت اور صفائی میں ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا، مگر دارا پر جہاں ایک آدھ آدمی نے اعتراض کیا وہ فوراً جواب دینے اور اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تصنیف میں مشغول ہوگیا، اور اس خیال کو تقویت دینے اور ہندوؤں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے اپنی وہ کتاب لکھی، جو مجمع‌البحرین کے نام سے مشہور ہے» (مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۳۵۸)

مندرجۂ بالا عبارت میں بزرگوں کے اسماء گرامی کے ساتھ ادب اور فرق مراتب کا جو لحاظ رکھا گیا ہے۔ وہ بھی قابل غور ہے۔ یہ وسعت معلومات، انداز تحریر اور ذوق انشاء کے کمال کی پختگی کی ایک روشن دلیل ہے۔

عالمگیر کی پوزیشن کو بے داغ ثابت کرتے ہوئے ان کے زور استدلال اور جوش بیان کی ایک عمدہ مثال، مندرجۂ ذیل اقتباس سے بھی ملتی ہے:۔

«اس بدقسمتی کا کیا علاج ہوسکتا ہے کہ وہی چیز جو تمام حکومتوں اور فرماں‌رواؤں کے لئے طرۂ امتیاز اور تغمائے افتخار ہو، وہی کاروائیاں جو سلاطین اور کشور کشاؤں کے حالات میں کارنامے کہے جائیں، غریب اورنگ زیب کے لئے ذلت و بدنامی، رسوائی و شرمساری کا موجب ہوں رومیوں نے قدیم دنیا کے تینوں براعظموں کے بیشتر حصہ کو اپنے گھوڑوں

کی ٹاپوں سے کچل دیا، لیکن یہ ان کی عظمت و شوکت کا سبب بن گیا سنکدر اعظم نے مقدونیہ سے لیکر پنجاب تک تمام متمدن ممالک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، لیکن یہی بربریت اس کی بڑائی کا ذریعہ ہے۔ دور کیوں جائیے خود مغلوں کے سب سے زیادہ نیک دل، غیر متعصب، وسیع المشرب بادشاہ اکبر نے بہار، بنگال، مالوہ، گجرات اور راجپوتانہ کو ہضم کرکے نربدہ پار کی مسلم ریاستوں پر حملہ کیا اور خاندیس، برار، اور احمد نگر وغیرہ پر قبضہ کیا، اس غاصبانہ قبضہ کا صلہ کیا تھا، کوئی مخالفانہ تنقید؟ کوئی منصفانہ فیصلہ؟ نہیں بلکہ «اعظم» کا خطاب دیا گیا۔

جہانگیر، شاہجہاں، نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں سے تمام عمر لڑتے رہے ہیں تو مورخوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی لیکن جب اسی نا مکمل و نا تمام کام کو اورنگ زیب مجبوراً پورا کرتا ہے تو اسے ظالم، غاصب، غیر سیاست داں اور متعصب کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ کونسا انسان ہے جو اپنے ذرائع میں وسعت کا طلب گار اور اس کے لئے کوشاں نہیں ہے، آج تک دنیا میں کونسی حکومت رہی ہے جس نے اپنے کو ابتدا سے انتہا تک صرف ایک مربعہ کے اندر محدود رکھا ہے۔ اور کیا آج اس تمام ادعائے تمدن و تہذیب اور صدائے جمہوریت و اشتراکیت کے باوجود جوع الارض اور شہنشاہیت کا بھوت ہمیشہ سے زیادہ مضبوط طریقہ پر اپنی گرفت مضبوط نہیں کئے ہوئے ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کچھ ہوتا تھا اس کا تمام دار و مدار ایک شخص واحد پر ہوتا تھا اور اب تمام ملک اور ساری قوم متحدہ طریقہ سے اس جرم میں شریک ہے۔ اس لئے جرم کی نوعیت زیادہ سخت، زیادہ مہلک اور زیادہ تباہ کن ہوگئی مگر پھر بھی یہ تمدن و تہذیب کا دور اور حرّیت و آزادی کا زمانہ ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آئین کے خلاف انگلی بھی اٹھا سکے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بـــد نام
وہ قـتل بھی کرتے ہیں تو چرچـا نہیں ہوتا

(مقدمہ رقعات عالمگیر، صفحہ ۱۴۲ ـ ۱۴۱)

چند اور خصوصیات تحریر

ندوی صاحب کی طرز تحریر میں جوش خطابت کے علاوہ جو شبلی اور سید سلیمان یا دارالمصنفین کا ایک مخصوص رنگ ہے اور بھی چند خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان میں سب سے اہم اور خاص خصوصیت ان کی وہ اعتدال پسندی ہے جسے انہوں نے قدامت نوازی اور تجدّد پسندی کے عبوری دور میں عربی و فارسی کے سبک و غیر سبک، متوازن و غیر متوازن الفاظ و تراکیب کے درمیان فرق و امتیاز سے لیکر مانوس و غیر مانوس، خوش آیند و غیر خوش آیند اسالیب بیان کے انتخابی مرحلوں تک بڑی احتیاط اور پورے استحکام کے ساتھ قائم رکھا ہے. اس احتیاط اور استقامت کی مثالیں اس دور کے لکھنے والوں میں کم ملتی ہیں. کہنے کو وہ شبلی کے سنجیدہ مگر شگفتہ طرز نگارش کو اور سید سلیمان ندوی کے متین مگر پر جوش عالمانہ انداز بیان کو اپنے لئے مثال بنائے ہوئے تھے، لیکن غائر نظر سے دیکھا جائے تو انہوں نے اس دور میں بھی اپنی انفرادیت تحریر کو قائم رکھا۔ جذبات یا حقائق نگاری کا میدان ہو، یا منطقیانہ دلائل کا مظاہرہ، الفاظ کی مرصع کاری ہو یا واقعات کا پر تمکین اظہار، خشک تاریخی حوادث کی فرد نویسی ہو یا کسی خاص واقعہ کی محاکات، ہر موقع و محل کے مناسب ان کا قلم نظم و ضبط کے ساتھ قدیم و جدید نثر نگاری کے میدان میں ایک خوشگوار اعتدال کی نشان دہی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے. اس ضمن میں اگر کہیں رنگین بیانی کا غازہ اور صنائع و بدائع کا رنگ و روغن کار فرما نظر آتا ہے، تو بس اس کی حیثیت ارد کی دال پر سفیدی کی سی ہے. اس زاویۂ خیال سے اگر ہم ندوی صاحب کو اس دور کا ایک اہم انشاء پرداز کہیں تو غلط نہ ہوگا.

اس موقع پر نا مناسب نہ ہوگا اگر ان کی تزئین و آرائش تحریر کے چند نمونے بھی پیش کر دئے جائیں. اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ندوی صاحب نے ذہن ایسا پایا تھا، وہ بات میں بات کرنے کے صرف قائل ہی نہیں بلکہ اس فن عالی میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی. یہی وجہ تھی کہ بمبئی میں منعقد ہونے والی علمی و ادبی مجلسوں میں جب وہ شرکت کرتے تو زینت محفل اور مرکز نگاہ ہوجاتے. ان کی گل افشانی گفتار، مجلس کو باغ و بہار بنا دیتی، کوئی شخص ان کی نکتہ فہمی، بذلہ سنجی اور پرواز خیال کی داد دئے بغیر نہ رہ سکتا. وہ

اپنے مطائبات سے اپنی تقریر کو کچھ اس طرح مزین کرتے کہ جامدو ساکت مجمع میں ایک پر کیف لہر سی دوڑ جاتی۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں بذلہ سنجی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ سنجیدہ و متین ہوتی تھیں لیکن مطائبات اور شگفتگی سے کبھی خالی نہیں رہتی تھیں۔ اس طرز نگارش کی مثالیں ان کی تحریروں میں جا بجا ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان کا یہ انداز تحریر صرف الفاظ کی ظاہری زیبائشوں یا ان کی تراش و خراش ہی تک محدود نہ ہوتا تھا، بلکہ اس نوع خاص کی رعنائیوں کا سلسلہ نفس معنی تک دراز ہوجاتا تھا، طوالت کے خوف سے اس صنف خاص کی عبارتوں میں سے صرف ایک عبارت نیچے نقل کی جاتی ہے۔ انہوں نے جگر مراد آبادی کی وفات پر نوائے ادب کے ایک شذرہ میں جگر اور اصغر گونڈوی کے باہمی تعلقات و تاثرات کو بیان کرتے ہوئے ان دونوں شاعروں کی شعری تخلیقات کا کیسا دل آویز تذکرہ قلمبند کیا ہے :

« مرزا احسان احمد نے ان کے کلام کو جمع کیا اس پر سیر حاصل، مقدمہ لکھا اور داغ جگر، کے نام سے اسے شائع کیا، جگر چونکہ اصغر گونڈوی سے متاثر تھے، اس لئے داغ جگر کی، اشاعت کا ایک مفید نتیجہ یہ نکلا کہ اصغر کا کلام « نشاط روح » کے نام سے شائع ہوا اور اس پر احسان احمد صاحب کے ساتھ ہی ساتھ مولانا اقبال سہیل نے تبصرہ لکھا، « نشاط روح » کا خوش گوار نتیجہ جگر کا دوسر دیوان « شعلۂ طور » تھا، جو پہلے علیگڈھ میں چھپا، لیکن مکتبۂ جامعہ کے افق سے چمکا، اب جگر کی نظر میں شعلہ و گل ایک تھے، اور اس لئے ان کا تیسرا مجموعۂ

« آتش گل » کی حرارت و نزاکت کا حامل ہے » (نوائے ادب جلد ۱۱ شمارہ ۴)

ندوی صاحب کا تنوع پسند قلم جب کبھی خاکہ نگاری یا محاکاتی اسلوب بیان اختیار کرتا ہے تو وہ مناظر کشی کے فرض کو بخوبی انجام دیتا ہے، لیکن اس رو میں نفس واقعہ کی حقیقت یا صداقت پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے پاتی۔ ندوی صاحب نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ اس راہ میں منظر کشی کے دوران واقعہ کی عظمت کو صدمہ نہ پہنچے، چنانچہ عالمگیر کی عہد طفلی کے ایک جرأت مندانہ اور جانبازانہ واقعہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں :

«دریا کے کنارے دو بد مست ہاتھی لڑنے کے لئے چھوڑ دئے گئے تھے ان میں سے ایک کا نام سدھ کر اور دوسرے کا نام صورت سندر تھا، دارا، شجاع اور چہاردہ سالہ اورنگ زیب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار میدان ہی میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے، لڑائی شروع ہوئی، صورت سندر ایک طرف کو بھاگا، سدھ کرنے تعاقب کیا، حریف دور نکل گیا تھا، اس لئے سدھ کرنے مجمع کی طرف رخ کیا، سب سے آگے اورنگ زیب کا گھوڑا تھا، مجمع میں ایک عام انتشار پیدا ہوگیا، لیکن اورنگ زیب:

بمردی زجاہیک سرمو نشد زپیشِ چنان سیل یکسو نہ شد
بتمکین سرشتہ زبس جوہرش نجنبید جز نبض از پیکرش

اور جوں ہی اس کے پاس پہنچا، اورنگ زیب نے «بازوئے جلادت کشودہ بزخم برچھ پیشانی آن درو نہاد، دیونژادرا مجروح ساخت، چوٹ کھاکر اور غضبناک ہوا اور پورے جوش کے ساتھ اورنگ زیب کی طرف لپکا، اس اثنا میں دوسرے لوگ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے چرخی اور بان چھوڑنا شروع کیا، مگر سیہ مست ہاتھی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے اورنگ زیب کے گھوڑے پر اس زور سے اپنے دانتوں سے حملہ کیا کہ اورنگ زیب کا گھوڑا لڑکھڑا کر گرا، حاضرین کی سانسیں یک بیک رُک گئیں، لیکن اورنگ زیب کی پیشانی پر بل تک نہ تھا، وہ فوراً اچک کر کھڑا ہوگیا، تلوار نیام سے کھینچ لی، اتنے میں شہزادہ شجاع کی رگوں میں برادرانہ محبت کے خون نے جوش مارا، وہ بڑھا ہی تھا کہ اس کے گھوڑے کے ماتھے پر ایک چرخی آکر لگی، اور وہ وہیں گر پڑا، دوسری طرف سے راجہ جے سنگھ نے نیزہ سے حملہ کیا، اس اثنا میں صورت سندر نے اپنے دشمن کو دوسری طرف متوجہ دیکھ کر عقب سے آکر حملہ کیا اور سدھ کر جو اس وقت آتش بازی وغیرہ سے پریشان ہوچکا تھا، بھاگ کھڑا ہوا»

(مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۱۳۳-۱۳۴)

ندوی صاحب کی طرز تحریر کی ایک دوسری خاص چیز جو لائق توجہ ہے وہ ان کی عبارت آرائیوں کے درمیان برمحل و برجستہ اقتباسات کی پیشکش اور ان کا نفس مضمون سے درو بست ہے، وہ جب بھی اپنی عبارت میں کسی دوسرے مصنف کا

نثری اقتباس پیش کرتے ہیں تو اپنی عبارت سے اس کا پیوند اس چابکدستی کے ساتھ صوری و معنوی حیثیتوں سے جوڑتے ہیں کہ اگر وہاں « واوین » کی علامتیں نہ ہوں تو یہ پتہ لگانا مشکل ہو کہ یہ اقتباسی جملے خود صاحب تحریر کے ہیں یا کسی اور کے اس کا ایک سرسری اندازہ اوپر کے آخری اقتباس سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس نوعیت کے اقتباسات بہ کثرت مقدمۂ رقعات میں آئے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے مزید اقتباسات نقل نہیں کئے جاسکتے ۔

لسانیات کے مسائل کی توضیح عموماً ایک خشک پیچیدہ بلکہ ژولیدہ اور غیر دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے لیکن ندوی صاحب کا قلم اس سنگلاخ میں بھی بڑی روانی اور سبک خرامی کے ساتھ چلتا ہے. چنانچہ « لغات گجری » کے مقدمہ میں، اردو زبان کی نشو و نما اور اس کی رفتار ترقی کو دکھاتے ہوئے انہوں نے بہت شستہ و شائستہ بیانی کا لحاظ رکھا ہے ہے ۔ اس ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ جب کسی موضوع پر لکھنا چاہتے تو اُس وقت تک قلم نہ اٹھاتے جب تک ان کا ذہن مکمل طور پر اس کے لئے تیار نہ ہو جاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب لکھنا شروع کرتے تو پورے انہماک کے ساتھ لکھتے اور ان کا مسودہ کہیں سے کٹا پھٹا نہ ہوتا ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لغات گجری کا مقدمہ انہوں نے تین دن میں مکمل کر لیا تھا ۔ لغات گجری کا ایک پیراگراف ملاحظہ ہو :

« آرین قوم جب سندھ و پنجاب ہوتی ہوئی دلّی تک پہنچی اور اس کے اطراف میں اس نے اپنی مرکزیت قائم کی تو دیسی اور پردیسی کے میل ملاپ سے ایک مشترکہ زبان پیدا ہوگئی ۔ جب اس علاقہ سے آریوں نے مشرق و مغرب میں پھیلنا شروع کیا تو اس زبان کی دو شاخیں ہوگئیں، ایک شاخ برج سے لے کر دہلی، مشرقی پنجاب، ہریانہ ہوتی ہوئی راجستھان کے مختلف علاقوں سے گزرتی ہوئی گجرات میں ہی نہیں بلکہ مہاراشٹر کی آخری حد تک پہنچی ہے اور دوسری مشرق کی طرف پھیلتی ہوئی اودھ ، بہار ، بنگال ، اڑیسہ سے لے کر آسام تک چلی جاتی ہے ، لیکن یہ مہاجرت ایک وقت میں ایک ساتھ نہیں ہوئی ہے، اس لئے جو موجودہ زبان دہلی اور برج کے علاقہ سے جتنی دور ہے، اس میں اس مخلوط زبان کے اتنی ہی پرانی شکل کے الفاظ اور جملے ملتے ہیں ۔ جنوب و مغرب میں یہی

زبان تھی جسے برج، زبان اسلام آباد متھرا، برج بھاشا، زبان بھاکھا، بھاکھا اور بھاشا کہا جاتا ہے، اور یہی زبان تھی جس نے موجودہ بولیوں میں سب سے پہلے ادبی درجہ حاصل کرلیا تھا۔ چنانچہ چند بردائی کی "پرتھوی راج راسو" ہی جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے اس زبان کی پہلی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں اس سے قبل کی بھی بعض نظموں کا تذکرہ ملتا ہے، مشرقی شاخ بڑی حد تک پالی اور مگدھی سے متاثر ہے۔ ان جنوب و مغرب کی زبانوں کی ماں سورسینی ہے۔ دہلی میں جب برج کی بولی ایک معیاری درجہ حاصل کرلیتی ہے اور اس میں الفاظ کی شکلیں موجودہ برج بھاشا سے مختلف ہو جاتی ہیں تو ہندو اور ہندوی بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کا نام بھی پاتی ہے اور اسی مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے پہلے ریختہ پھر زبان اردوئے معلّی پھر زبان اردو اور آخر میں اردو کا لفظ استعمال ہونے لگتا ہے۔" (مقدمہ لغات گجری صفحہ ۹-۸)

ندوی صاحب کی تحریروں کے اچھے نمونے نوائے ادب کے شذرات میں بھی ملتے ہیں، مثلاً ذیل میں چند عبارتیں ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۵۳ء میں ایرانی سفارت خانے کے تمدنی عملہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کے شائع ہونے پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے سلیس اور رواں انداز میں کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"تقریباً ٦ سال سے ہمارا ملک آزاد ہے اور اس نے اپنی گذشتہ عظمت اور دیرینہ روایت کے سہارے نہ صرف ایشیا بلکہ اس سے بڑھ کر ساری دنیا میں عموماً اور غیر مغربی ملکوں میں خصوصاً ایک درجہ اور مقام پیدا کرلیا ہے، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی ممالک سے اس کا ایک خاص رشتہ قائم ہوگیا ہے اور دنیا کی شاید ہی کوئی اسلامی سلطنت یا ملک ایسا ہوگا جس سے اس کے سیاسی سے زیادہ تمدنی اور تہذیبی روابط قائم نہ ہوچکے ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی آزادی کے بعد سے جن اسلامی ممالک نے شہنشاہیت کا جوا اتار پھینکا ہے یا اس کے پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کو ہر قسم کی اخلاقی و صلح پسندانہ زیادہ سے زیادہ مدد دینے کی عزت ہمارے ملک کو حاصل ہے اور اسی کا یہ لازمی اثر ہے کہ یہ ممالک بھی ہمارے ملک سے زیادہ سے زیادہ تمدنی،

علمی اور تہذیبی تعلقات پیدا کرنے کے لئے نہ صرف اپنے ملکوں میں بلکہ ہمارے ملک میں بھی عملی قدم بڑھا رہے ہیں۔ ترکی اور مصری حکومتوں نے طلبہ کو وظیفے دئے ہیں۔ افغانستان، ایران میں سنسکرت کی تعلیم کے لئے خاص انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہندوستان کے مشہور پنڈت مقرر کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک نئی کڑی ایرانی کے تمدنی محکمہ کا سہ ماہی رسالہ ایران و ہند ہے، جس کا پہلا شمارہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔» (نوائے ادب، جلد ۴۔ شمارہ ۱)

ندوی صاحب جب کسی شخصیت کی وفات پر اظہار تأسف کرتے ہیں تو اپنی تحریروں میں متوفی کے علمی کمالات اور محاسن سیرت کا تذکرہ بڑی فیاضی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس معاملے میں انھوں نے کبھی قلمی بخل سے کام نہیں لیا۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے سانحۂ ارتحال پر لکھتے ہیں:

«مرحوم نہ صرف عربی۔ فارسی اور اردو کے ایک وسیع المطالعہ محقق ادیب اور انشا پرداز تھے، بلکہ اسلام کے سیاسی، تمدنی اور ثقافتی تاریخ کے بھی مستند عالم و ماہر تھے۔ علوم اسلامیہ میں وہ سارے صوبہ میں سب سے ممتاز تھے اور ایک استاد کی حیثیت سے ان کا شاید ہی کوئی جواب ہو۔ ان کی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف تھی اور جہاں کہیں بھی ان کی خدمت کا ذرا بھی موقع ہوتا وہ ہمہ تن اس مصروف ہو جاتے۔ بظاہر وہ اسماعیل یوسف کالج کے عربی و فارسی کے استاد تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام علمی مجلسوں کی رونق اور تمام تحقیقی اداروں کی زندگی و درخشندگی اسی ایک شمع علم کے پرتو کی ممنون ہے۔» (نوائے ادب، جلد ۴، شمارہ ۳)

ترجمے:۔ ندوی صاحب نے دارالمصنفین کی رفاقت کے زمانہ میں چند انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔ ترجمہ کسی زبان سے کسی زبان میں کیا جائے لیکن روح اصل جب تک نقل میں جلوہ گر نہ ہو، ترجمہ بھدا، بھونڈا اور پھس پھسا کہلائے گا۔ اس لحاظ سے ندوی صاحب کے ترجمے کامیاب ترجمے کہے جاسکتے ہیں، ان کے ترجموں کو پڑھ کر تصنیف کا گمان ہوتا ہے۔ مثالاً صرف ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

« برطانوی تاج کے ماتحت نوآبادیات کی حکومت کی ایک یہ صورت ہے کہ جماعت مقننہ منتخب ہوتی ہے اور اس طرح نوآبادی کی نیابت کرتی ہے، لیکن جماعت انتظامی ایک گورنر اور ایک مجلس عاملہ پر مشتمل ہوتی ہے، اسے برطانوی حکام مقرر کرتے ہیں، اور وہ نو آبادی کی جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتی۔ اس کو « نیابتی حکومت » کہتے ہیں، اور برطانوی نو آبادیات میں سے اکثر جن کو اب « ذمہ دارانہ » حکومت کی عزت حاصل ہے، اس منزل سے گذر چکی ہیں۔ یہ ایک بہت ہی غیر مستقل قسم کی حکومت ہے، کیونکہ اگر منتخب جماعت مقننہ اور گورنر میں اختلاف ہوجائے تو ان کے اختلاف کو طے کرنے کا کوئی دستوری ذریعہ نہیں ہے، اور اگر جماعت مقننہ کو مالیات اور قانون سازی کے کل اختیارات حاصل ہوں تو وہ دستوری حکومت کو بیکار کرسکتی ہے۔ اس قسم کی دستوری گتھی کو سلجھانے کی صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو اسے شاہی نو آبادی کی حکومت کی طرف واپس کردیا جائے کہ اس حالت میں جماعت مقننہ جو منتخب کی جگہ نامزد ہوتی ہے ایسے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جو جماعت عاملہ کے ہم رائے ہو، یا ذمہ دارانہ حکومت کی طرف بڑھا دیا جائے۔ ایسی حالت میں ایک ایسا گورنر جسے برطانوی حکومت مقرر کرتی ہے اور جسے اس قلمرو کی حکومت برخاست نہیں کرسکتی، جماعت عاملہ کے برائے نام افسر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہتا ہے، لیکن اصلی اختیارات ایک وزارت کے قبضے میں ہوتے ہیں، جسے قلمرو کی جماعت مقننہ بنا اور بگاڑ سکتی ہے» («برطانوی ہند کا نظام سیاسی» باب اول صفحہ ۴۸)

چند تسامح

اگرچہ ندوی صاحب کی تحریریں عموماً غیر فصیح الفاظ، نامانوس کلمات، عربی و فارسی کی ثقیل تراکیب اور تصنع و تکلف سے مبرّا ہیں، تاہم کہیں کہیں ان سے تسامح ہوگیا ہے۔ مثلاً وہ بعض موقعوں پر عربی ترکیبوں کو خالص عربی انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے:

علی حالہ، طراوت و نضارت، ذو معنین الفاظ، افواج بحر مواج، مصمم الارادہ وغیرہ۔

اسی طرح ان کے استعمال میں آئے ہوئے یہ الفاظ و تراکیب محل نظر ہیں:
قریب المرگ ، خفیف الحرکتیوں ، غیر فطرتی جنگ ، « عدم تعمیل حکم کے وقت » وغیرہ .

خــاتمہ :

ندوی صاحب کی نثر نگاری کی اٹھان بتاتی ہے کہ اگر وہ لکھنا بند نہ کرتے تو اردو کے ایک صاحب طرز انشا پرداز ہوتے اور اردو نثر کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوتا . گو وفات کے وقت وہ اپنی طبیعی عمر کو پہنچ چکے تھے ' لیکن ہمارے لئیے تو ان کے علمی و ادبی کارناموں کی حیات بہت مختصر رہی؛ اس لئیے نظیر صاحب ہر کی رائے ان کے بارے میں خصوصاً مقدمۂ رقعات عالمگیر کو پڑھ کر یہی ہوسکتی ہے :

خوش در خشید ولی شعلۂ مستعجل بود

* شریف احمد

ندوی صاحب اسماعیل کالج میں

مئی ۵۲ع کے ایک اتوار کی شام کو گھوڑ بندر روڈ، اندھیری کے ایک وسیع و فراخ بنگلے کے برآمدے میں ندوی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ بنگلے کا احاطہ خاصا بڑا تھا، لیکن اصل عمارت بہت بڑی نہ تھی۔ در و بام سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکین کوئی صاحبِ ثروت تو نہیں لیکن با ذوق انسان ضرور ہے۔ اور جب برآمدے میں تکئے دار مونڈھے دیکھے، تو محسوس ہوا کہ صاحب خانہ کا تعلق بمبئی سے نہیں، شمالی ہند سے ہے۔ میں اور میرے عزیز معنی عباسی، اُردو، ہندی کے مشہور جرنلسٹ ابھی مونڈھوں کی ساخت اور «پرداخت» پر (پرداخت اس لئے کہ بعد میں ندوی صاحب نے بتایا کہ مونڈھوں کے لئے پرداخت کی بے حد ضرورت ہے) غور ہی کر رہے تھے کہ ایک بزرگ، ملے ہوئے بڑے کمرے سے برآمدے میں وارد ہوئے۔ عمر لگ بھگ پچاس سال، سفید براق، چاندی کے تاروں کی طرح بال، تابندہ پیشانی، کتابی چہرہ، آنکھیں روشن، تیز، چمکیلی، خاصا دراز قد و قامت، گورا چٹا رنگ، سفید کرتے پاجامے میں ملبوس، پاؤں میں کالا سلیپر۔ معلوم ہوا نجیب اشرف ندوی یہی ہیں۔ نجیب اشرف کا مفہوم تو میری سمجھ میں آ گیا۔ ندوی کا کیا مطلب ہے، بہت دن بعد میری سمجھ میں آیا۔ ندوی صاحب اور معنی صاحب کے درمیان خدا جانے کن کن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اپنے متعلق میں صـــرف اتنی بات سُن سکا، «اردو میں داخلہ ہوجائے گا۔ کالج کھلنے پر پہنچ جانا» بنگلے سے باہر نکلنے پر جن چیزوں پر میں نے بار بار سوچا، وہ تھیں ندوی صاحب کا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں تو نظروں سے نظریں ملاکر بات کرنے کا انداز اور بالائی ہونٹ جو متحرک ہوکر دائیں طرف کو خمیدہ ہو جاتا تھا، لیکن میں نے جلد ہی اللہ سے دل میں توبہ کی کہ یہ کیا اور کیسی باتیں مجھے یاد آ رہی ہیں۔ مجھے تو عالم کے علم کے متعلق سوچنا چاہئے۔

* جناب شریف احمد صاحب امروہوی ایم اے، استاد اردو، انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کالج کھلنے پر میں ندوی صاحب کے پاس پہنچا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں ندوی صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے لئے آج وہ ایک مختلف انسان تھے، کالے موٹے فریم کا چشمہ، نہایت دیدہ زیب ہلکا آسمانی سوٹ، سفید، سخت کالر پر گہری نیلی ٹائی، میرے اللہ! اردو کے پروفیسر ایسے ہوتے ہیں؟ میں نے تو امروہہ میں اردو کے استادوں کو ملگجی شیروانی، بڑی مُہری کے ہوادار پاجامے اور چہرے پر مسکینیت کے آثار لئے دیکھا تھا۔ چار پانچ لڑکے اور اتنی ہی لڑکیاں ندوی صاحب کی میز کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ ندوی صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے سلام کیا۔ نظریں اُٹھائے بغیر انہوں نے جواب دیا اور کہا، «آگئے آپ؟ یہ تمہارے بی۔اے آنرز اردو کے ساتھی ہیں۔ میں نے ذرا ٹَسنے کے لئے انہیں، «اقبال کی خودی» پر ایک مضمون لکھنے کو دیا ہے۔ لکھ ڈالئے آپ بھی۔» میں یوں اچانک «ٹَسے» جانے کے تیار نہ تھا، سٹپٹایا۔ ندوی صاحب نے چشمہ اُتارکر نظروں سے نظریں ملاکر دیکھا اور بہت جلد میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم کاغذ پر اضطراری طور پر چل پڑا۔ میں نے سوچا کہ اس طرح کسی نے کاہے کو مضمون لکھا ہوگا۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد میں مضمون ختم کرکے قلم جیب میں رکھ چکا تھا، اس لئے کہ انٹرمیجیٹ نصاب میں شامل، آل احمد سرور کا اقبال پر ایک مضمون مجھے تقریباً حفظ تھا۔ اب ندوی صاحب اپنے کام سے فارغ ہوچکے تھے۔ «یعنی چہ؟ سب لوگ لکھنے میں مشغول ہیں اور آپ کہ بساط ہوائے دل پر تازہ وارد ہیں۔ ہوسِ نائے و نوش بھی فرما چکے! ذرا دیکھیں تو» میری کاپی ندوی صاحب کے ہاتھوں میں تھی، لڑکوں اور لڑکیوں کی نگاہیں مجھ پر تھیں اور میری نگاہیں کھڑکی کے باہر کالج گارڈن کے گھنے درختوں اور پودوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ «ارے یہ Bombast! «خندۂ تیغِ اصیل، «گریہ ابرِ بہار، کیا ترکیبیں ہیں؟ مطلب بھی سمجھتے ہیں آپ یا یوں ہی لکھ ماریں؟» ندوی صاحب کا بالائی ہونٹ یہ کہتے ہوئے خمیدہ ہوگیا تھا، میں نے گھبراہٹ میں ان ترکیبوں کا نہ جانے کیا انٹ شنٹ مطلب بتانا شروع کیا۔ لیکن بہت جلد مجھ پر کھلا کہ گویا میں سوتے میں بہک رہا ہوں اور اگر فوراً ہی خاموش نہ ہوا تو تیغِ اصیل میرا کام تمام کردے گی اور میں گریۂ ابر کا باعث بن جاؤں گا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی نگاہیں سوئیاں بن کر میرے

سم میں اُتر چکی تھیں، ندوی صاحب نے رجسٹر اُٹھاکر کہا، «آپ کا نام اردو
ز کے طلبہ میں لکھ لوں؟» میں نے ہڑ بڑا کر کہا، «جی ہاں! بالکل لکھ
ئیے .» ندوی صاحب نے بڑا بانکا سوال کیا. «آپ کا نام لکھ لوں یا بالکل
ھ لوں؟» «جی، ' بالکل، سے میرا مطلب ہے ضرور .»
' بالکل، کا یہ مفہوم آپ نے کون سی ڈکشنری میں دیکھا؟»
ں روہانسا ہوچکا تھا، تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد جو اُس وقت میرے لئے
ی طویل اور تکلیف دہ تھی، ندوی صاحب نے اپنے پورٹ فولیو میں ہاتھ ڈالا اور
ں نے دیکھا کہ اُن کے سفید، گوشت سے بھرے فراخ ہاتھ میں رنگ برنگی
فیا تھیں' «لو بھئی یہ تحفۂ درویش.»

لڑکوں اور لڑکیوں کے آزمودہ ہاتھ یکبارگی اُٹھے اور ٹافیاں اُٹھا لی گئیں.
پر سوچے سمجھے میں نے بھی ایک ٹافی اُٹھالی.

یہ کالج میں، اسماعیل کالج میں میرا پہلا دن تھا. اسماعیل یوسف کالج، ناص بمبئی سے سولہ میل کے فاصلے پر، جو ایک نواحی مقام جوگیشوری میں اقع ہے. کالج کا احاطہ ریلوے اسٹیشن سے چند ہی قدم بعد شروع ہوجاتا ہے. ہر نچ، دس منٹ کے بعد برقی ریل گاڑیاں بمبئی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کو تی ہیں. اور یہ ہجوم جب کالج کی طرف مل کر چلتا ہے تو ایک عجیب دلکشا نظر ہوتا ہے. کالج کے صدر دروازے اور عمارت کے درمیان ایک چھوٹی سی پختہ سڑک بل کھاتی ہوئی جاتی ہے اور زمین کی سطح بتدریج بلند ہوتی جاتی ہے. سڑک پر تین تین، چار چار طالب علم قدم ملائے جوق در جوق دونوں طرف سبزہ زار، اِکا دُکا درخت، جھاڑیاں اور چھوٹی بڑی چٹانیں راستے میں داہنی جانب ذرا فاصلے پر ہوسٹل کی عمارت، کھیل کا میدان اور مسجد. کالج کی عمارت میں پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی ورزش ہوجاتی ہے. ندوی صاحب بھی طلبہ کے ساتھ یہ ورزش بڑی خوش طبعی سے کرتے تھے. راستے میں جملے فقرے اور تبصرے، بلکہ حالات حاضرہ پر پورا تبصرہ کرتے ہوتے چلتے تھے. کوئی شخص، طالب علم ہو یا طالبہ، حتیٰ کے رفیق کار بھی اُن کے جملوں، فقروں سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا. کوئی عُجب، کوئی ٹیڑھ، کوئی بے ہنگم پن رفتار میں ہو یا گفتار میں ندوی صاحب کے احساس مزاح کو گدگدائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا. یہی وجہ تھی

کہ ہجوم اُن سے خوش رہتا تھا اور وہ ہجوم سے ۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ حقیقت مجھ پر روشن ہوگئی کہ ندوی صاحب نہ صرف اپنے کالج میں بلکہ پوری یونیورسٹی میں مقبول اور نمایاں ہیں۔ اسماعیل کالج میں درس دیتے ہوئے انہیں اتنی مدت گزر گئی تھی کہ اکثر وہ کالج کی پوری تاریخ باتوں باتوں میں کہہ سناتے تھے:

« سر یوسف کے دل میں خدا نے قوم کا درد دیا۔ ہزاروں روپئے جیب خاص سے دئیے۔ ٹرسٹ قائم کیا۔ دوسرے اہلِ خیر بھی میدان میں اُتر آئے۔ پھر ، اس کام کو چوں کہ ہونا تھا اس لئے ڈاکٹر بذل الرحمٰن جیسا لائق پرنسپل بھی مل گیا۔ بذل الرحمٰن مرحوم نے، کہا جاسکتا ہے کہ اپنے « ابروؤں کے پسینے » سے اس کھیتی کو سینچا ہے۔ اسماعیلیوں (اور اس سے اُن کی مراد اسماعیل کالج کے فارغ التحصیل طلبہ سے ہوتی تھی) کی، تب سے اب تک ، خاصی بڑی تعداد ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی ہے۔ اسماعیل کالج مہاراشٹر میں ایک علی گڑھ in miniature کا خواب ہے۔ اب تم لوگ چاہے اسے ہوا میں تحلیل کردو ، چاہے اس کی ٹھوس تعبیر پیش کرو۔ »

ماضی کا ذکر ، خواہ کسی بھی شکل میں ہو ، اکثر افراط و تفریط کا شکا ہوجاتا ہے ۔ ۱۹۵۲ سے پہلے کے اسماعیل کالج کو میں نے نہیں دیکھا۔ لیکن ایسے متعدد « اسماعیلیوں » کو میں جانتا ہوں ، جنھوں نے اس مادر علمی کی آغوش میں اپنے ذہن کے اُفق روشن کئے ہیں۔ پھر اُس وقت تک ندوی صاحب اور دیگر اساتذہ (بالخصوص پروفیسر ڈار مرحوم ، پروفیسر نقوی ، ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی اور ڈاکٹر عالی جعفری صاحبان) کا وہاں وجود اُس عظیم عہد کا بلیغ سایہ ضرور تھا جس کا ذکر اوپر کی سطور میں کیا گیا۔ شاداب ماحول میں بلندی پر کھڑا کالج جہاں سے بغور دیکھنے پر بحرعرب کے ساحل کی لکیر نظر آئے ، بھری پری لائبریری (جس کے حصۂ اردو کے جامع ہونے میں یقیناً ندوی صاحب کا ہاتھ تھا) اپنی اپنی حدوں میں رہنے والے ذہین ، اوسط درجے کے، غبی، شریف اور شریر طالب علم اور طالبات ، نہ ہڑتال نہ مظاہرے ، نہ گیراؤ۔ ادبی علمی معرکے اور « فتوحات » چھوٹے موٹے اسکینڈل اور رومان ، طلبہ کی یونین کے خوش گوار ہنگامے۔ پھر ہوسٹل کی ایک الگ دنیا ، نت نئی مجلسیں ، انجمنیں ، آئے دن کے انتخابات ، وارڈن تقوی

ب کی سخت لیکن شفیق نگرانی۔ کیا زندگی تھی اور کیا اُس کے شب و روز!
کسی بھی علمی ادارے میں تمام اساتذہ یکساں طور پر مقبول اور لائق و
نہیں ہوتے۔ اسماعیل کالج بھی اس باب میں کوئی استثنا نہ تھا۔ تاہم اُس وقت
ادارے میں کئی اساتذہ اپنے اپنے مضامین کے ماہر جمع ہوگئے تھے۔ غالباً
صاحب اس حیثیت سے منفرد تھے کہ اُن کی شخصیت بڑی پُر اثر اور دلنواز
اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ «آن» رکھتے تھے۔ اس آن نے انہیں مقبول
متنازعہ فیہ (Controversial) دونوں بنا دیا تھا۔ آن کچھ ایسی ہی چیز ہے کہ
جلوؔ میں قبول عام اور اختلاف رائے لےکر چلتی ہے۔

ندوی صاحب اپنے رفقائے کار کے حلقے میں ہوں یا طلبہ کے، اور طلبہ اُردو،
ں کے ہوں یا دوسرے مضامین کے، مسلم ہوں یا غیر مسلم، وہ ہمیشہ مرکز
ہوتے تھے۔ ذہانت، حافظہ اور شیرینیِ گفتار اُنہیں قدرت سے ودیعت ہوئی تھی۔
ل اور طویل مطالعے نے اُن کی فکر و نظر میں بڑی وسعت پیدا کردی تھی۔
جہ تھی کہ وہ جس محفل میں پہنچتے تھے میر محفل بن جاتے تھے۔ مخاطب
لچسپی کے لئے وہ موقع موقع سے اُردو اور انگریزی کے علاوہ گجراتی اور
ں بھی بول لیتے تھے اور گفتگو کو پُر وقار بنانے کے لئے عربی و فارسی کے
حوالہ جات بھی استعمال کرتے جاتے تھے پھر موضوعات کی کوئی شرط یا بندش
ے۔ وہ ٹھوس اور دقیق علمی موضوعات سے لےکر موسم، فلم، فیشن اور اشیاء
نرانی پر بے تکان گفتگو کرسکتے تھے۔ اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔

اسماعیل کالج کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیاں، جب تک وہ کالج سے
رہے، اُن کے دم سے تھیں۔ صرف اسٹیج پر اُن کا موجود ہونا اس امر کا
تھا کہ جلسہ خشک اور رسمی نہیں ہوگا۔ مہمان شاعر، ادیب یا دانش ور کا
ں وہ اتنے غیر رسمی اور دلچسپ انداز میں کراتے تھے کہ خود مہمان کو (کبھی
اپنی عادت کے خلاف) دلچسپ ہونا پڑتا تھا۔ ایک بار علامہ عبدالعزیز میمن
«بہت ٹھوس» علمی تقریر کرنے والے تھے۔ ندوی صاحب نے تعرفاً فرمایا،
مہ بڑا حاوی لفظ ہے اس میں مفاہیم کی بہت سی سطحیں سمٹ آتی ہیں۔
سطح یہ بھی ہے کہ علامہ سمجھتا ہے کہ میرے مخاطب کون ہیں۔ ان کا ذہنی
تنی لمبائی، چوڑائی رکھتا ہے۔ معزز حاضرین، آپ کو ہرگز ہرگز گھبرانے کی

ضرورت نہیں ہے۔ علامہ میمن آپ کی (اور میری بھی) لمبائی چوڑائی بہت اچ
طرح جانتے ہیں۔ آپ اُن کی تقریر سننے کے بعد مجھ سے اتفاق کریں گے کہ
عزیز بھی ہیں اور میمن بھی" مجھے معلوم نہیں کہ تقریر سننے کے بعد سامعین:
ندوی صاحب سے کس حد تک اتفاق کیا، لیکن خود علامہ میمن پر یہ اثر ہوا
انھوں نے ایک دقیق اور کلامی موضوع کو پانی کرکے رکھ دیا۔

ایک بار انھوں نے فلم اداکارہ نمّی کو یوں تعارف کرایا:

"حضرات، میں آپ کی معلومات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آگرے کو اکبرآباد بھی کہتے ہیں، اس اکبرآباد نے ہمیں تاج محل دیا ہے، نظیر اکبرآبادی دیا ہے اور ہماری آج کی مہمان نمی کو دیا ہے۔ یعنی تعمیر شاعری اور اداکاری آگرے کی دین ہے۔ اور یہ اللہ کی دین ہے کہ نمی آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔۔۔"

بات سے بات انھیں خوب پیدا کرنا آتی تھی۔ وہ مرادفات اور مناسبات بھی خوب استعمال کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں کبھی کبھار غیر معتد ہوجاتے تھے۔

اُنھیں شدید احساس تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی جس نسل سے اُن کا تعل تھا، وہ بڑی تیزی سے ختم ہو رہی تھی اور اُس کی جگہ جو نسل لے رہی ت اُس سے وہ مایوس تو نہ تھے، لیکن مطمئن ضرور تھے۔ وہ خود پابند وضع او اخلاقی اقدار کے قائل تھے اور دوسروں کو بھی انھیں صفات سے متصّف دیکھ چاہتے تھے۔ ہر جمعہ کو اُنھیں دو پلی، سفید بے داغ شیروانی اور چوڑی دار پاجام میں پایا گیا۔ وہ کالج کی مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تو طلبہ کا ایک جم غفیر کچھ اُن کی اور کچھ اللہ کی خوشنودی کے لئے راستے میں اُن کے ساتھ ہوجا بس میں چاہے پانچ طالب علم ہوں یا پچیس، اگر ندوی صاحب موجود ہوتے تو پھ سب کے ٹکٹ وہی خریدتے اور باصرار خریدتے۔ عیدین کو وہ مسکراتے چہرے اور مشتاق ہاتھوں سے آنے والوں خیر مقدم کرتے۔ دو کیلے، ایک الائچی اور ایک عطر کی پھریری سے تواضع کرتے اور پھر ایسی بات چھیڑ دیتے کہ سُننے والے کو مکان نہیں تو زمان کا احساس یقیناً باقی نہ رہتا تھا۔ وہ نہ شاہ خرچ تھے، :

ممسک. اُن کے گھر اور گھر کی چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ایسا آدمی رہتا ہے جو زندگی اور زندگی کی نعمتوں کا احترام کرتا ہے۔

«حیوان ظریف» بلی ماروں کے محلے کے مرزا نوشہ ہی نہیں تھے، ندوی صاحب بھی تھے۔ مرزا نوشہ کی طرح مبدائے فیاض نے ندوی صاحب کے دل و دماغ میں بھی ذہانت و فطانت، ذکاوت و فراست، طنز و مزاح، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی بجلیاں پیس کر بھر دی تھیں۔ اُس پر مستزاد ان کی پُر اثر شخصیت۔ اُن کا تعلق افرا سیاب سے نہ تھا۔ نہ وہ ماوراء النہری تھے۔ لیکن نجیب الطرفین ضرور تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے «نجیب اشرف کا مطلب سمجھتے ہو؟ اچھا ڈکشنری لاؤ۔ مگر تم کیا لاؤگے کہ تمہارا تعلق کاہلوں کی سدا بہار نسل سے ہے۔ نجیب اشرف کا مطلب ہے نجیب الطرفین» انھوں نے مشرقی تعلیم بھی پائی تھی اور مغربی بھی۔ بخت و اتفاق نے اُن کے اجداد اور اُن کا تعلق متوسط طبقے کی اوپری پرت سے رکھا تھا۔ غالباً انہیں عوامل نے اُن میں ایک ہلکی سی انا کی لہر پیدا کردی تھی۔ (انا اور آن میں کتنا قریبی رشتہ ہے!) اس لہر کو اُن کے یہاں کبھی شدید نہ پایا گیا۔ اگر یہ لہر شدت اختیار کرتی تو ندوی صاحب صرف عالم، محقق اور نقاد ہی نہ ہوتے بلکہ فن کار، تخلیقی فن کار بھی ہوتے۔ اس لہر نے انہیں ایک بہت بڑے حلقے میں محبوب کردیا، اور ایک چھوٹے سے حلقے میں صرف «محترم» بنا دیا۔

میں شروع شروع میں اس لہر کی حرکت اور معنویت کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ کلاس میں میرے اور ندوی صاحب کے تعلقات کی بسم اللہ ہی غلط ہوگئی۔ وہ نہ جانے کیوں کر مجھے کمیونسٹ اور ترقی پسند سمجھ بیٹھے اور میں انہیں مرزا نوشہ سے زیادہ اکبر الہ آبادی کا قریبی پڑوسی سمجھنے لگا۔ نتیجہ؟ کلاس میں آئے دن کی بحث۔

«ترقی پسندوں نے اردو ادب میں تخریب برپا کر رکھی ہے۔» وہ کہتے۔

«اس تخریب میں ہی تعمیر چھپی ہے۔» میں کہتا۔

«ترقی پسند ادب علاج الغربا ہے،» وہ کہا کرتے۔

«اس قوت شفا سے دنیا کا کوئی بڑا ادب خالی نہیں۔» میں کہا کرتا۔

اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ جو اصلاحیں اور ترکیبیں میں استعمال کرتا تھا اُن کے صحیح معنی سے بھی واقف نہ تھا۔ لیکن ندوی صاحب بھرے کلاس میں مجھی سے سوال کرتے تھے۔ اس لئے میرے لئے جواب دینا صحیح یا غلط، ضروری ہوگیا تھا۔ میں خاموش رہتا تو وہ کہتے: "بس، ادیب شہیر چپ ہوگئے۔ ادیب شہیر وہ مجھے آخر آخر تک کہتے رہے، جب کہ آج تک نہ میں ادیب ہوں اور نہ شہیر یہ مجھے بہت دن بعد معلوم ہوا کہ صرف مجھی سے سوال کرنا ندوی صاحب کا "لطف خاص" تھا جو مجھ پر تھا۔ اور گرمی محفل ندوی صاحب کے حاسۂ مزاح کا محض ایک روپ تھی۔ اسی طرح انہوں نے مجھے اتنی اور ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور کردیا جو میں شاید کبھی نہ پڑھتا۔ اُن سے کسی لفظ کے معنی معلوم کرتا تو وہ کہتے "میں نے تمام الفاظ کے معنی کا ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے۔ لائبریری تشریف لے جائیے اور لغت میں معنی دیکھئے۔" اور پھر وہ دن میں دو تین بار لائبریری کی طرف دوڑاتے اور پوچھتے "کیا معنی ہیں؟ ذرا ہم بھی سنیں۔" پہلی منزل سے نیچے لائبریری تک یہ دوڑ کھل جاتی۔ لیکن اس طرح بہت جلد لغت دیکھنا آگیا اور معلوم ہوا کہ لغات کی بھی ایک الگ دنیا ہے، انسانی دنیا کی طرح شفیق اور سخت، ہری بھری اور بنجر، متکلم اور خاموش۔

ندوی صاحب نہایت وسیع المطالعہ واقع ہوئے تھے۔ متعدد زبانیں جانتے تھے تحقیق ان کا خاص میدان تھا۔ دکنی اردو پر اُنھیں خبر ہی نہیں نظر بھی حاصل تھی۔ تاریخ اور بالخصوص اسلامی تاریخ سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی۔ اہم اور غیر اہم سنین، اُنہیں حیرت انگیز طور پر یاد رہتی تھیں لیکن اشعار پڑھتے وقت وہ اکثر اپنی طرف سے تحریف یا تصریف کردیا کرتے تھے۔ کلاس میں اصل موضوع پر کم، لیکن متعلقہ موضوعات پر اس طرح بولتے تھے کہ بہت سی کتابوں کے مطالعے سے، سننے والوں کو بے نیاز کردیتے تھے۔ اُن کا مقصد یہ تھا ہی نہیں کہ انٹر اور بی۔اے کے طلبہ کو درس دیں۔ وہ ریسرچ کرنے والے طلبہ اور علماء کی رہنمائی کے لئے بنے تھے۔

ندوی صاحب اُن اساتذہ میں سے تھے جن کی ذہانت، قابلیت اور علم و فضل، اُن کی شہرت اور مقبولیت کو پَر لگا کر اپنی درس گاہ سے دور بر صغیر ہند و پاک کے اطراف و جوانب میں لے جاتا رہا ہے۔ لیکن کالج میں اُن کے

گردا گرد عظمت و برگزیدگی کا ہالہ بھی رہا ہے اور اس ہالے کو شک کی نظروں سے دیکھنے والوں کا ایک محدود حلقہ بھی رہا ہے۔ گذشتہ سطور میں ندوی صاحب کی شخصیت کو اسی لئے Controversial کہا گیا ہے۔ خود ندوی صاحب کو اس کا احساس تھا اور وہ کہا کرتے تھے: «کچھ لوگ مجھے اس لئے پسند نہیں کرتے کہ میں سچ بولتا ہوں اور سچ بڑا کڑوا ہوتا ہے۔» لیکن وہ باوجود اپنی ذہانت اور علم و فضل کے ایک انسان تھے۔ اُن تک نہ قیس کی روایت پہنچی تھی اور نہ منصور کی۔ وہ ایک نارمل انسان تھے۔ ہمارے آپ کے زمانے کی بوالعجبیوں اور تضادات سے وہ بھی معرا نہ تھے۔ ندوی صاحب مرگئے مجھے مرنا ہے، میں نے ندوی صاحب کو سچ سے گریز کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے ندوی صاحب کو ایسے موقعوں پر جہاں اُنھیں بولنا چاہئیے تھا، خاموش رہتے دیکھا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ «روشنیٔ طبع» مخاطب کو پریشان اور خفا کر رہی ہے، اور ان کو احساس نہیں۔ اور خدا مجھے معاف کرے، کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوا ہے کہ اُنھیں صورتِ حال کا احساس ہے اور اس میں اُنھیں لطف حاصل ہو رہا ہے۔ پھر طنز و مزاح، تحریر میں ہو یا تقریر میں، یوں بھی بے حد نازک اور پُر خطر کام ہے۔ کالج کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ندوی صاحب کے طنزیات و مضحکات کبھی کبھی زخم کو بے مرہم چھوڑ گئے ہیں۔ زخم خوردوں نے اپنا ایک حلقہ بنالیا۔ اور یوں ندوی صاحب Contrvoersial بن گئے۔ اُن کے چند بے حد ذہین ساتھی، ان کی مقبولیت کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اُن کے متعدد باہوش اور ہونہار شاگرد از خود اُن کے پاس نہ جاتے تھے۔ ہرچند کہ خیالِ خاطرِ احباب کے گُر سے وہ واقف تھے، تاہم ایسے آبگینے تھے اور کئی تھے، جنھیں ٹھیس لگ کر رہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باوجود اپنی ذہانت اور علم و فضل کے، ندوی صاحب ٹھوس علمی اور ادبی کام کرنے والوں کی کوئی ٹیم نہ بناسکے۔

ریٹائرمنٹ کے وقت کالج میں ندوی صاحب کو ایک شاندار اور یادگار الوداعیہ دیا گیا۔ ہال کھچاکھچ بھرا تھا۔ پہلے دوسروں نے تقریریں کیں اور پھر ندوی صاحب نے — مجھے یاد ہے کہ انھوں نے اپنا نہایت سخت، بیدردی کی حد تک، احتساب کیا۔ ان کی آواز میں اعتماد تھا، لہجے میں خلوص کی کھنک۔

"۔ ۔ ۔ ۔ یہ میرا کالج ہے۔ میرا بناؤ اس کا ہے، میرا بگاڑ، میرا ــــ میں نے اپنی زندگی کا بہترین اور طویل وقت یہاں گذارا ہے۔ میں نے یہاں نت نئے خواب دیکھے ہیں۔ خوابوں کی تعبیریں پائی ہیں۔ میری شخصیت کی تکمیل یہاں ہوئی ہے یہاں کی شادابی، تازگی اور روشنی میری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ میں بھلانا بھی چاہوں تو اس درس گاہ کو نہیں بھلا سکتا۔ بندہ بشر ہوں، بہتوں کو خوش کیا ہوگا، بہتوں کو ناخوش۔ میں اپنے ناخوش دوستوں سے درخواست کروں گا کہ وہ میری کمزوریوں کو معذوریوں پر محمول کریں اور درگذر کریں کہ یہ صفاتِ خداوندی میں سے ایک ہے۔"

اور جلسہ ختم ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے تا دیر آنسوؤں سے اپنا رومال تر کرتے رہے۔

کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ کالج کا ذکر ہمیشہ اپنائیت کے گہرے احساس کے ساتھ کرتے رہے۔

وہ بڑے خوش مزاج، زندہ اور توانا انسان تھے۔ اُنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ،خوش باش دمی کہ زندگانی این است، کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اُن کی زندگی بظاہر بڑی پر سکون اور شگفتہ معلوم ہوتی تھی، لیکن جن لوگوں نے اُنھیں قریب سے دیکھا ہے، انھوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اُنکی زندگی میں بڑے بڑے زلزلے اور طوفان آئے ہیں جن کا مقابلہ انھوں نے مردانہ وار کیا ہے۔ شاید اُن کا سب سے بڑا ہتھیار اُن کا سدا بہار مزاح تھا جس میں طنز اور ظرافت کے عناصر بھی شامل تھے۔ ارضی یا سماوی آفات ہوں، اپنوں کی ملامت ہو یا غیروں کی دلآزاری، وہ سب حملوں کو مزاح کی ڈھال پر روک لیتے تھے۔ مسکراہٹ سے آنسو تک کتنا کم فاصلہ ہے، شاید وہ اس سے خوب واقف تھے۔

اُنھوں نے بڑی بھرپور زندگی گذاری۔ انھوں نے زندگی کا احترام بھی کیا اور اُس سے محبت بھی کی! پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے اَن گنت دوستوں اور شاگردوں کے لئے ایک Loveable انسان کی مثال چھوڑ گئے۔

اُن میں ایک سچے عالم کی روح تھی۔ اُن کا علم زندگی اور انسانیت سے کٹا ہوا نہ تھا۔ باوجود مذہبیت کے گہرے احساس کے، وہ کبھی ماورائی نظر نہ آئے۔ اُن کی زبان کبھی کبھار تیز اور کٹیلا جملہ ادا کرسکتی تھی، لیکن اُن کا

قلم ہمیشہ معتدل اور سلامت رَو رہا۔ زبان و ادب تہذیب و معاشرت کے معاملات، و مسائل پر جتنا اور جیسا ان کا مطالعہ اور مشاہدہ تھا، اس کی نسبت سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔ کاش! کالج سے فراغت پاکر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی انہیں «فراغت» مل سکی ہوتی۔ انسٹی ٹیوٹ میں آٹھ، دس سال انہوں نے جوالا مکھی کے دہانے پر گذارے جس کی ایک الگ داستان ہے۔ تاہم انھوں نے جتنا بھی لکھا ہے، پوری ذمّے داری، انہماک بلکہ استغراق کے ساتھ لکھا ہے۔

ذرا سوچئے تو سہی، اتنے وسیع و عریض ملک کے دانشکدوں اور درسگاہوں کی اونچی کرسیوں پر بیٹھنے والے، اردو زبان و ادب کی تحقیق و تنقید سے متعلق کتنے آدمی ہیں جو سیاست کی جوڑ توڑ سے رَو گردان، منصب و منفعت سے بے پروا، نفع و ضرر کی میزان سے بے خبر، خاموشی سے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ ندوی صاحب اس خود دینی اقلیت میں سے ایک تھے۔ پیردانا بھی تھے اور دوستوں کے دوست بھی علم و فضل، نکتہ دانی اور نکتہ سنجی، زندہ دلی اور ثاقی کا ساتھ بہت کم ہوتا ہے۔ ندوی صاحب نے یہ ساتھ کر دکھایا۔ بظاہر یہ بات معمولی، لیکن بباطن کس قدر غیر معمولی ہے۔

* علی جواد زیدی

نجیب اشرف ندوی ـــ ایک تاثّر

بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی شخصیتیں دور سے بہت دلکش اور جاذب توجہ معلوم ہوتی ہیں لیکن قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد کچھ وہ عالم ہوتا ہے جو سرد و گرم زمانہ دیکھنے کے بعد کچے مکانوں کی باہری دیواروں کا. اس کے برعکس تھوڑی سی ایسی بھی ہستیاں ہیں جن کو جتنا ہی قریب سے دیکھئے اُن کی دلکشی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے. جیسے کسی ماہر مصور کے البم کے اوراق الٹتے جائیے تو ہر صفحے پر رنگ و نور کا نیا عالم نظر آتا ہے اور مصوری کی تہ دار اور پہلو دار شخصیت اور فن کے نئے مظاہر ابھرتے رہتے ہیں. نجیب اشرف ندوی کا تعلق آخری طبقے سے ہے.

نجیب اشرف صاحب مجھ سے بہت بڑے تھے. پندرہ سولہ برس کی بڑائی چھوٹائی تقریباً ایک نسل کا فرق بن جاتی ہے. پھر میں نے اُن کو دیکھا بھی نہیں تھا. ہاں « زمانہ » کانپور « معارف » اعظم گڑھ « الناظر » لکھنؤ « جامعۂ دلی » «نیرنگ خیال » لاہور ، « ہمایوں » لاہور وغیرہ میں اُن کے مضامین دیکھے تھے اور اُن کی ایک کتاب « رقعات عالمگیر » پڑھی تھی. وہ کچھ دنوں « ندوۃ العلماء » اور « معارف» سے وابستہ تھے اور اس وجہ سے مجھے اُن سے ایک بالواسطہ ربط ہوگیا تھا کیونکہ دونوں ہی شبلی نعمانی کی یادگاریں ہیں اور مجھے علامہ شبلی سے ایک خاص فکری اور روحانی علاقہ ہے. اس سے بھی قوی تر تعلق یہ تھا کہ نجیب اشرف ندوی مرحوم بھی جنگ آزادی کے جانبازوں میں تھے ، ہائی اسکول اور بی. اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کرنے کے بعد انھیں اُسی راستے پر جانا چاہئے تھا جس پر « پی سی اس » اور « آئی سی اس » قسم کے افراد جایا کرتے تھے. لیکن وہ ابھی بی. اے کے آخری سال میں تھے کہ ترک موالات کی تحریک زور شور سے اٹھی اور انھوں نے یہ کہہ کر تعلیم ترک کر دی :

---

* جناب علی جواد صاحب زیدی ام، اے، مصنف آپ سے ملئے، ذکر غنی وغیرہ.

درین دریائے بی پایاں درین طوفان موج افزا
سر افگندیــــم ، بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

جب ذرا تحریک مدھم پڑی تو یہ پھر تعلیم کی طرف مائل ہوئے۔ اس ذہنی یگانگت کی وجہ سے ان کی طرف دل کا کھنچنا فطری تھا۔ اور یقیناً میں ان سے بہت پہلے مل چکا ہوتا لیکن آج جو اتنی اطلاعیں میں نے آپ کے سامنے بکھیر دی ہیں یہ سب مجھے ایک ساتھ نہیں ملیں بلکہ قطرہ قطرہ جمع ہوئی ہیں، جیسے جیسے قربتوں کا احساس ہوتا گیا، ان سے ملاقات کی آرزو شدید تر ہوتی گئی۔ لکھنؤ اور بمبئی کا فاصلہ بیچ میں حائل تھا اور سیاست و طالب علمی کی مصروفیتیں راستہ روکے ہوئے تھیں۔ آخر اسی سیاست و طالب علمی کی بدولت میرا بمبئی میں آنا ہوا اور میں پتہ پوچھتا ان تک پہنچ گیا۔

سچ کہتا ہوں کہ پہلی نظر میں یقین نہیں آیا۔ «ندوۃالعلما» اور «دارالمصنفین» کے ماحول سے میں کسی ایسے شخص کا تصور وابستہ ہی نہیں کرسکتا تھا جو بے ریش و بروت بھی ہو اور سوٹ میں ملبوس بھی۔ دل نے کہا کہ «جناب زیدی آپ کسی دوسرے نجیب اشرف ندوی تک تو نہیں پہنچ گئے؟» آزمانے کی خاطر میں نے «رقعات عالمگیر» کا ذکر چھیڑا۔ گفتگو سے اندازہ صحیح نکلا، ظاہر کا تصور غلط تھا۔ حضرت سعدی نے جو تنبیہہ کی تھی کہ ہر گوشے کو خالی نہ سمجھو کہیں وہاں کوئی شیر چھپا نہ بیٹھا ہو۔ مجھے اس وقت رہ رہ کے یاد آرہی تھی۔

پہلی ملاقات میں تھوڑا بہت تکلف ناگزیر ہے۔ اس گفتگو کا آغاز بھی اُسی ابتدائی تکلف سے ہوا۔ لیکن بہت جلد ندوی صاحب نے «تکلف برطرف» والا انداز اختیار کرلیا۔ میں بزرگوں کے معاملے میں جذباتی بھی واقع ہوا ہوں اور روایتی بھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ میں بچپن ہی میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگیا تھا۔ بزرگ کے قریب جاکر میرے دل میں بے پناہ عزت و محبت کا جذبہ ابھر آتا ہے اور میرا انداز خاصا فدویانہ ہوجاتا ہے۔ کسی حد تک یہ کیفیت اب بھی باقی ہے جب کہ خود میرے بال سفید ہوچکے ہیں۔ اور میں بفضلہ کئی بچوں کا باپ ہوں۔ میرے بچے مجھ سے مساویانہ برتاؤ کرتے ہیں کیونکہ میں نے اس کی کوشش کی ہے کہ ان میں خود اعتمادی کا جذبہ ہو۔ وہ سب بھی بزرگوں کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہیں اور عزت کو

فدویت میں تبدیل نہیں ہونے دیتے ۔ یہ ایک نسل کا فرق ہے۔ تمام تفاوتیں کرنے کے باوجود مجھ میں بزرگ پرستی کا جذبہ بہت قوی ہے ۔ ندوی صاحب سے آخر وقت تک میں نے بزرگی اور خوردی کا رشتہ باقی رکھا۔ مگر خود انہوں نے مجھ سے ایک دوست جیسا برتاؤ کیا اور مساوات برتتے رہے ۔

پہلی ملاقات کے وقت میں طالب علمی کی منزل سے باہر نکلنے والا ہی تھا لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اور کبھی کبھی میرا کلام اور مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہو جایا کرتے تھے ۔ لیکن میں کسی بزرگ ادیب سے ، وہ بھی ندوۃالعلما اور دارالمصنفین جیسے اداروں سے وابستہ اور بمبئی جیسے دور اُفتادہ شہر میں مقیم ادیب سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ اُس نے میری کوئی چیز پڑھی ہوگی ندوی صاحب سے یہ معلوم کرکے خوشگوار استعجاب ہوا کہ انہوں نے میری بعض چیزیں پڑھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ میرے کئی ترقی پسند ساتھیوں کے بارے میں جچی تُلی رائے کا اظہار بھی کرسکتے ہیں میرے بارے میں موصوف نے جو کچھ کہا اُسی کا اعادہ خود پرستی پر محمول کیا جائے گا ، لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کرلیا کہ نجیب اشرف صاحب کے ذہن و فکر کے تمام دریچے وا رکھے ہیں کہ تازہ ہوا آتی رہے ، یہ مطالعے میں ہمہ گیری کا حوصلہ رکھتے تھے ۔

اس کے بعد جب بھی بمبئی جانا ہوتا اُن سے ملنا میں اپنا فریضہ جانتا ۔ ہربار میں اس احساس کے ساتھ واپس ہوتا کہ ہماری ملاقات سرسری نہیں ہے بلکہ ہم ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔ رفتہ رفتہ فطرت کی تہیں کھلتی جاتی تھیں۔ کثرت مطالعہ اور ذوق تحقیق کے ساتھ ساتھ اُن کی طبعی شگفتگی کے جوہر مجھ پر نمایاں ہوتے جاتے تھے ۔ اُن کی معصوم مسکراہٹ کی دھیمی روشنی اُن کے کمرے کو ہر وقت جگمگاتی رہتی اور اُن کی مترنم آواز خلوص کے پھول برساتی رہتی ۔ انہیں جب سے یہ پتہ چلا کہ اعظم گڑھ سے مجھے بھی دور کی نسبت ہے ، اُن کی شفقت کچھ اور بڑھ گئی اور ان کے خلوص کی دلکشی کچھ اور نکھر آئی ۔

میں جب خلوص ، بزرگانہ مساوات اور خوش طبعی کی باتیں کرتا ہوں تو مجھے یہ احساس ستاتا رہتا ہے کہ یہ سب گذرے ہوئے دور کے افسانے ہیں اور ایک مٹتے ہوئے نظام زندگی کی کہانیاں ۔ لیکن ان کا نگاہوں کا پیوست ہوجانے

والا حسن اور دلوں میں در آنے والی کیفیت یقیناً افسانۂ ماضی نہیں ہے۔ یہ کیفیت جن نوجوانوں نے محسوس نہیں کی ہے، اُن سے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہائے کمبخت تو نے تو پی ہی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ باقیات الصالحات میں تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ اب صلاح و نیکی کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ لیکن اب ویسی صلاح و نیکی دیکھنے میں نہیں آئے گی جو ان یاران رفتہ میں تھی۔

اب سے دو کوئی برس پہلے میرا تبادلہ ہوا اور میں مستقل قیام کے خیال سے بمبئی پہنچا۔ ظاہر ہے کہ جن چند لوگوں سے اولین فرصت میں ملاقات کرنے کا خیال آیا اُن میں نجیب اشرف ندوی سر فہرست تھے۔ اب ان پر بڑھاپے کے آثار زیادہ نمایاں تھے، یعنی بال زیادہ پک گئے تھے وہ دوڑ بھاگ کی زندگی کے بجائے حلقۂ درس و ذکر کی سی گوشہ نشینی کے قریب آ گئے تھے۔ پھر بھی وہ خاموش بیٹھنے والوں میں نہیں تھے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتے اور کرتے رہتے تھے۔ اُن کے پاس آنے جانے والوں کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ اِن میں اُن کے ہم سن بھی تھے اور خورد بھی اُن کے ہم مشرب بھی تھے اور باغی بھی۔ استاد بھی تھے اور طالب علم بھی۔ باہر سے آنے والے ارباب علم و فضل بھی اور کچھ غرض کے بندے بھی۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ہر ایک کا کام کرنے پر آمادہ رہتے اور ہر ایک یہ سمجھتا کہ ندوی صاحب اُسی کے ہیں۔

ندوی صاحب نے صرف زبانی اظہار پر قناعت نہیں کی۔ ان کے چہرے بشرے بلکہ سارے ماحول اور قول و فعل سے یہ ظاہر تھا کہ وہ اس بندۂ نا چیز کے بمبئی آنے پر واقعتہً بہت خوش ہیں۔ فوراً علمی موضوعات پر گفتگو شروع ہو گئی اور انھوں نے کئی منصوبوں کا ذکر کیا۔ کچھ میرے مشاغل علمی کے بارے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ دلی سے بمبئی آتے وقت مجھے جو بات سب سے گراں گذری تھی وہ مالک رام کی جدائی تھی۔ اُن کے یہاں بھی (انفرادی خصوصیات کے باوجود کچھ ایسی ہی فضا تھی۔ پھر اُن کی وسیع لائبریری ہر وقت آمادۂ امداد رہتی تھی۔ اب بمبئی میں کیا ہوگا؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ لیکن میری مشکل ندوی صاحب نے خود حل کردی۔ فرمانے لگے کہ کتب خانہ حاضر ہے۔ جب اور جو کتاب چاہئے لے جائیے۔ انھوں نے کسی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ میں کتابوں کے بارے میں محتاط ہوں۔ چاہے اپنی کتابیں غائب ہو جائیں (اور ہو بھی گئیں)

لیکن دوسروں کی کتابیں بہت سنبھال کر رکھتا ہوں کیونکہ میں کتاب غائب ہوجانے کے کرب کو سمجھتا ہوں۔ بہر حال، ندوی صاحب کی مجھ پر کرم فرمائی اس حد تک بڑھی کہ انھوں نے بعض کتابیں اپنے نام سے نکلوا کے میرے حوالے کیں رسائل بھی پڑھنے کو ملتے رہے اور میں نے دیکھا کہ وہ جدید ترین رسائل کو پڑھتے ہیں اور حواشی پر جا بجا اپنے نوٹ بھی لکھتے جاتے ہیں۔ ذہنی اور فکری طور سے وہ آخری دم تک بیدار رہے۔

میرا دفتر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے کچھ بہت دور نہیں تھا اکثر کھانے کے وقفے میں یا دفتر کے بعد اُن کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ کبھی کبھی وہ بھی کرم فرمائی کرتے۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اُن کے رفیق کار عبدالرزاق قریشی میرے ہم وطن ہیں اُن کے پاس بھی جا کر بیٹھ جاتا۔ اِن دونوں نے بڑی حد تک مالک رام اور رشید حسن خاں کی عدم موجودگی کی تلافی کر دی۔ ندوی صاحب کبھی کبھی انسٹی ٹیوٹ میں نہیں بھی ملتے تھے۔ لیکن عبدالرزاق قریشی "قطب از جا نمی جنبد" قسم کے آدمی ہیں۔ اپنے گوشۂ تحقیق میں کتابوں سے گھرے بیٹھے رہتے۔ جب ندوی صاحب نہ ہوتے تو میں قریشی کا وقتِ عزیز ضائع کرتا۔ وہ بھی خلوص و عنایت کا مجسمہ ہیں، لیکن اُن کی بہت سی خصوصیتیں ایسی بھی ہیں جو ندوی صاحب میں اور اُن میں خطِ فاصل قائم کرتی ہیں۔

ندوی صاحب زودِ حس بھی تھے۔ میں نے کبھی کبھی اُن کی زندہ دلی کو ایک ہلکی سی چادر کے نیچے ڈھنکتے بھی دیکھا۔ دوستوں اور عزیزوں کی بے راہ روی کا اثر لیتے تھے مگر ظاہر نہ ہونے دیتے تھے۔

ندوی صاحب کی زندگی دین و دنیا کا حسین سنگم تھی۔ وہ زاہد خشک تو قطعاً نہیں تھے۔ ندوۃالعلما اور دارالمصنفین کا معنوی اثر اُن پر ضرور تھا لیکن ظاہری طور سے وہ ان دونوں اداروں سے الگ معلوم ہوتے تھے۔ طبیعت میں ایک طرح کی آزاد خیالی تھی۔ سیاسی اور علمی موضوعات پر مجھ سے اکثر گفتگو ہوتی بعض اوقات یہ گفتگو مذہبی حدود میں بھی داخل ہو گئی اور مجھے یہ جان کر بیحد مسرت ہوئی کہ وہ مذہبی معاملات میں بالکل ہی تنگ نظر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ایک فلسفیانہ لچک تھی جو اُن کے علمی وقار میں اضافہ کرتی تھی۔

ایک بار انھوں نے مجھے اپنے ادارے کے ایک جلسے میں تقریر کی دعوت دی تھی ۔ تقریر کا موضوع تھا « تاریخ ادب اردو کی تدوین » وہ تقریر کو بڑے انہماک سے سنتے رہے اور میرے بارے میں جو تعارفی جملے اس موقع پر ارشاد کئے اُس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُن میں نئے خیالات کو اپنانے کی بڑی صلاحیت تھی ۔ اکثر محققین کے یہاں « ہمچو من دیگرے نیست » جذبے کی کارفرمائی نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ نجیب اشرف ندوی ان لوگوں میں نہیں تھے۔ وہ دل کھول کر دوسروں کے خدمات کا اعتراف کرتے تھے بلکہ بعض اوقات دل بڑھانے کے لئے بھی بہت سی باتیں کردیا کرتے تھے۔ دو ایک بار انجمن اسلام ہائی اسکول کے دوسرے جلسوں میں مجھے بھی شرکت کرنے کا اتفاق ہوا ۔ تقریر بھی کرنا پڑی ۔ ہر تقریر کے بعد « تحسین سخن شناس » سے نوازا گیا ۔ ان جلسوں میں تقریر سن کر ندوی صاحب کی خطابت کا بھی قائل ہونا پڑا ۔

« نوائے ادب » کا پودا تو انہیں کا لگایا ہوا تھا ۔ اگر انہیں اس سے خاص لگاؤ تھا تو اس میں جائے تعجب کیا ہے۔ میں جب جاتا اس کے لئے مضمون لکھنے کی فرمایش ضرور کرتے ۔ کاش میرے پاس اتنی فرصت ہوتی کہ میں اُن کے ہر حکم کی تکمیل کرسکتا ! پھر بھی میں نے انہیں کے ارشاد پر بعض تبصرے لکھے۔ کوئی تفصیلی مضمون نہ لکھ سکا اور چشم زدن میں صحبت یار آخر بھی ہوگئی ۔

ندوی صاحب کو اردو سے عشق تھا ۔ لیکن وہ دوسری زبانوں سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ جب میں نے بمبئی کے مراٹھی ، سندھی، گجراتی، ہندی اور اردو وغیرہ کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک مشترکہ انجمن « وچار بھارتی » کی بنیاد ڈالی تو وہ بھی اس میں بڑے ذوق اور انہماک سے شریک ہوئے ۔ اس کا ایک جلسہ بھی انہوں نے اپنے ادارے میں کرایا ۔ وہ تقریباً ہر جلسے میں جاتے اور مذاکروں میں شریک ہوتے ۔

مرحوم کی ذات بمبئی میں کئی حلقوں کے لئے مرکز توجہ تھی ۔ لیکن ہم جیسے کم آمیز نو واردان بمبئی کے لئے تو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی ۔ اگرچہ شاعر کے بقول « ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی » لیکن میرے لئے بمبئی کبھی پہلا سا بمبئی نہ ہو پائے گا ۔ ندوی صاحب کے بغیر میں جب بھی بمبئی کا تصور کرتا ہوں تو ع جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں

* عبدالرزاق قریشی

استاد مرحوم

جنوری ۱۹۳۲ء کی ایک دوپہر کو اسماعیل کالج (بمبئی) کا پہلا مشاعرہ تھا. کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن (مرحوم) کی مقناطیسی شخصیت نے شہر کے تقریباً تمام شعرا اور اکثر ارباب علم کو کھینچ بلایا تھا ۔ میں بھی ایک سامع کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا ۔ جون ۱۹۳۱ء میں پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی کا اس کالج میں تقرر ہوچکا تھا اور میں ان سے ملنے کا مشتاق تھا ۔ وقفہ ہوا تو اتفاق سے وہ دو چار دوستوں کے ساتھ وہیں آ کھڑے ہوئے جہاں میں کھڑا تھا ۔ میں نے انھیں سلام کیا اور ان سے اپنا تعارف کرایا تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد انھوں نے مجھے اپنے گھر کا پتا دیا اور کہا کہ اگلے اتوار کو مجھ سے گھر پر آ کر ملئیے۔ یہ میری ندوی صاحب سے پہلے ملاقات تھی جس کا سلسلہ تقریباً سینتیس سال بعد ۵ ستمبر ۱۹۶۸ء کو موت کے سنگین ہاتھوں سے ٹوٹا ۔

ندوی صاحب کا آبائی وطن پٹنا ضلع کا ایک مردم خیز گاسو دسنا تھا ۔ ان کے والد ڈاکٹر سید محمد مبین حکومت ہند کی طبی ملازمت میں تھے اور ان کا تبادلہ وقتاً فوقتاً ایک جگہ سے دوسری جگہ ہوا کرتا تھا ۔ اس لئے « نجیب » نے ارموری (ضلع چاندا) کی سرزمین پر آنکھیں کھولیں۔ چاندا اس وقت مدھیہ پردیس میں تھا ۔ لیکن ہندوستان کے صوبوں کی نئی تنظیم ہوئی تو وہ مہاراشٹر میں آ گیا ۔ ان کی پیدایش یکم نومبر ۱۹۰۰ء کو ہوئی ۔

ان کی ابتدائی تعلیم ارموری اور گونڈیا (ضلع بھنڈارا) میں مرہٹی زبان میں ہوئی اور خود ان کے بیان کے مطابق انھوں نے مرہٹی کا فائنل امتحان پاس کیا۔ شاید اسی لئے انھیں مرہٹی بولنے کا بڑا شوق تھا ، حالانکہ مشق نہ ہونے کی وجہ سے وہ بول نہیں پاتے تھے ۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم انھوں نے گھر پر پائی ۔

* عبد الرزاق قریشی ، ریسرچ اسسٹنٹ ، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، بمبئی

تقریباً بارہ سال کی عمر میں ان کے چچازاد بھائی (مولانا) سید سلیمان ندوی کے مشورے سے ان کے والد نے انہیں دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) میں عربی کی تحصیل کے لئے بھیجا۔ لیکن کچھ عرصے بعد (۱۹۱۳ء میں) دار العلوم میں طلبہ کی ہڑتال ہوگئی اور ان کے والد نے انہیں واپس بلا لیا اگرچہ انہوں نے ندوۃالعلماء میں زیادہ دنوں تعلیم نہیں پائی، لیکن ندوی ان کے نام کا ایک لازمی جزو بن گیا، اور بمبئی میں تو وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ لکھنؤ سے واپس بلا کر ان کے والد نے انھیں پٹنے میں ایک انگریزی اسکول میں داخل کرادیا۔ ۱۹۱۷ء میں پٹنا یونیورسٹی سے میٹرکولیشن کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور انہیں وظیفہ ملا۔ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے اسی یونیورسٹی سے انٹرمیجیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اس بار بھی وظیفہ کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ سینیر بی، اے میں تھے، ان کی تعلیم کا سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہوگیا۔ یہ وہ سال ہے جس میں ہندوستان میں پہلے تحریک خلافت اور پھر تحریک ترک موالات شروع ہوئی اور سارے ملک میں ایک طوفان سا آ گیا۔ حکومت کے خطابات واپس کئے جانے لگے۔ سرکاری ملازمتیں ترک ہونے لگیں عدالتوں، کونسلوں اور انگریزی درسگاہوں کا بائیکاٹ ہونے لگا۔ نوجوان نجیب اشرف نے بھی تعلیم ترک کردی اور ان تحریکوں میں حصہ لینے لگے۔ اب ان کے جسم پر انگریزی سوٹ کے بدلے کھدر کا کرتا اور کھدر کا پاجامہ تھا اور بغل میں خلافت کا جھولا۔ اس زمانے میں ان کے چہرے پر داڑھی تھی اور وہ مولانا نجیب اشرف ندوی کے نام سے پکارے جاتے تھے[1]۔ دو، تین سال بعد جب یہ تحریکیں سرد پڑ گئیں تو پھر ان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ چونکہ پٹنا کالج کے پرنسپل نے ان کے دوبارہ داخلے کے لئے تحریری معافی نامہ

---

۱ تحریک خلافت کے زمانے میں لفظ مولانا کا استعمال کثرت سے ہونے لگا تھا۔ اس سلسلے میں مرحوم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ایک دن (مولانا) آزاد سبحانی نے (مولانا) سید سلیمان ندوی سے کہا کہ سید صاحب، اب تو ہر شخص کے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ تو پھر مولانا اور غیر مولانا میں امتیاز کیسے ہوگا؟ سید صاحب نے مسکرا کر فرمایا، ہم لوگوں کے نام کے ساتھ مولانا کا لفظ استعمال نہ کیا جائے۔

تحریک خلافت کے زمانے کا حال تو مجھے نہیں معلوم، لیکن جب سے میں ندوی صاحب سے واقف ہوا میں جانتا ہوں کہ وہ مولانا یا مولوی کا لفظ اپنے لئے پسند نہیں کرتے تھے بعض اوقات وہ اس کے استعمال پر خفگی کا اظہار کرتے تھے

کی شرط لگائی اس لئے انہوں نے کلکتے کے ایک کالج میں داخلہ لیا۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں کلکتا یونیورسٹی سے بی، اے کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور ام، اے کی تعلیم کے لئے وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے ام، اے (فارسی) کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور سونے کا تمغہ اور دو سو روپے قیمت کی کتابیں حاصل کیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ۱۹۲۰ء میں انہوں نے تعلیم ترک کردی اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد ۱۹۲۱ء ان کے علمی و ادبی ذوق اور صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے چچا زاد بھائی مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالمصنفین بلا لیا اور اس کا رفیق بنادیا، ابتدائی تربیت ختم ہونے اور ان کے بی، اے پاس کرلینے کے بعد (۱۹۲۴ء) ان کے تاریخی مذاق اور اعلا فارسی دانی کے پیش نظر انہیں رقعات عالمگیر کی تربیت پر مامور کیا گیا۔ یہ کام پہلے مجلس نے اپنے ایک رفیق مولوی ابوالحسنات ندوی کے سپرد کیا تھا۔ لیکن ایک طویل بیماری کے بعد عین جوانی میں ان کا انتقال ہوگیا اور کام کا سلسلہ رک گیا۔ ندوی صاحب نے تقریباً چار سال کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد رقعات کی پہلی جلد مرتب کی، اور اس پر ایک مقدمہ لکھا۔ یہ جلد اورنگ زیب کے عہد شاہزادگی کے خطوط پر مشتمل ہے۔ اس تاریخی کام میں انہوں نے ملک کے مشہور مؤرخ اور عالمگیریات کے ماہر جدو ناتھ سرکار کی رہ نمائی اور کتب خانہ سے کافی استفادہ کیا۔ رقعات کی روشنی میں انہوں نے جو مقدمہ لکھا وہ بجائے خود ایک کتاب بن گیا۔ اگر چہ اس میں تحقیق کے ساتھ ساتھ جذبات کی بھی کارفرمائی ہے اور ہیروپرستی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے، پھر بھی یہ عالمگیریات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ کتاب کا ابتدائی حصہ جو فن انشا سے متعلق ہے، خصوصاً قابل قدر ہے۔ اس میں اسلام میں فن انشا اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشا کا حال، انشا کے اصول، خطوط مراسلات کے اقسام، کاتب کے اوصاف وغیرہ عمدگی سے بتائے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ دارالمصنفین کو چھوڑنے اور گورنمنٹ ملازمت اختیار کر لینے کے بعد وہ اپنی تدریسی زندگی اور دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کو پورا نہ کرسکے، ورنہ فارسی ادب اور ہندوستان کے تاریخی سرمائے میں ایک مفید اور اہم اضافہ ہوتا۔

وہ تقریباً دس سال دار المصنفین کے رفیق کار رہے۔ اس مدت میں مذکورہ بالا کتابوں کی تصنیف و ترتیب کے علاوہ انہوں نے اپنے فرصت کے اوقات میں مندرجۂ ذیل کتابوں کا ترجمہ کیا۔

۱۔ History of Arabic Literature (تاریخ ادب عربی) مصنفہ Clement Huart

ترجمے کے علاوہ انہوں نے اس پر تنقیدی حاشئے لکھے، غلط بیانات کی تصحیح کی اور اقتباسات اصل مآخذ سے دئیے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔

۲۔ Political System of British India (برطانوی ہند کا نظام سیاسی) مصنفہ E, A Horne یہ کتاب جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد) کے بی، اے کے نصاب میں داخل تھی۔

۳۔ Home Rule (سوراج) مصنفہ گاندھی جی

۴۔ A Guide to Health (رہنمائے صحت) " "

مندرجہ بالا تراجم و تصنیفات کے علاوہ انہوں نے بڑی تعداد میں تاریخی و ادبی مضامین بھی لکھے جو معارف اور بعض دوسرے مقتدر رسالوں میں شائع ہوئے۔

دار المصنفین کے قیام کے زمانے میں انہوں نے ادھوری تعلیم پوری کرلی تھی، اس لئے تعلیمی محکمہ میں انہیں ملازمت ملنے میں دقت نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں ان کا تقرر گورنمنٹ کالج، احمد آباد میں فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوگیا۔ اس ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں مرحوم کے حقیقی بھانجے سید شہاب الدین دسنوی نے عرصہ ہوا مجھے ایک لطیفہ سنایا تھا۔ ندوی صاحب نے انٹرویو کے لئے اس زمانے کے تقاضے کے مطابق بڑا اہتمام کیا۔ لیکن جب وہ پرنسپل کے دفتر میں پہنچے تو انگریز ڈائرکٹر آف انسٹرکشن نے ان سے بڑی شفقت و محبت سے ان کی اور ان کے والد کی خیریت پوچھی اور انہیں رخصت کر دیا۔ چند دنوں بعد انہیں تقرری کا خط بھی مل گیا۔ بات یہ تھی کہ یہ ڈائرکٹر صوبۂ بمبئی میں آنے سے پہلے سی، پی (مدھیہ پردیس) میں ڈائرکٹر آف انسٹرکشن رہ چکا تھا اور ندوی صاحب کے والد سے اس کے اچھے مراسم تھے۔

وہ احمدآباد میں صرف ایک سال رہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسماعیل کالج (موجودہ اسماعیل یوسف کالج) میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے آگئے اور آگے چل کر پروفسر ہوئے۔ وہ اگرچہ فارسی میں ام، اے تھے لیکن اردو کے پروفسر مقرر ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک اردو کسی یونیورسٹی میں ام. اے میں ایک امتیازی مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھائی جاتی تھی ان کی تصانیف کی بنیاد پر بمبئی یونیورسٹی نے انہیں اردو میں پی اچ، ڈی کرنے والے طلبہ کا رہ نما مقرر کیا۔ ۱۹۴۷ء میں مذکورہ بالا کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن کے انتقال کے بعد وہ فارسی ادب میں پی اچ، ڈی کرنے والے طلبہ کے لئے بھی رہ نما مقرر ہوئے۔ چنانچہ تین طالب علموں نے فارسی میں اور چار نے اردو میں ان کی نگرانی میں مقالے تیار کیے اور انہیں پی اچ، ڈی کی ڈگری ملی۔

بمبئی میں قیام کے بعد ندوی صاحب کی علمی و ادبی زندگی تقریباً ختم ہوگئی۔ ابتدائی چار برسوں میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن کے ایما پر انہوں نے تعلیمی سال کے خاتمے پر یونیورسٹی ہال میں چند پبلک لکچر دئیے یا مقالے پڑھے۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی نے متعدد بار انہیں رقعات عالمگیر کی دوسری جلدوں کی ترتیب کی طرف توجہ دلائی۔ ایک مرتبہ انہوں نے یہاں تک لکھا کہ بمبئی پہنچ کر تمہاری علمی موت ہو گئی، بہتر یہ ہے کہ جو مواد تم یہاں سے لے گئے ہو اسے لوٹا دو تاکہ یہ کام کسی اور کے ذمہ کر دیا جائے۔ مرحوم وعدہ کرتے رہے، لیکن افسوس کہ وہ وعدے زبان قلم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے مقامی احباب بھی کبھی کبھی انہیں اس کام کی طرف توجہ دلاتے اور وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بس اب میں شروع کرنے والا ہی ہوں۔ مگر نہ انہوں نے شروع کیا اور نہ وہ انجام پا سکا۔

کالج میں پڑھانے کے علاوہ ان کا زیادہ وقت مختلف کمیٹیوں اور یونیورسٹیوں کے جلسوں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ بمبئی یونیورسٹی میں بیک وقت مندرجۂ ذیل کمیٹیوں کے ممبر تھے:

مجلس سنا (سینٹ)، مجلس تعلیمی (اکیڈمک کاؤنسل)، شعبۂ فنون (فیکلٹی آف آرٹس)، اردو بورڈ (اس کے وہ چیرمین بھی تھے)، یونیورسٹی لائبریری کمیٹی یونیورسٹی ٹیچرز بورڈ۔

بمبئی یونیورسٹی کی ان مختلف کمیٹیوں کی ممبر ہونے کے علاوہ وہ حکومت بمبئی کی مقرر کردہ ٹکسٹ بُکس کمیٹی اور اردو ، سندھی اور پنجابی کے مشترکہ بورڈ کے ممبر بھی تھے۔

وہ مندرجۂ ذیل کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے :

جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد) ، پونا ۔ بڑودا ، پٹنا ، میسور اور مرہٹواڑا یونیورسٹی کے عربی ، فارسی اور اردو بورڈ ، اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن (بمبئی) ، آل انڈیا ہندستانی کمیٹی ، دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی جنرل کمیٹی، انجمن اسلام (بمبئی) کی جنرل کاونسل ، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کمیٹی ، گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر (بمبئی) ۔

ان کمیٹیوں کی ممبری کے علاوہ ان میں ایک اور بڑی کمزوری تھی جو ان کے تصنیفی کاموں میں حائل ہوئی ۔ تنہائی انہیں بہت کھلتی تھی ۔ چھٹی کے دن جب وہ مکان پر ہوتے تو ہر وقت دو چار شاگرد یا نیاز مند ضرور ان کے گرد بیٹھے ہوتے ۔ ان صحبتوں میں علمی و ادبی باتیں کم ، بہت کم ہوتیں ۔ ادھر ادھر کی باتیں زیادہ ہوتیں۔

بیرونی کمیٹیوں اور بورڈوں کی مجلسوں میں شرکت کے لئے وہ بڑے شوق سے سفر کیا کرتے تھے ۔ وہ مختلف یونی ورسٹیوں میں بی ، اے یا ام ، اے کے امتحانات یا پی ، اچ ، ڈی کے مقالوں کے لئے ممتحن مقرر ہوا کرتے تھے اور اس تعلق سے بھی اکثر سفر کیا کرتے تھے ۔ اگر واقعی کبھی کوئی مجبوری ہوئی تو معذرت نامہ بھیج دیتے ورنہ ضرور میٹنگ میں شرکت کرتے کانفرنسوں میں بھی وہ اکثر شریک ہوتے تھے ، حالانکہ مقالے انہوں نے بہت کم پڑھے ۔ سفر کرنا اور لوگوں سے ملنا ملانا ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا ۔ ٹرین میں ڈائننگ کار میں جاکر کھانا کھانا انہیں بہت مرغوب تھا ۔ لیکن انتقال سے تقریباً دو سال پہلے ضعف کی وجہ سے انہوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا ۔

فروری ۹۴۷ء میں انجمن اسلام کے اس وقت کے اعزازی سکریٹری سیف طیب جی مرحوم کی کوششوں اور حکومت بمبئی کی مالی امداد سے ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اردو میں تحقیق کو فروغ دینا

تھا۔ اس کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے ہوا۔ چونکہ ندوی صاحب حکومت بمبئی کی ملازمت میں تھے اس لئے ڈائرکٹر آف انسٹرکشن سے اجازت حاصل کرکے انہیں اس کا اعزازی ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ نومبر ۱۹۵۵ع میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پورے وقت کے ائیے اس کے ڈائرکٹر ہو گئے اور آخری دم تک اس سے وابستہ رہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی تحقیقی رسالہ نوائے ادب جو اس وقت کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کی کوششوں سے جاری ہوا تھا اور جسے ابتدا میں کچھ دنوں انہوں نے مرتب کیا تھا، آخر وقت تک ندوی صاحب ہی مرتب کرتے رہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انہوں نے ایک مجہول الاسم مخطوطہ جس کا نام انہوں نے لغات گجری، رکھا، مرتب کیا اور اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ اگر چہ یہ نصاب نامہ کے انداز کی چیز ہے لیکن ندوی صاحب اسے اردو کا پہلا لغت قرار دیتے ہیں۔ ارباب علم و تحقیق نے اس کتاب کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

انسٹی ٹیوٹ کا الحاق بمبئی یونی ور سٹی سے اس غرض سے کرلیا گیا کہ اس کے تحت اردو میں ام، اے کے لکچر ہوں گے اور پی اچ، ڈی کرنے والے طلبہ کی نگرانی ہو گی۔ چنانچہ مرحوم آخر وقت تک ام، اے کے لکچر لیتے رہے۔ ان کی نگرانی میں پی اچ، ڈی کے لئے مقالہ تیار کرنے کی غرض سے مختلف اوقات میں کئی طلبہ و طالبات نے اپنے نام رجسٹر کرائے۔ لیکن ان میں سے صرف ایک طالب علم اپنا مقالہ مکمل کرسکا اور اسے بمبئی یونی ورسٹی سے پی اچ، ڈی کی ڈگری ملی۔

ندوی صاحب کا مطالعہ جو وسیع بھی تھا اور متنوع بھی، آخر وقت تک جاری رہا۔ وہ علمی و ادبی کتابوں سے لے کر جاسوسی ناول تک پڑھتے تھے۔ جاسوسی ناول وہ اپنے پریشان دماغ کو سکون پہنچانے یا غم غلط کرنے کی خاطر پڑھا کرتے تھے۔ وہ رات کو دیر سے سونے کے عادی تھے۔ کھانا کھانے کے بعد پلنگ پر لیٹ جاتے۔ کتاب ہاتھ میں ہوتی اور حقے کی نے منہ میں۔ حقے کے کش لگاتے جاتے اور کتاب پڑھتے جاتے۔ اگر کوئی علمی، خصوصاً تحقیقی کتاب ہوتی تو قلم ہاتھ میں ضرور ہوتا۔ لیکن ان کے نوٹ بہت مختصر ہوتے تھے۔ وہ

حقیقت میں خود ان کے لئے اشارے ہوتے تھے۔ دوسرے ان سے کم فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

ان کی ذہانت اور نکتہ رسی کا یہ حال تھا کہ سخن نگفتہ باشی بسخن رسیدہ باشد۔ ان پر شعر کا جادو نہیں چلتا تھا۔ مگر شعر کی خوبیوں اور خامیوں کی اچھی پرکھ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ شعر صحیح اور روانی کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس میں ان کی ایک فطری کمزوری، لکنت، کو بھی دخل تھا۔ وہ ایک اچھے انشاپرداز تھے۔ ان کی کتاب مقدمۂ رقعات عالمگیر جہاں تاریخی حیثیت سے اہم ہے وہیں حسن انشا کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔ انشاپردازی میں وہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی طرز تحریر سے متأثر تھے۔ لیکن آخری دور میں ان کی عبارت میں وہ حسن اور زور نہیں رہ گیا تھا۔

مرحوم شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ بعض اوقات ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ وہ اپنے مزاح میں ضرب الامثال کا استعمال بھی بڑی برجستگی سے کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ رعایت لفظی اور ضلع جگت کا استعمال ضرورت سے زیادہ کرتے تھے جو مذاق سلیم پر گراں گذرتا تھا۔ اسی طرح بعض اوقات وہ ظرف قدح خوار کو دیکھے بغیر بادہ دیتے تھے جو کبھی کبھی غلط فہی بلکہ ان کی طرف سے سوء ظن کا باعث ہوجاتا تھا اور انہیں اس پر افسوس کرنا پڑتا تھا۔ ان کا مزاح طنزیات و مضحکات سے بھی خالی نہیں ہوتا تھا، اور ان کی اس کمزوری نے انہیں نقصان بھی پہنچایا۔ نیچے میں ان کے دو چار لطیفے لکھتا ہوں:

ایک دن ندوی صاحب پٹنے میں اپنے ایک دوست بیرسٹر سید عبد العزیز (مرحوم) سے ملنے ان کے مکان پر گئے۔ بیرسٹر صاحب کے ایک عزیز جو غالباً کالج میں تعلیم پا رہے تھے، برآمدہ میں بیٹھے تھے۔ ندوی صاحب نے ان سے کہا کہ عبد العزیز صاحب کو میرے آنے کی اطلاع دیجئے۔ انہوں نے نہایت تمکنت سے جواب دیا کہ اس وقت کوئی آدمی نہیں ہے۔ ندوی صاحب نے برجستہ فرمایا، تھوڑی دیر کے لئے آپ ہی آدمی بن جائیے۔

اسماعیل کالج کا پہلا مشاعرہ تھا۔ جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں کالج کے پرنسپل (مرحوم) ڈاکٹر بذل الرحمٰن کی مقناطیسی شخصیت نے شہر کے تقریباً تمام شعرا کو کھینچ بلایا تھا۔ صدارت خود ڈاکٹر صاحب فرما رہے تھے۔ پہلا دور کالج کے طالب علم شعرا کا تھا۔ جب وہ اپنا کلام سنا چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب مشاعرہ کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ مجھے ایک ضروری کام سے بمبئی جانا ہے مشاعرہ کی صدارت نجیب اشرف صاحب ندوی کریں گے۔ مشاعرہ تقریباً دو بجے شروع ہوا تھا۔ مغرب کا وقت ہوا تو چار شاعر باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کے کہنے سے مشاعرہ تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کردیا گیا۔ جب دوبارہ مجلس بیٹھی تو پہلے نکہت شاہ جہاں پوری نے اپنا کلام سنایا۔ ان کے بعد ایک ایرانی شاعر طلعت نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ پھر مولانا نذیر احمد خجندی میرٹھی کی باری آئی۔ ان کی غزل میں مطلـــع کئی تھے۔ سب سے آخر میں محمد اسرائیل سنبھلی اسٹیج پر آئے۔ وہ بمبئی میں نو وارد تھے۔ اس لئے کسی نے ندوی صاحب سے کہا کہ ان کا حاضرین سے تعارف کرا دیجئے۔ ندوی صاحب نے تعارف کا آغاز اس طرح کیا۔ حضرات، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہماری مجلس مشاعرہ نماز کے لئے برخواست ہوئی تھی۔ یقیناً نمازیوں نے مشاعرہ کی مزید کامیابی کے لئے بھی دعـا کی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مشام جاں گلستان شاعری کی نکہت عطر بیز سے معطر ہوئے۔ آپ نے عروس سخن کی طلعت زیبا کو دیکھا۔ شایـد اسی لئے مولانا خجندی کو مطلع ہی مطلع نظر آ رہا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے سوا اور کیا دعا کی جائے کہ الٰہی عاقبت محمود گردان۔

ایک بار وہ اور بڑی صاحبزادی پٹنے جا رہی تھیں۔ چھوٹی صاحبزادی کسی وجہ سے نہیں جا سکتی تھیں۔ جب ٹرین کے چھوٹنے کا وقت قریب آیا تو دونـوں بہنیں گلے مل کر رونے لگیں۔ پہنچانے والوں میں سے کسی نے مزاحاً کہا کہ ابھی رونے کا وقت دور ہے۔ ندوی صاحب نے کہا اسی کی ریہرسل ہو رہی ہے۔

ایک دوست کی شادی ہوئی۔ دوسرے دن دعوت ولیمہ تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب ندوی صاحب چلنے لگے تو مجھ سے کہا کہ تم میرے ساتھ اسٹیشن تک چلو۔ پھر واپس آجانا۔ مئی کا مہینہ تھا اور دوپہر کا وقت۔ ایک کرسی پر میرے چند دوستوں کے ہیٹ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک ہیٹ

اٹھا لیا۔ ایک دوست نے مذاقاً کہا، ہیں، یہ کیا کر رہے ہو؟ ندوی صاحب نے فوراً حالی کا ایک مصرع تھوڑے سے تصرف کے ساتھ پڑھ دیا: اپنے بیٹوں سے رہیں سارے براتی ہشیار۔ مولوی فتح محمد بھی جو پرانی وضع قطع کے آدمی تھے، وہاں موجود تھے۔ حالانکہ وہ بھی جملے چست کرنے میں ماہر تھے، لیکن اس وقت ان سے چوک ہوگئی۔ انھوں نے دوسرا مصرع (ایک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت) پڑھ دیا۔ ندوی صاحب نے کہا، مولوی صاحب، وہ مصرع تو میں نے آپ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔

مرحوم چائے بلا دودھ کی پیتے تھے اور دوست و احباب کو بھی عموماً ویسی ہی پلاتے تھے۔ ایک دن ایک بے تکلف دوست نے ان سے کہا کہ ہم لوگوں کے لئے دودھ منگوا لیا کیجئے۔ انھوں نے کہا، آنچہ برخود نمی پسندی بر دیگران نیز مپسند۔

استاد فقید لباس کے معاملے میں شوقین تھے۔ انھوں نے زیادہ تر سوٹ استعمال کیا۔ لیکن شیروانی، اچکن اور چست پاجامہ بھی وہ بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر اور ادبی جلسوں میں اکثر و بیشتر یہی لباس پہن کر جاتے تھے۔ اچکن اور چست پاجامے پر وہ لکھنؤ کی نفیس کامدار دو پلیا ٹوپی لگاتے تھے۔ اس لباس میں ہوتے تو سلام بھی لکھنؤ کے مخصوص انداز میں کرتے۔ آخری دنوں میں وہ صرف بش شرٹ اور پتلون پہنتے تھے۔ بش شرٹ نے بہت سے مراحل طے کئے ہیں۔ انھوں نے ہر تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ ایک بار وہ ایسی بش شرٹ پہن کر انسٹی ٹیوٹ آئے جو انھیں کسی طرح زیب نہیں دیتی تھی۔ میں نے ان سے مزاحاً کہا، ارے، آج آپ بھول کر شاہد (ان کا چھوٹا لڑکا) کی بش شرٹ پہن کر چلے آئے۔ وہ مسکرا دئیے۔ پھر کبھی انھوں نے وہ بش شرٹ نہیں پہنی۔ گھر پر وہ ململ کا کرتا اور پاجامہ پہنتے تھے۔

ندوی صاحب کی صحت عموماً اچھی رہی۔ البتہ ان کے بال جوانی ہی میں نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے تھے لیکن آخری چند برسوں میں بعض عوارض کی وجہ سے وہ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کی شگفتگی مزاج میں بھی کمی آگئی تھی۔ انتقال سے کچھ دنوں پہلے انھیں چند انجکشن

لگائے گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ انجکشن لگانے کی جگہ پر پھوڑا ہو گیا اور اس میں مواد آ گیا اور آپریشن کی ضرورت پڑی۔ آپریشن معمولی تھا۔ لیکن ان کی صاحبزادی نے احتیاطاً اس کا انتظام ایک نرسنگ ہوم میں کیا۔ آپریشن ہوا اور وہ اس سے صحت بھی پا چکے تھے اور دن، دو دن بعد گھر جانے والے تھے۔ مگر وقت موعود آ چکا تھا ۵ ستمبر ۱۹۶۸ع کو جمعرات کے دن تقریباً بارہ بجے انھیں انیما دیا گیا۔ اسی حالت میں اچانک قلب پر شدید قسم کا حملہ ہوا۔ اور چند منٹ کی تڑپ کے بعد روح جسم سے پرواز کر گئی۔ انا الیہ و انا اللہ راجعون۔

اللہ مرحوم کی لغزشوں اور خطاؤں سے در گذر فرمائے اور انھیں اپنی رحمت سے نوازے۔

* خورشید نعمانی

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

انجمن اسلام بمبئی کا ایک قدیم و وقیع ادارہ ہے اور اسے اپنی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس ادارے کی بنیاد ١٨٧٥ع میں ملک کے مشہور مسلم قوم پرست رہنما بدرالدین طیب جی کے ہاتھوں پڑی، اس پُرآشوب دور میں ایک ایسے ادارے کا قائم کرنا بڑی جرات کا کام تھا اس کا مقصد مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا اور ان میں سیاسی شعور پیدا کرنا تھا۔ ١٨٧٥ع سے اس وقت تک یہ ادارہ مسلمانوں کی اہم خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ یہ شروع ہی سے ترقی پسند رجحانات کا حامل رہا ہے اس نے ہمیشہ وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اس کے تحت جہاں لڑکے اور لڑکیوں کے عام قسم کے ہائی اسکول ہیں وہیں ایک اسکول آف کامرس کالج آف کامرس اینڈ ایکنامکس، ٹکنیکل ہائی اسکول، پالی ٹکنیک وغیرہ بھی ہیں۔

بمبئی جیسے بڑے شہر میں اردو کے متعلق کوئی ایسا ادارہ نہ تھا جہاں تحقیق کا کام کرنے والوں کی تربیت کی جا سکے اور محققین کو اپنے تحقیقی کاموں میں سہولتیں مل سکیں اس امر کی طرف بھی انجمن اسلام بمبئی کے ارباب حل و عقد نے توجہ دی، ١٩٣٥ع کے ایکٹ کے تحت جب ہندوستان میں عوامی وزارتیں بنیں تو بمبئی کی کھیر وزارت نے اپنے صوبہ کی تین زبانوں مراٹھی، گجراتی اور کنڑ میں تحقیقی کام کی ترویج و ترقی کے لئے بارہ بارہ ہزار روپیہ سالانہ امداد منظور کی۔ انجمن اسلام نے حکومت کے اس اقدام پر یکم ستمبر ١٩٣٩ع کو وزیر تعلیم (جو اتفاق سے خود وزیر اعظم تھے) کی خدمت میں ایک عرضداشت بھیجی: [انجمن اسلام سالانہ رپورٹ (انگریزی) بابت ٤٧ - ١٩٤٦ع ضمیمہ ب، صفحات ٢١ تا ٢٣] جس میں یہ بتایا گیا کہ انجمن اسلام ایک اردو ریسرچ

---

* جناب خورشید مظہر الحق صاحب نعمانی، ایم، اے استاد اردو، مہارشی دیانند کالج، بمبئی

انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہتی ہے اور اس کے لئے حکومت سے مدد کی درخواست کرتی ہے۔ اس عرضداشت میں مندرجہ ذیل باتیں پیش کی گئیں۔

۱) اس مقصد کے حصول کے لئے انجمن کے پاس پہلے سے ایک اچھی لائبریری (کریمی لائبری) موجود ہے جو انجمن اسلام ہائی اسکول میں واقع ہے اس سے ملک کے اہل علم وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے رہتے ہیں اس سلسلے میں حکومت کو یہ بھی بتایا گیا کہ اس لائبریری کے لئے کارڈ انڈکس کیٹلاگ اور ایک تربیت یافتہ لائبریرین کی ضرورت ہو گی۔

۲) انجمن مجوزہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لئے ایک موزوں عمارت کی تعمیر کے لئے آمادہ ہے۔

۳) اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لئے بمبئی بہت مناسب جگہ ہوگی کیونکہ کریمی لائبریری کے وجود اور دوسری سہولتوں کے علاوہ بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اردو زبان کی ابتدا صوبہ گجرات میں ہوئی۔ بمبئی صوبہ گجرات سے بہت قریب ہے اس لئے یہاں ایک انسٹی ٹیوٹ کا قیام بہت مناسب ہوگا۔

۴) تحقیقی کام کرنے اور ایک ایسا رسالہ شائع کرنے کے علاوہ جس میں محققین کے نتائج تحقیق شائع ہوں گے انسٹی ٹیوٹ ایسے طلباء کی بھی رہنمائی کرے گا جو بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت اردو میں ایم، اے یا پی، ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں اس لئے انسٹی ٹیوٹ کا الحاق بمبئی یونیورسٹی سے ہوگا۔

اس ادارے کے لئے اس اسکیم کے تحت ایک ڈائرکٹر، ایک لائبریرین ور ایک چپراسی کی ضرورت بتائی گئی، پچاس روپئے ماہوار کے دو وظیفے اور مختلف اخراجات کا تخمینہ جو بارہ ہزار چار سو پچاس روپئے سالانہ ہوتا تھا پیش کیا گیا، اسکیم میں یہ بھی بتایا گیا کہ ڈائرکٹر کی جگہ پر کسی ایسی علمی شخصیت کا تقرر ہوگا جو خود مصنف ہو، تحقیقی کاموں سے بخوبی واقف ہو اور تحقیق کا کام کرنے والوں کی رہنمائی کا تجربہ رکھتا ہو۔

اس اسکیم کے لئے حکومت بمبئی دوسری عالمگیر جنگ چھڑجانے کی وجہ سے اپنے بجٹ میں کوئی گنجایش نہ نکال سکی لیکن. جنگ ختم ہوجانے کے بعد اس نے اپنے خط نمبر ١٢١/٤٠٧٧ای مؤرخہ ١١ مئی ١٩٤٦ء کے ذریعے انجمن سے اس سلسلے میں دوبارہ تجاویز طلب کیں۔[1] چنانچہ نئی تجاویز ٢٥ جولائی ١٩٤٦ء کو سکریٹری، وزارت تعلیم حکومت بمبئی کو ڈائرکٹر آف ایجو کیشن، پونا کے ذریعے بھیجی گئیں[2] اس نئی اسکیم میں انجمن نے اپنی ضروریات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، اسماعیل کالج، جوگیشوری کا نام اعزازی ڈائرکٹر کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور حکومت سے اس کی منظوری بھی مانگی گئی۔

حکومت نے انجمن اسلام کی پیش کی ہوئی اسکیم کو منظور کرلیا اور اپنے ریزولیوشن نمبر ٧١٢١ کے ذریعے ٢٢ جنوری ١٩٤٧ء کو انجمن اسلام کو اس کی اطلاع دی۔ اس نے انسٹی ٹیوٹ کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کی گرانٹ اس شرط پر منظور کی کہ انسٹی ٹیوٹ اردو میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر ادبی و تحقیقی کام سرانجام دے گا اور اسے بمبئی یونیورسٹی سے الحاق کی منظوری بھی حاصل کرنا ہوگی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کو اعزازی ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرنے کی اجازت حکومت نے دی۔

اس طرح سیف طیب جی (مرحوم) کی کوششیں بارآور ہوئیں اور فروری ١٩٤٧ء میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ وجود میں آیا[3] انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام ہائی اسکول کی عمارت کے ایک حصے میں قائم ہوا۔ کریمی لائبریری کو انسٹی ٹیوٹ سے ملحق کردیا گیا۔ نو ہزار روپئے کی کتابیں خریدی گئیں اور ہندوستان کے تمام علمی و ادبی و تحقیقی رسائل و جرائد بھی جاری کرائے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد واضح طور پر متعین کئے گئے جو حسب ذیل تھے:

---

١ انجمن اسلام، سالانہ رپورٹ (انگریزی) بابت ١٩٤٧-١٩٤٦ء ضمیمہ ب، ص ٢٤
٢ ایضاً
٣ ایضاً ضمیمہ ب، ص ٢٠ تا ٢٩
٤ ایضاً ضمیمہ ب، ص ١٦-١٧

۱) ایم.اے کی تعلیم کا انتظام
۲) پی. ایچ ڈی اور دوسرے تحقیقاتی کام کرنے والوں کی اعانت
۳) تحقیقاتی کام کرنے والے ادارے اور جامعوں سے تعاون
۴) ایک جامع کتب خانہ کا قیام
۵) مختلف کتب خانوں کے اردو مخطوطات کی فہرست کی ترتیب
۶) نایاب مخطوطات و مطبوعات کی اشاعت
۷) اردو سے متعلق ایک علمی و تحقیقاتی سہ ماہی رسالہ کا اجرا

انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم بنانے اور اسے تشکیل دینے میں اسماعیل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بذل الرحمٰن مرحوم کا بھی بڑا ہاتھ تھا. اس سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ کے ایک رکن کا مندرجۂ ذیل اقتباس پیش کرنا نا مناسب نہ ہوگا:

« سیف طیب جی نے انجمن اسلام کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی تجویز انجمن کی جنرل کاؤنسل کے سامنے پیش کی تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی پرزور تائید کی اور تجویز کی منظوری کے بعد اس کے قیام اور طریق عمل کے سلسلے میں ہر قدم پر ان کی رہنمائی اور مدد کی. وہ اسے ایک ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جس میں اروپائی تحقیقی اداروں کے طرز پر تحقیق کا کام ہوسکے. افسوس کہ اس کے قیام کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد انھوں نے وفات پائی اور ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی. یہ ادارہ کی بدقسمتی تھی.»[۱]

انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بعد آصف فیضی، سید نوراللہ مرحوم (سابق ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن) اور مرحوم (پروفیسر) محمد ابراہیم ڈار (استاد عربی، اسماعیل کالج، بمبئی) بھی اپنے مفید مشوروں سے سیف صاحب کی مدد کرتے رہے.

اعزازی ڈائرکٹر کے علاوہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے اردو کے نقاد ممتاز حسین کا تقرر ہوا تھا. لیکن وہ تحقیقی گتھیاں زیادہ دنوں تک نہ سلجھا سکے کیونکہ یہ ان کا میدان نہیں تھا. فیلو کی حیثیت سے یکے بعد دیگرے کئی نوجوانوں نے انسٹی ٹیوٹ میں کام کیا اور تربیت پائی. لیکن حکومت کی گرانٹ میں کمی ہوجانے کی وجہ سے ۱۹۵۷ء سے فیلوشپ کا سلسلہ بند کردیا گیا.

---

۱ عبدالرزاق قریشی، تاثرات بمبئی. علوی بک ڈپو، ص ۱۳۶ - ۱۳۷

جون ۱۹۴۹ء میں انسٹی ٹیوٹ نے حکومت بمبئی سے ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی استاد اردو اسماعیل کالج کی خدمات دو سال کے لئے حاصل کیں۔ ان کا تقرر انسٹی ٹیوٹ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے ہوا، انھیں کی کوششوں سے انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی تحقیقی رسالہ «نوائے ادب» جنوری ۱۹۵۰ء سے نکلنا شروع ہوا، ڈاکٹر مدنی اس کے ایڈیٹر اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی اس کے نگراں مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ مندرجہ ذیل مقاصد کے ساتھ جاری کیا گیا۔

۱) اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف پہلوؤں پر بحث و تحقیق
۲) گجرات و دکن کی غیر مطبوعہ اردو تصانیف کی اشاعت
۳) اردو سے متعلق تحقیقاتی کاموں کی اطلاع
۴) اردو کے علمی و ادبی رسائل کے مضامین کی تلخیص و اشاعت

اس رسالے کو شروع ہی سے اہل علم اور خصوصاً اردو کے محققین نے قدر کی نگاہ سے دیکھا، یہ اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ اردو ادب سے متعلق نیا مواد پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، طباعت کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پرچہ کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا «مقالہ نما» ہے جو تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے اشاریہ کا کام دیتا ہے ہند و پاک کے اردو رسالوں میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی اور یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے اسے بہت پسند کیا۔ اس کو سامنے رکھ کر اب ہند و پاک کے بہت سے اردو رسالوں نے اشاریہ شائع کرنا شروع کیا ہے لیکن ان میں اب بھی اس قدر تفصیل نہیں مل سکتی جو نوائے ادب کے «مقالہ نما» کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کی ابتداء ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم، استاد عربی، اسماعیل کالج نے کی تھی۔ مقالہ نما پہلے ہر شمارے میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن اب سال میں صرف ایکبار یعنی آخری شمارے میں مجموعی طور پر ہونے لگا ہے تا کہ محققین کو سال بھر کا مواد یا اشاریہ یکجا مل سکے۔

۱۹۵۸ء میں بمبئی یونیورسٹی کے ریکٹر جناب جی، ڈی پارکھ انسٹی ٹیوٹ کے معائنے کے لئے تشریف لائے، انھوں نے ہدایت کی کہ انسٹی ٹیوٹ میں ایک باقاعدہ ریسرچ اسسٹنٹ مستقل طور پر رکھا جائے جس کا تحقیقی کام پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لئے بلکہ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس ہدایت کے

بموجب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں عبد الرزاق قریشی کا تقرر ہوا اور وہ اب تک اس انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔

اس انسٹی ٹیوٹ سے اب تک مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

(۱) ولی گجراتی مصنفہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی ، ولی جو اردو زبان کا ایک بڑا اور اہم شاعر ہے اس کی وطنیت سے متعلق محققین میں اختلاف چلا آتا تھا۔ میر تقی میر نے اسے اورنگ آبادی لکھا ہے اور اسی لئے زیادہ تر لوگ اسے دکنی سمجھتے تھے۔ مرحوم پروفیسر نجیب اشرف ندوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے یہ ظاہر کیا کہ ولی دکن کا نہیں بلکہ گجرات کا رہنے والا تھا لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کچھ لکھا نہیں صرف ایک مضمون اسماعیل کالج کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا البتہ قاضی اختر میاں جونا گڈھی نے اپنے ایک طویل مضمون میں جو « منصف » علی گڑھ میں شائع ہوا تھا یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ولی دراصل گجرات کا باشندہ تھا۔ ڈاکٹر مدنی نے اگر پدر نتواند پسر تمام کند کے اصول پر عمل کرکے اس کام کی تکمیل کی ڈاکٹر مدنی ندوی صاحب کے شاگرد تھے اور مرحوم نے ان سے اس موضوع پر بارہا گفتگو کی تھی چنانچہ انھوں نے مزید تحقیق کرکے اور نئے ثبوت فراہم کئے اور اطمینان بخش حد تک یہ ثابت کیا کہ ولی کا وطن گجرات ہے۔ وطنیت کی بحث کے علاوہ ڈاکٹر مدنی نے اس کتاب میں ولی کی علمی استعداد ولی کے کلام میں ہندوستانی عنصر وغیرہ بھی بتائے ہیں۔

(۲) کتب خانہ جامع مسجد ، بمبئی میں اردو مخطوطات ، مرتبۂ حامد اللہ ندوی ، حامد اللہ ندوی نے کچھ عرصے تک انسٹی ٹیوٹ میں فیلو کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ مفصل کیٹلاگ انھوں نے اس زمانے میں مرتب کیا تھا ، اس میں ۷۵ مخطوطات کا تفصیلی تعارف ہے۔

(۳) لغات گجری مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ یہ کتاب اگرچہ ہیت کے لحاظ سے نصاب نامہ قسم کی ہے لیکن دراصل اسے اردو لغت نویسی کی پہلی کوشش کہہ سکتے ہیں ، اسے مرحوم پروفیسر نے برسوں کے مطالعے کے بعد مرتب کیا ، انھوں نے اس پر ایک طویل اور جامع مقدمہ بھی لکھا جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مقدمہ میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کی ابتدائی ادبی تعلیم میں گجرات کو بڑی حد تک اولیت حاصل

رہی ہے ، یہ کتاب لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خصوصاً اہم اور کارآمد ہے ۔

(۴) مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا اردو کلام از عبدالرزاق قریشی ، اس کتاب میں مولف نے مرزا مظہر کے حالات زندگی ، ان کی روحانی و ادبی خدمات اردو و فارسی شاعری ، اردو زبان سے متعلق ان کی مساعی کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے آخر میں ان کا اردو کا منتشر کلام بھی یکجا کردیا ہے ۔

(۵) دیوان عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی ، عزلت میر و سودا کے ہم عصر تھے ان کے دیوان کے چند نسخوں کو سامنے رکھ کر یہ ایڈیشن تیار ہوا ہے ، اس کتاب میں ابتدا میں مرتب نے سید عبدالولی عزلت کے حالات زندگی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور عزلت میں اردو و ہندی کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔

(۶) مبادیات تحقیق از عبدالرزاق قریشی ، اردو میں تحقیق کا رواج اب عام ہو چلا ہے لیکن فن تحقیق سے متعلق اب تک کوئی ایسی تصنیف نہ تھی جس میں تحقیق کے طریق کار سے بحث کی گئی ہو ، مولف کی یہ کتاب اس موضوع پر پہلی اور کامیاب کوشش ہے ۔

عبدالرزاق قریشی نے عبدالولی عزلت کی راگ مالا بھی مرتب کی ہے لیکن وہ ابھی تک شائع نہیں ہوسکی ہے ۔ انسٹی ٹیوٹ کے موجودہ اعزازی ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ ایم ، اے ، پی ایچ ڈی ہیں ۔ وہ سدھارتھ کالج ، بمبئی میں اردو فارسی کے استاد ہیں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ « مرزا رسوا » شائع ہوچکا ہے ان کی ایک اور تصنیف « انشائیہ » بھی چھپ چکی ہے ۔ اس وقت وہ میر ناصر علی پر مقالہ لکھ رہے ہیں ۔

* * *

* مختارالدین احمد

نجیب اشرف صاحب کے چند خطوط

نجیب اشرف صاحب سے میری ملاقات کوئی تیس سال سے تھی، اور اتنی ہی مدت تک ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل زمانہ میں ان کے بہت سے خط میرے پاس آئے ہونگے۔ لیکن اس وقت تلاش پر علی گڑھ کے ذخیرہ میں صرف چند ملے جن میں سے چھ خطوط «نوائے ادب» میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

پہلا خط ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا ہے جب میں بہار میں اردو نثر پر ایک مضمون لکھ رہا تھا اور آخری خط ۲۱ اگست ۱۹۶۸ء کا ہے جو وکرم یونیورسٹی اوجین کے ایک ریسرچ اسکالر کے زبانی امتحان کے سلسلے میں انہوں نے لکھا تھا اس خط میں انہوں نے ۷ ستمبر ۱۹۶۸ء کو بھوپال پہونچنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ اس سے دو دن پہلے اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اندھیری، بمبئی
۲۷ فروری ۱۹۳۹ء

مکرمی سلام مسنون

مکرمت نامہ باعث از دیاد مشرف و عزت ہوا۔ اس ذرہ نوازی و عنایت کے لئے شکریہ قبول فرمائیے۔

---

* ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو ام، اے، ڈی فل (آکسفورڈ) پروفیسر صدر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، مرتب نقد غالب، گلشن ہند وغیرہ

آپ نے جو استفسارات فرمائے ہیں[1] ان کے صحیح ترین جواب کے لئے موضوع ترین شخصیت جناب قاضی عبدالودود صاحب کی ہے۔ صوبۂ بہار کے قطبِ اردو وہی ہیں۔ آپ اُن سے رجوع فرمائیے۔

پھلواری کی تصانیف[2] کی زیارت کا موقع نہیں ملا۔ اس لئے کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی سے پہلے کی کوئی نثر صوبۂ بہار میں نہیں ہے۔

آپ جب اس سلسلے میں تحقیقات کرلیں تو مجھے ضرور اس سے استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

آپ نے کمال فرمایا کہ جواب کے لئے ٹکٹ روانہ فرمایا۔[3] ایک غریب لیکن شریف و غیور آدمی کی اس سے بڑھ کر کوئی توہین نہیں ہوسکتی۔ آپ تو ہمارے صوبہ کے ہونہار ادیب اور مستقبل کے ادبی و علمی رہنما ہیں۔ ہم لوگوں کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ آپ کی ہمت افزائی کریں، نہ صرف یہ کہ آپ کے لئے سہولتیں پیدا کریں بلکہ اگر آپ تیار ہوں تو جو معلومات ہماری ملکیت ہیں اُن کو بھی آپ کے قدموں میں ڈال دینے کے لئے تیار ہیں

امید کہ یہ آپ کا آخری مرحمت نامہ نہ ہوگا اور اپنے علمی کارناموں سے مطلع فرماتے رہیں گے۔ مصحفی والا مضمون کیا ہوا؟[4]

میں اس کا قائل نہیں کہ کام شروع کرکے ختم کردیا جائے۔ میں رسالہ اُس وقت نکالوں گا جب میں چند سال تک اس کا بار ذاتی حیثیت سے برداشت کرسکونگا ورنہ نہیں۔[5]

حضرت مولانا صاحب قبلہ[6] سے سلام مسنون کہہ دیجئے۔

آپ کا خادم

نجیب اشرف ندوی

---

۱ میں اس زمانے میں بہار کی اردو نثر پر کام کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں بعض امور کاتب خط سے پوچھے تھے۔

۲ مہر عمادالدین قلندر پھلواروی کی طرف منسوب ایک اردو رسالہ "سیدھا رستہ" مولانا سید محی الدین تمنا عمادی مجیبی پھلواروی مد ظلہ العالی نے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا۔ یہ بہار اور شمالی ہند کی قدیم ترین اردو کتاب بتائی جاتی تھی۔ راقم نے مکتوب الیہ سے اس رسالے کے متعلق استفسار کیا تھا۔

۳ نجیب صاحب نے ٹکٹ واپس کردیا تھا۔ چنانچہ اس ٹکٹ کا کچھ حصہ اب بھی ان کے اصل خط پر موجود ہے۔

۴ ان کی مراد اس مضمون سے ہے جو "تلامذہ مصحفی" کے عنوان سے بعد کو رسالہ "نگار" میں مسلسل کئی ماہ تک شائع ہوتا رہا۔

۵ اس زمانے میں نجیب صاحب اردو کا ایک ادبی و تحقیقی رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس خط میں جو کچھ لکھا بعد میں اسے پورا کر دکھایا۔ یعنی اپنی ادارت میں بالآخر بمبئی سے "نوائے ادب" انہوں نے نکالا جو اب تک بڑی کامیابی کے ساتھ برابر شائع ہو رہا ہے۔

۶ والد محترم حضرت مولانا ظفرالدین صاحب رحمۃ قادری

۷۸۶

اندھیری
۲۵/ ۸ /۱۹۶۱

عزیز و محترم و گرامی ۔ سلام و دعا

عرصہ کے بعد آپ کا خط آیا اور اپنے ساتھ ایک ایسی خبر لایا جو صوبۂ بہار کی اسلامی و ادبی دنیا کے لئے نا قابل تلافی ٹریجیڈی ہے میں اپنے جذبات کو الفاظ میں نہیں سمو سکتا، کیونکہ اگر لکھنے بیٹھ گیا تو نہ معلوم کیا کیا لکھ جاؤں گا۔ اگر ان کا کوئی کام بھی قریب الاختتام پہونچ چکا ہو تو اس کو نظر ثانی کروا کے شائع کرا دینا چاہئیے ۔ اس طرح ہم کم سے کم طریقہ سے ان کے ساتھ اپنے تعلقات کا اظہار اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف کرسکتے ہیں[۲] کتاب کی طباعت کے اخراجات کا ذمہ لیتا ہوں۔

میں نے انسائیکلوپیڈیا والوں کو اسی زمانہ میں لکھ دیا تھا[۳] اور چند دن ہوئے ایک رجسٹرڈ خط کے ذریعہ ان کو دوبارہ یاد بھی دلایا تھا۔ اب پھر لکھ رہا ہوں۔ وہ ضرور اپ کو لکھیں گے۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ایک فہرست بھیج دی ۔ آپ کام کریں تو اس سلسلے میں آپ قاضی صاحب سے مشورہ لے لیجیے ۔ وہ اس فن پر سند ہیں۔ اس سے آپ کو بڑی تقویت ہوگی۔ دوسری چیز یہ کہ

---

۱ اسی زمانے میں پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی کا انتقال ہوا تھا اور اس کی خبر نجیب صاحب کو میں نے دی تھی۔ شرف عالم مرحوم فزکس کے استاد تھے ۔ فاضل وقت میں ستار بجانے تھے اور قدیم شعراء پر تحقیقی مضامین لکھتے تھے ۔ ۱۹۳۶ع میں جناب قاضی عبدالودود صاحب نے جب پٹنہ سے اپنا تحقیقی رسالہ ،،معیار،، نکالا تو شرف عالم مرحوم کو اس کا نائب مدیر مقرر کیا ۔

۲ تلاش کے باوجود ان کی کوئی مکمل کتاب نہیں مل سکی۔ ان کے مختلف ادبی مضامین اور ترجمے رسالہ ،،ادبی دنیا،، ،،ساقی،، ،،معیار،، وغیرہ میں شائع ہوئی تھے۔ موپساں کے افسانے کا نہایت عمدہ ترجمہ انہوں نے کیا تھا قاضی صاحب کا اس زمانے میں خیال تھا کہ حسن راتگاں اور دوسرے افسانے کے نام سے ان کے طبع زاد اور ترجمے کئے ہوئے افسانوں کا مجموعہ شائع کر دیا جائے لیکن یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوسکی ۔

۳ حیدراباد سے اردو انسائیکلوپیڈیا شائع ہونے والی تھی جس کے چیف ایڈیٹر پروفیسر محی الدین قادری زور مرحوم تھے۔ کچھ مصنفین و شعراء، پر مجھے بھی مقالے سپرد قلم کرنے تھے۔ بہار کے قدیم شعراء راسخ، میر محمد علی تحقیق امین الدین امین، جوشش، شورش، عشقی وغیرہ کی طرف میں نے زور صاحب کو توجہ دلائی تھی اور اس امر کے متعلق نجیب اشرف صاحب کو بھی امر کی طرف اشارہ ہے۔

آپ مصنف کی زندگی، اس کی تصنیف، اس سے اس کی ذہنیت، اس کے عہد اور ما بعد کے عہد پر اس مصنف کے اثرات اور اس قسم کی دوسری چیزوں پر بھی توجہ رکھنے کی ضرورت ہے اب زمانہ .... کا بھی نہیں رہا. آپ کے پاس تعمیری پروگرام ہونا چاہئے[۲].

آپ کا نیاز مند
دعا گو
نجیب اشرف ندوی

میرا پتا یہ ہے:-
نجیب اشرف ندوی
اندھیری - بمبئی.

۷۸٦

اندھیری
۱۵-۸-۴۳

عزیز محترم سلام و دعا

میں یہ خط عرصہ کے بعد لکھ رہا ہوں اور وہ بھی اپنی غرض سے. میرے ایک طالب علم ناسخ پر تھیسس لکھ رہے ہیں[۳]. اس سلسلے میں ان کو پٹنہ کے دو خزانوں سے استفادہ کرنا ہے. ایک تو زندہ خزانہ ہمارے محترم بزرگ قاضی صاحب ہیں اور دوسرے خدا بخش خاں کا کتب خانہ. قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے میں ان کو کہہ چکا ہوں اور جب ان کا کام ختم ہوچکے گا تو شاید میں خود ان کو لےکر پٹنہ آؤں. لیکن اس سے پہلے وہ تمام اس ذخیرہ کو کھنگالنا چاہتے ہیں جو مختلف کتب خانوں میں ہیں. اس لئے آپ ہی کو پٹنہ میں اس کام کے لئے منتخب کیا جاتا ہے. اللہ نے آپ کو جوان صالح بنایا ہے اور

---

۱ لفظ پڑھا نہیں گیا.

۲ کچھ دن پہلے علامہ سید سلیمان ندوی کے مجموعہ مضامین "نقوش سلیمانی" پر راقم کا ایک تفصیلی مضمون رسالہ "نگار" میں شائع ہوا تھا.

۳ عبد الصمد نام کے ایک صاحب پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے تھے. لیکن وہ مکمل نہ ہوسکا.

صحیح تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کے ساتھ جوش عمل بھی عطا کیا ہے۔ اس لئے مہربانی فرما کر آپ یہ لکھئیے اور مفصل کہ :

(۱) خدا بخش خاں کی لائبریری میں ناسخ کا قلمی دیوان ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو مطبوعہ دیوان سے کیا فرق ہے ؟

(۲) (الف) تذکرۂ خوش معرکہ زیبا مصنفہ سعادت ناصر

(ب) تذکرۂ میر جہاں تاب

(ج) تاریخ محتشم خانی

یہ کتابیں لائبریری میں ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو ناسخ سے متعلق کیا مواد مل سکتا ہے۔ ان کے علاوہ آپ کے پاس ناسخ کی ولادت، خاندان، سنہ وفات وغیرہ کے متعلق جو نجی معلومات ہوں وہ بھی لکھئیے۔ اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں مگر کیا کیا جائے :

تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

جواب کا سختی سے منتظر رہوں گا۔ قاضی صاحب کی خدمت میں سلام نیاز پیشگی شکریہ قبول فرمائیے۔

آپ کا خادم

نجیب اشرف ندوی

اندھیری، بمبئی ۷۸٦ ٹیلیفون نمبر : ۸٦۳۱٦

۲۹ جنوری ۴۹ء نجیب اشرف ندوی

عزیزم محترم سلام و دعا

آپ کا خط باعث مسرت تو تھا ہی کہ میگزین نے اسے دو چند کا دہ چند کردیا[۱]۔ اللہ آپ کے قلم و قسمت کو زیادہ سے زیادہ درخشندہ بنائے۔

یونیورسٹی میں غالب کی کوئی تحریر نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے پاس غالب کے بہت سے خطوط ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے غالب ڈے (یوم غالب) کی نمائش کے سلسلے میں دئیے تھے[۲]۔

---

۱ غالب نمبر سے پہلے ۱۹۴۹ع میں میری ادارت میں علی گڑھ میگزین کا ایک عام شمارہ شائع ہوا تھا اور اس کے بعد غالب نمبر کی تیاری ہو رہی تھی

۲ کوشش کے باوجود مولوی صاحب مرحوم کے پاس ان خطوں کے دیکھنے کا موقع نہ مل سکا میں دلی جاکر ان سے ملا تھا۔ وہ بہت ملول افسردہ اور دل شکستہ ایک چھوٹے سے مکان میں بیٹھے تھے۔ سامان درہم برہم تھا۔ ایسے میں ان خطوں کا کیا پتا چلتا۔

بھروچ (گجرات) کے قاضی نورالدین احمد صاحب نے گجرات کے شعراء کا ایک تذکرہ «مخزن الشعراء» کے نام سے لکھا تھا اور اسے اصلاح کے لئے غالب کے پاس بھیجا تھا۔ غالب نے حاشیہ پر اصلاح دے دی تھی۔ وہ نسخہ نہیں ملتا۔ البتہ اس کا مبیّضہ یونیورسٹی میں موجود ہے اور مولوی عبدالحق نے اس کی نقل انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کی ہے۔ قاضی صاحب مرحوم کے پوتے سے میری ملاقات ہے۔ میں ان کو لکھ رہا ہوں۔ اگر ان کے پاس غالب کی کوئی ہوئی تو آپ کے لئے حاصل کرکے بھیج دوں گا[۱]۔ ہمارے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ممتاز حسین صاحب[۲] غالب پر کام کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کا خط ان کو دے دیا ہے۔ امید ہے کہ وہ کوئی مضمون بھیجیں گے۔

میگزین کی ادارت پر مبارکباد۔ بہار کے لوگوں کو یہ سعادت بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ پروفیسر معین الدین دردائی[۳] کے بعد آپ شاید پہلے آدمی ہیں۔ بہار کے حالات معلوم ہوں تو لکھئے۔

آپ کا
نجیب اشرف ندوی

اندھیری
۱۱ مارچ ۰۵۰

عزیزم محترم سلام و دعائیں

مجھے تعجب ہے کہ میرے خطوط آپ کو کیوں نہیں ملتے۔ مجھے جس وقت غالب نمبر ملا تھا اس وقت ایک کارڈ میں نے رسیدی کا آپ کو لکھا تھا اور اس کے پندرہ دن بعد آپ کو اس خاص نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دی تھی۔ اب ایک مرتبہ پھر اس ادبی و علمی خدمت کے لئے مبارکباد قبول کیجئے۔ قاضی صاحب

---

۱ افسوس ہے کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوسکا۔

۲ اردو کے ممتاز نقاد، اب کراچی میں مقیم ہیں۔

۳ راقم اور دردائی صاحب کے علاوہ بہار کے ایک خوش گو شاعر ممتاز حسن بسمل بھی علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ یہ پروفیسر حفیظ الرحمان ڈین فیکلٹی آف لا علی گڑھ کے ساتھیوں میں تھے بہت ذہین انسان تھے۔ افسوس ہے کہ جوانی میں انتقال کیا۔

قبلہ کے مضامین تو دوسروں کے لئے مشعل ہدایت ہیں۔ ہمارے یہاں یہ نمبر بہت پسند کیا گیا۔ میں نے اپنے طلبا کو جو اس سال آنرز میں غالب پڑھ رہے ہیں اس کے مطالعہ کی خاص ہدایت کی ہے۔ چنانچہ میرا پرچہ ابھی تک گردش میں ہے اس سے پہلے بھی آپ نے جو نمبر شائع کیا تھا اس کی بھی آپ کو داد دے چکا ہوں۔ کاش آپ کے رفقائے کار اس معیار کو باقی رکھ سکیں۔ میری طرف سے مخدومی پروفیسر رشید احمد صدیقی کو سلام نیاز کہئے۔ میں قاضی نورالدین صاحب کو خط لکھ رہا ہوں۔

آپ کا
نجیب اشرف ندوی

۸۶

اندھیری ، بمبئی ۵۸
۲۱ اگست ۱۹۶۸ء

محترمی ، سلام شوق

ابھی ابھی آپ کا خط ملا۔ میں آج ہی وکرم یونیورسٹی کے رجسٹرار کو لکھ رہا ہوں کہ وہ بھوپال میں ۷ ستمبر کو امتحان رکھیں[1] اور مجھے امید ہے کہ یہ تاریخ میرے رفیق کار کے لئے موزوں ہوگی۔ خط آنے پر آپ کو مطلع کردونگا۔

شاید آپ کو مطلع کرچکا ہوں کہ ادھر خونی بواسیر کی شکایت ہوگئی ہے اور اس نے کمزور کردیا ہے۔ آج ایک اسپشلسٹ کے پاس جا رہا ہوں۔ دیکھئے

---

۱ حنیف احمد نقوی ایم، اے لکچرر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اردو میں ڈاکٹریٹ کے لئے اردو تذکروں پر تحقیقی مقالہ، جناب ابو محمد صاحب (وکرم یونیورسٹی) کی نگرانی میں لکھا تھا۔ پروفیسر نجیب اشرف صاحب اور راقم اس مقالے کے ممتحن تھے۔ زبانی امتحان کے لئے ہم دونوں کو بھوپال پہونچنا تھا۔

کیا تجویز کرتاہے۔ اگر اس وقت تک افاقہ ہوگیا اور سفر کے لئے طاقت و ہمت مل گئی تو انشاءاللہ بھوپال تک آجاؤنگا۔[۱] ورنہ بشرط حیات بمبئی میں تو نیاز ضرور حاصل ہوگا۔ میرے لئے دعا کیجئے۔[۲]

دعا کا طالب

نجیب اشرف ندوی

---

۱ ۷ ستمبر ۱۹۶۸ء کو سید عبدالقوی دسنوی اور ابو محمد سحر صاحب بھوپال میں ان کا انتظار کرتے رہے! ۸ ستمبر کی صبح کو آگسرہ گینند سے میں نے شکایت کا خط لکھا کہ آپ وعدہ کرکے بھوپال نہ آئے۔ علی گڑھ پہونچا تو محب مکرم عبدالرزاق قریشی صاحب کا خط ملا کہ استاد مکرم ۵ ستمبر کو اچانک انتقال کرگئے۔

۲ خدا آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور آپ پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

مکتوبات ندوی صاحب مرحوم
بنام
خواجہ حمید الدین شاہد حیدرآبادی ثم کراچوی

اندھیری

۱۱-۱-۴۴ء

عزیزم محترم سلام و دعا

آپ کا پر خلوص محبت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ مضمون بہت اچھا ہے اور اچھوتا[1]۔ مجھ سے اس سلسلے میں جو مدد بھی ہوسکے وہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ آپ پہلے انڈیا آفس، کتب خانۂ آصفیہ وغیرہ کی اردو سے متعلق فہرستیں دیکھ ڈالئے۔ اس کے علاوہ سجاد مرزا کی الفہرست بھی۔ میرے پاس بھی اس موضوع پر تعلیمی کتابــوں کا ذخیرہ ہے۔ آپ کو یہاں بھی آنا چاہئیے۔ یہاں انجمن اسلام لائبریری[2] اور جامع مسجد کا کتب خانہ خاصہ بڑا اور پرانا ہے۔

ہاں بھائی ایک کام میرا بھی کرو۔ گزشتہ سال جب میں حیدرآباد گیا تھا تو پروفیسر سید محمد صاحب نے فرمایا تھا کہ مخطوطات دکن کی کتابیں جو مجھے نہیں ملی ہیں وہ مجھے بھیج دیں گے لیکن ان کو شاید خیال نہیں رہا۔ آپ نوجوان اور مستعد آدمی ہیں۔ ذرا یہ کام کردیجئیے۔ شکریہ پیشگی۔ میں اردو کانفرنس[3] کی شرکت کے لئے ۱۸ کو ناگپور پہنچوں گا۔ کیا آپ لوگ آرہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب کو اور دیگر پرسان حال اصحاب کو سلام کہئیے۔ میں نے آپ کی فہرست رکھ لی ہے، اطمینان سے اس پر نظر ڈال کر جو کتابیں نہ ہوں گی ان کا اضافہ کر دوں گا۔

آپ کا

نجیب اشرف ندوی

---

۱ مکتوب الیہ نے ام، اے کے مقابلے کے لئے اردو میں سائنسی ادب کو موضوع بنایا تھا۔

۲ انجمن اسلام لائبریری سے مراد کریمی لائبریری ہے جو اب انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری کا ایک حصہ ہے۔

۳ یہ کانفرنس انجمن ترقـــی اردو، ہند کی طرف سے مرحوم مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔

۵•

عزیز محترم دلی دعائیں

ف فرمائیگا میں آپ کے مکرمت مامے کا جواب بروقت نہ دے سکا.
یک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں میں اکثر بمبئی سے باہر رہا.
ات کا سلسلہ شروع ہوا. آج اولیں فرصت میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں.

.و مثنوی پر متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں. مگر پھر بھی اس پر بہت کچھ
ںکتا ہے. پھر دکنی مثنویوں پر تو کام ہوا ہی نہیں ہے. میرا تو خیال ہے
ئوئی صرف گولکنڈہ یا بیجاپور کی مثنویوں ہی پر لکھے تو اسے اب بھی
کرنا پڑے گا اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو ہندی والے اس کو دکنی ہندی
سے اپنا لیں گے. آپ تو ہندی کے بھی عالم ہیں. آپ اس کام کو فوراً
دیجئے.

ـ کا ایم اے کا مقالہ سائنسی ادب پر تھا. اس کے ذرائع سے آپ بڑی
واقف ہیں اس لئے پہلے آپ یہ دیکھئے کہ اس سلسلے میں آپ کیا مزید
فراہم کرسکتے ہیں ورنہ مقالـــہ اس متن کی شرح ہوکر رہ جائے گا.
گر آپ نے اسے طے کرلیا ہے اور یقیناً ایک اچھوتا (Virgin or untouched)
ے تو مجھ سے اس سلسلے میں جو مدد ہو سکے اس کے لئے حاضر ہوں.
جو خاکہ تیار کیا ہو اس کی ایک نقل مجھے بھجوا دیجئے تو اگر اس میں
فے کی ضرورت سمجھوں گا تو عرض کروں گا.

ـگم صاحبہ کو میرا آداب کہئے. اگر کبھی حیدر آباد آنا ہوا تو انشاء اللہ
:قات کی مسرت حاصل کروں گا. آپ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے
کی دو وجہیں ہیں:

ا‌م سے مسلسل عملی لگاؤ
.ر ڈاکٹر زور سے بے پایاں وفاداری

ـدا وند تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور ہر روز آپ کے لئے ترقی کا
دن ہو.

آپ کا دعا گو
نجیب اشرف ندوی

ہمارے نوائے ادب کے لئے اپنے مقالے (M.A) کا کوئی باب بھیج دیجئے۔ ہم اس کو باب باب کرکے شائع کردیں گے۔ اور اسی طرح کتاب شائع ہوجائے گی یا کوئی اچھا علمی تحقیقی مضمون کسی موضوع پر ہو لیکن اردو سے وابستہ ہو۔ خواجہ صاحب ذرا توجہ فرمائیے۔

مکتوب الیہ نے اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لئے اردو مثنوی کا ارتقا عہد ولی تک کو موضوع بنایا تھا۔ لیکن وہ اسے مکمل نہ کرسکے۔

تبصرے

ں یگانہ چنگیزی از راہی معصوم رضا ، شاہین پبلشرز ، الہ آباد صفحات ۳۱۰ ،
قیمت : پانچ روپئے

یاس یگانہ چنگیزی ، راہی معصوم رضا کا ایک بسیط مقالہ ہے جو اب کتابی
کل میں شائع ہوا ہے. کتاب کے ابتدائیہ میں فاضل مقالہ نگار نے جو چند جملے
ھے ہیں اُن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو داں طبقے اور اردو کے نقادوں میں
، بھی وہ تنقیدی شعور پیدا نہیں ہوا ہے جو فنکار کے ذاتی عقائد اور خامیوں
ے درگزر کرکے اس فن کو پرکھ سکے .

اردو دنیا میں یاس یگانہ چنگیزی کی شخصیت ایک بحث طلب اور اختلافی
خصیت ہے . غالب پرستی کے صدقے میں ملی ہوئی عزت کو ٹھوکر مارنے والے
ر " ناحق پرستی پر خود پرستی کو ترجیح دینے والے اور حالات کے سامنے کبھی
جھکنے والے اس جنونی شاعر " پر قلم اٹھاتے ہوئے مقالہ نگار کے ذہن پر ایک
کا سا خوف طاری نظر آتا ہے. شاید عوامی ذہن اور رائے کی سنگدلی سے واقف
، اسی لئے ابتدائیہ میں پیش بندی کے طور پر یہ جملے ملتے ہیں " غالب شکن
ر شہرت کاذبہ کے ہنگاموں میں یہ بات تقریباً نظرانداز کردی گئی کہ یگانہ شاعر
ی تھے. " " میں نے غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے لیکن یگانہ سے اتنی
مدردی ضرور کی ہے جتنی ہمدردی کا تقاضہ فریضۂ نقد کرتا ہے. " ان جملوں
ے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس سے قبل یاس یگانہ چنگیزی پر چند مضامین
ے قطع نظر ، غیر جانبداری ، خلوص اور ہمدردی سے کوئی بات نہیں کہی گئی.

راہی معصوم رضا نے شاعر کی شخصیت اور فن پر پانچ ابواب لکھے ہیں
ر ایک باب میں اس کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے. ان ابواب میں ایک منطقی
بط اور شاعر کے " قطرہ سے گہر ہونے تک " کا ذکر ہے . یگانہ کی شخصیت
ر جو باب ہے وہ محض حالات زندگی کا سلسلہ وار بیان ہی نہیں بلکہ شاعر کا
نسیاتی اور منطقی مطالعہ بھی ہے . " یاس عظیم آبادی " اور " یگانہ چنگیزی " کے

عنوان سے دو ابواب میں شاعر کے فن ارر فلسفہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آخری باب میں جدید اردو غـــزل میں یگانہ کی اہمیت اور اس کی شاعری کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ یہ باب مجنوں گورکھپوری کے اس خیال کی تفسیر معلوم ہوتا ہے کہ « یگانہ کی قیادت میں ایک نئی نسل تیار ہوسکتی ہے۔ » کتاب کے آخری باب میں یگانہ کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔

کتاب کو پڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ راہی معصوم رضا ، ادبی پل صراط کو کامیابی سے پار کرگئے ہیں۔

بھوپال اور غالب ، شعبۂ اردو ، سیفیہ کالج ، بھوپال صفحات : ۱۲۸ ، قیمت : دو روپئے پچاس پیسے

اس کتابچے میں غالب کے بھوپال سے تعلقات اور بھوپال کی غالب سے عقیدت و محبت کے کئی خوشگوار پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مختلف مضامین میں ہمیں اس تہذیـــبی روایت کی جھلک نظر آتی ہے جس میں اہل شہر اپنے شہر سے کسی فنکار کے تعلق اور وابستگی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

فرمانروایان بھوپال میں سے چند غالب کے سرپرست رہے ہیں اس کے علاوہ بھوپال میں غالب کے شاگردوں اور ملاقاتیوں کی فہرست میں متعدد مقتدر اور علم دوست حضرات کے نام نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور میں نواب سکندر جہاں نے غالب کو بھوپال آنے کی دعوت دی تھی۔ « مرزا سے دلی نہ چھوٹی » نذرانے کی رقم بہرحال غالب کو پہنچتی رہیں۔

بھوپال اور غالب میں بھوپال کے اُن دس شاعروں کے حالات دئیے گئے ہیں جنھیں غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ ان تلامذہ میں شریف حسن خان شریف پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مرزا یوسف علی خان عزیز سے متعلق جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ تشنہ ہیں۔ کتاب میں نواب صدیق علی خان اور امجد اشہری دو ایسے حضرت کا تعارف بھی شامل ہے جن کے غالب سے دوستانہ تعلقات تھے۔ کتاب کے آخر میں « نمونہ مغلوبیت غالب » « نسخہ حمیدیہ » اور « ایک غزل » کے عنوان سے چند مختصر مضامین ہیں جن کے ذریعے غالب کے فکر و فن سے متعلق چند نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اس کتابچہ کے ذریعے غالبیات

سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے چند نئے مسائل ابھر رہے ہیں جو تحقیق و جستجو چاہتے ہیں۔

گُلِ نو از واحد پریمی، مکتبۂ صبح ادب، بھوپال صفحات: ۱۳۴، قیمت دو روپئے

زیر تبصرہ کتاب واحد پریمی کا مجموعۂ کلام ہے۔ ابتدائی اکسٹھ صفحات پنتیش سخن شناس حضرات کے خیالات و آراء سے مزین ہیں۔ اصل کتاب صفحہ ۶۲ سے شروع ہوتی ہے۔ ۸۲ صفحاب کے اس مختصر سے مجموعہ کلام میں اچھے اشعار بھی کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً

بارہا زبانوں پر لگ گئی ہے پابندی   بارہا نگاہوں سے کی ہے گفتگو میں نے
کیا کوئی دیدہ ور نہیں یارو   چشم نرگس ہے کس لئے نمناک
خم گیسو کو او سلجھانے والے   جبین وقت پر بھی اک شکن ہے
نہیں ملتی ہمیں رہ منزل   کس کے نقش قدم میں الجھے ہیں

واحد پریمی کی آواز آج کے نئے غزل گو شعراء کی محفل میں دھیمی مگر واضح ہے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کا احساس اور احساس کا غزل کے جام رنگیں کے ذریعے پیش کرنا ایک مشکل مگر خوبصورت کام ہے جسے واحد پریمی نے بڑی حد تک کامیابی سے انجام دیا ہے۔ تعارف اور تصویر سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی جواں سال ہیں امید ہے کہ ان کی شاعری بھی عمر کے ساتھ ساتھ پختگی کے مراحل طے کرکے اور نکھرے گی۔

ماہنامہ «سب رس» حیدرآباد، ستمبر و اکتوبر ۶۹ء، غالب نمبر صفحات: ۳۲۸، قیمت: ۵ روپئے

سب رس کا غالب نمبر اپنے مضامین کے تنوع کی وجہ سے دوسرے رسائل کے غالب نمبر سے قدرے مختلف ہے۔ بقول ادارہ «فہرست میں ماہرین غالبیات میں سے کسی کا نام نہ ملے گا لیکن مقالوں کے مطالعہ کے بعد ممکن ہے کہ آپ میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان میں مستقبل کے کئی ماہرین غالبیات ہوں گے۔» غالب کی زندگی اور شخصیت سے متعلق مرحوم ڈاکٹر محی الدین زور کا مضمون ان کی ایک کتاب سے ماخوذ ہے جس سے حیات غالب کا ایک خاکہ

ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کا مضمون «غالب نما» پروفیسر سید محمد کے تاثــرات غالب خستہ جان اور معز الدین قادری الملتانی کا مضمون «غالب اور تصوف» غالب کی تہ دار شخصیت کے کئی گوشوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ «غالب اور متنبیٰ کا تقابلی مطالعہ» میں ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی نے جتنی اور غالب کی حیات اور انداز فکر کی مشابہت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان دو عظیم شاعروں کے درمیان تقریباً آٹھ نو سال کا فاصلہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے مزاج اور فکر میں مشترکہ خصوصیات و حیرت انگیز حد تک پائی جاتی ہیں۔ غالب کی فارسی شاعری سے متعلق شکیل احمد صدیقی کا مضمون «فارسی بین تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ» معلومات افزا ہے۔ «غالب کی شاعری میں عصری رجحانات» اور «غالب ہندوستانیت کے لباس» میں غالب کے عہد کے انتشار زدہ عوام کے جذبات و خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ دیوان غالب کے نسخۂ حمیدیہ سے متعلق عصمت جاوید اور عبدالقوی دسنوی کے مضامین فکر انگیز ہیں۔ اول الذکر کا مضمون خصوصاً کاوش سے لکھا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ نمبر غالبیـــات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے قابل قدر ہے۔

(ڈاکٹر) آدم شیخ

ایڈیٹر : عبدالرزاق قریشی

پرنٹر پبلشر سیدشہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸شیفرڈ روڈ، بمبئی۸ میں چھپوا کر مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۸۲ دادا بھائی نوروجی روڈ کے لئے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ اپریل ۱۹۶۹

جلد ۲۰	اپریل ۱۹۶۹	شمارہ ۲

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	عبدالرزاق قریشی	۲
۲	بکٹ کہانی	تنویر احمد علوی	۵
۳	لفظ گرتی کی قرأت	دیوی سنگھ چوہان	۲۰
۴	تحقیق کے مسائل	گیان چند	۲۸
۵	منیر شکوہ آبادی	ذاکر حسین فاروقی	۴۲
۶	آفتاب ہند	احمر لاری	۸۵
۷	شعر و زبان	ذکیہ انجم	۶۹
۸	تبصرے		۷۵

شذرات

نوائے ادب کے مقاصد میں سے ایک مقصد، اور یقیناً اہم مقصد، دکن و گجرات کے قدیم اردو ادب سے متعلق مضامین کی اشاعت ہے۔ ابتدا ہی سے اس کے اکثر شماروں میں دکنیات سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ چند مضامین گجرات کے اردو ادب سے متعلق بھی شائع ہوئے ہیں۔ لیکن رسالہ اپنے مقصد میں کلیتہً کامیاب نہیں رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری رسالے سے زیادہ ان محققین پر ہے جن کا میدان قدیم اردو ادب ہے۔ اس شذرہ کے ذریعہ ان سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں نوائے ادب سے تعاون کریں تاکہ وہ اپنے اس مقصد کو اطمینان بخش حد تک پورا کرسکے

اردو کمیٹی (بمبئی) کا آل انڈیا اردو کنونشن دسمبر ۱۹۶۹ع کی آخری تاریخوں میں ہوا۔ اس میں اردو کے ادیبوں، شاعروں، ہمدردوں وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کی دوسری کئی زبانوں کے ادبا، شعرا وغیرہ نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی اور سب نے متفقہ طور پر اردو کی جائز حقوق طلبی کی حمایت و وکالت کی۔ کنونشن کا افتتاح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کیا۔ ان کی خدمت میں ایک میمورنڈم پیش کیا گیا جس میں ان سے اردو کے حقوق کی پامالی شکایت کی گئی اور یہ درخواست کی گئی کہ دستور ہند کی رو سے ان کی حکومت اردو کے جائز حقوق کو تسلیم کرے۔ وزیر اعظم نے جواب میں کنونشن سے ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن اپنی سیاسی مجبوریوں کی بنا پر کسی قسم کا یقین دلانے سے مجبوری ظاہر کی۔ انھوں نے کنونشن کی ہمت افزائی کے طور پر یہ بھی کہا کہ اردو کی تحریک کو جاری رہنا چاہئیے۔ ایک پختہ کار و ہوشمند سیاستداں کی حثیت سے انھوں نے یہ اچھا مشورہ دیا کہ یہ آواز مختلف گوشوں سے اٹھے، یہاں تک کہ دہقانوں اور کسانوں کے حلقے سے بھی اٹھے۔ کنونشن کو مجموعی حیثیت سے کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ اس سے اردو والوں میں زندگی کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اردو کو ملک کی دوسری زبانوں کے ادیبوں، شاعروں وغیرہ کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوئی۔

اردو دوستوں کے ایک طبقے کو بہر حال اس وجہ سے مایوسی ہوئی کہ وزیراعظم نے کنونشن کو کسی قسم کا یقین نہیں دلایا۔ کنونشن ہی کی ایک نشست

میں وزیر داخلہ یشونت راؤ چوہان نے بتایا کہ ایک وقت جب مرہٹی زبان کے سامنے بھی تقریباً یہی مسائل تھے اور اسی قسم کی دشواریاں تھیں۔ لیکن مرہٹی والوں نے حکومت کی مدد کے بغیر ان مسائل کا حل تلاش کیا اور ان دشواریوں کو دور کیا۔ وزیر داخلہ کے اس بیان پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ مرہٹی کے سامنے اردو کے جیسے مشکل مسائل اور سخت دشواریاں، خصوصاً روکاوٹیں، نہیں تھیں۔ مگر اردو کا حلقہ مرہٹی سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کے وسائل بھی بُرے نہیں ہیں۔ کمی در حقیقت لگن کی ہے۔ لگن ہو تو حکومت کی مدد اور سرپرستی کے بغیر بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مرہٹی کے علاوہ بنگالی کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ اہل بنگال نے حکومت کی مدد سے بے نیاز ہو کر بنگالی زبان کو فروغ دیا اور اس کے ادب کو بلند معیار پر پہنچایا۔ بنگال کے جادوگروں اور مہاراشٹر کے سورماؤں سے اردو والوں کو سبق لینا چاہئے۔

حکومت اردو کو حقوق دے گی لیکن زبان کو فروغ دینا اور علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کرنا خود اردو والوں کا کام ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کی تمام مقبولیت، صلاحیت اور لسانی زرخیزی کے باوجود اس کے علمی سرمائے میں بڑی کمی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ابھی تک اردو ادب کی کوئی مفصل و مستند تاریخ مرتب نہیں ہوسکی۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، کو اس کام کے لئے ایک معتدبہ رقم کی منظوری دی تھی۔ مگر اس کی صرف پہلی جلد تیار ہوسکی اور وہ بھی غلطیوں سے بھری ہوئی۔ قواعد میں مولوی عبدالحق کی مرتب کردہ کتاب حرف آخر بن کر رہ گئی ہے۔ اعراب و املا کی طرف توجہ نہ کرنے کے برابر کی گئی ہے۔ قدیم اساتذہ کے کلیات و دواوین کے صحیح اڈیشن بہت کم ملتے ہیں۔ تقریباً یہی حال قدیم اردو کی نثری کتابوں کا ہے۔ یہ سارے کام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی ان کی طرف توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ اردو میں رسالے تو بہت نکلتے ہیں، مگر علمی رسائل کی کمی کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے سائنس اور معاشیات کے رسالے انجمن ترقی اردو، ہند، کی طرف سے نکلتے تھے، لیکن مدت ہوئی کہ وہ بند ہو چکے ہیں۔ ایسا کوئی رسالہ نہیں جس میں صرف تاریخی تحقیقات شائع ہوتی

ہوں . اردو کی یہ چند کمزوریاں مثال کے طور پر پیش کی گئی ہیں ، ورنہ ان کی فہرست خاصی طویل ہوسکتی ہے . ان کمزوریوں کو دور کرنے ، زبان کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے اور علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کرنے کی ذمہ داری خود اردو والوں پر ہے . اس سلسلے میں نگاہیں سب سے پہلے اردو کی سب سے پرانی اور سب سے بڑی انجمن انجمنِ ترقی اردو ، ہند ، کی طرف اُٹھتی ہیں. لیکن اس پر پچھلے چند برسوں سے جمود طاری ہے . اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑانے کی ضرورت ہے . اور پھر مولوی عبدالحق جیسے مخلص ، حوصلہ مند اور ایثار پیشہ سکریٹری کی حاجت ہے . انجمن اساتذۂ اردو ، جامعات ہند سے یونیورسٹی کے حلقے میں کافی کام کی توقع کی جا سکتی ہے . کالجوں اور دانشگاہوں کے اساتذہ انفرادی طور پر بہت کچھ کرسکتے ہیں . شرط صرف لگن کی ہے .

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ اردو زبان و ادب کو اعلا سطح پر فروغ دینے کے نقطۂ نگاہ سے تھا . عام سطح پر بھی اردو والوں کو بہت کچھ کرنا ہوگا . سچ تو یہ ہے کہ یہ اول الذکر سے زیادہ ضروری اور اہم ہے ، کیونکہ جب تک درخت کی جڑیں مضبوط نہ ہوں ٹہنیوں کو سرسبز رکھنے کی ساری کوششیں بے سود ثابت ہوں گی. اردو کے زیادہ سے زیادہ ابتدائی مدرسے کھولے جائیں. اپنے بچوں کو اردو لازمی طور پر پڑھائی جائے . ثانوی مدارس میں اگر اردو پڑھانے کا انتظام نہیں ہے تو گھر پر اس کا بندوبست کیا جائے . بالغوں کو اردو پڑھانے کے لئے کلاسیں جاری کی جائیں . گشتی لائبریریوں کا انتظام کیا جائے . یہ اور اس قسم کے اور بہت سے کام اردو والوں کے کرنے کے ہیں . عام سطح پر اردو کو فروغ دینے میں انجمن ترقی اردو ، ہند ، کی شاخیں اپنے اپنے حلقے میں کافی کام کرسکتی ہیں .

آہ ! برٹرنڈ رسل

ایک عظیم فلسفی ، ایک ماہر ریاضیات ، ایک نامور مصنف .

ایک پیامبر امن ، ایک بلند مرتبہ انسان

دنیا سے اٹھ گیا .

* تنویر احمد علوی

بکٹ کہانی

(مصنفہ مفتی الہیٰ بخش کاندھلوی)

بکٹ کہانی کا نام آتے ہی ذہن افضل جھنجھانوی ثم پانی پتی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جن کی مشہور نظم بارہ ماسہ (بکٹ کہانی) کا ذکر ایک سے زیادہ قدیم تذکروں میں موجود ہے[1] بعض اہل تذکرہ نے اس کی شہرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے قبول خاطر اور لطف سخن پر بطور خاص اپنے استعجاب کا اظہار کیا ہے مثلاً قائم نے لکھا ہے :

« از آنجا کہ قبول بی سبب ورد بی غضب خاصۂ جناب ازلی است تصنیفاتش بمرتبۂ مؤثر دلہاست کہ از حیز تحریر و تقریر متجاوز است . »[2]

ان تذکروں کا قاری کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو نظم اپنی قدیمانی زبان اور غیر کلاسیکی انداز بیان کے باوصف میر و مرزا کے عہد میں بھی جو قدیم اردو شاعری کا دور زریں ہے ، اتنی مقبول اور مشہور رہی ہے ، ریختہ گوئی کی تاریخ اس کی روایت سے اتنی بیگانہ کیوں ہے اور اس طرح کی اور نظم کے ذکر خیر سے ہمارے تذکرے کیوں خالی ہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ ریختہ گوئی کے ایسے حصے پر جس کا رنگ و آہنگ اس دور کی معیاری شاعری سے الگ ہے. ہمارے تذکرہ نگار پوری توجہ نہیں دیتے

---

۱ عقون نکات ، قائم چاندپوری ، ص۳ تذکرۂ شعرائے اردو، میرحسن ، ص۴ مجمع الانتخاب ، شاہ کمال ورق ۲۲ الف
طبقات شعرائے ہند ، مولوی کریم الدین ، ص ۲۶۹
گلزار ابراہیم مع گلشن ہند ص ۲۸

۲ عقون نکات ص ۳

* ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ام ، اے، پی اچ ، ڈی ، علیگ استاد اردو ، دہلی یونیورسٹی ، دہلی ، مصنف ذوق

خود اردو شاعری میں ہندی اصناف کے تجربوں پر ہنوز کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔

افضل کی بکٹ کہانی چھپ گئی ہے۔ اس کے فاضل مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خان نے صرف ایک اور بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی کا ذکر کیا ہے جو عبداللہ انصاری کی تالیف ہے اور جس کا زمانۂ تصنیف سنہ ١٢٣٩ مطابق سنہ ١٨٢٣ کے آس پاس ہے[1]۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

«انیسویں صدی (عیسوی) کے آغاز میں افضل کے سلسلہ میں ایک اہم حوالہ افضل کے ایک عقیدت مند اور ہم مشرب عبداللہ انصاری کے بارہ ماسہ میں ملتا ہے.. آنے والی نسلیں شاہ افضل کا ذکر کس عقیدت سے کرتی رہی ہیں اور اس کی بکٹ کہانی کی کس قدر دھوم رہی ہے اس کا اندازہ عبداللہ انصاری کے بارہ ماسہ کے ان ابتدائی اشعار سے ہوتا ہے جس (جن؟) میں انہوں نے افضل کو خراج تحسین پیش کیا ہے:

سراسر اہل عرفاں شاہ افضل نہایت کامل ویکتا و اکمل
انھوں نے اک بکٹ لکھی کہانی کیا جس میں بیاں سوز نہانی
بکٹ پیچیدہ رشتہ ہے برادر سمجھ لے رہ طریقت کو سراسر
زنانی بولی ہے اس کی پیاری جسے سن کر ہو دل میں بےقراری[2]

عبداللہ انصاری نے اپنی اس بکٹ کہانی کی بحر بھی وہی رکھی ہے جو افضل کی بکٹ کہانی کی تھی۔ ایک اور روایت (بکٹ کہانی) کا ذکر بلوم ہارٹ نے اپنی فہرست مخطوطات (مخزونہ انڈیا آفس لائبریری، لندن) میں کیا ہے۔

"An other poem on the same subject and having the same title written by Ilahi Bakhsh of Kandhla has been published at Delhi in 1868 and at Lucknow in 1881 end:

چو شد آخر ازین مشکل کہانی کہوں نے قدر اس دکھ کی نہ جانی
بیاد دلربا باخوش حال می باش کہی افضل کہی گوپال می باش

---

١ اس کا ایک قلمی نسخہ شعبہ مخطوطات، آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ میں موجود ہے۔ (بکٹ کہانی، مقدمہ، ص ٦-٣)

٢ بکٹ کہانی، مقدمہ، ص ٧- ٦-٣

٣ 170 A catalague of Persian, Hindustani manuscripts preserved in the Library of India Office by B. Hardle

آخر کے دونوں شعر افضل کے ہیں اور مفتی الٰہی بخش کی بکٹ کہانی سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک طرح کا تسامح ہے۔ لیکن جس بکٹ کہانی کا ذکر الٰہی بخش آف کاندھلہ کے تعلق سے کیا گیا ہے وہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کی تصنیف ہے جس کے دو نسخے راقم الحروف کے پیش نظر ہیں۔ ایک نسخہ جو اپنی طباعت کے اعتبار سے زیادہ قدیم ہے مطبع احمدی کا مطبوعہ ہے یا اس کا سرورق یہ ہے:

ہزار ہزار شکر اس خدائے لایزال کو۔ یہ دونوں مثنویاں

ایک تو

بارہ ماسہ

عرف

بکٹ کہانی

اور دوسری

سمجھ بوجھ

مطبع احمدی میں ظفر علی خاں کے اہتمام سے طبع ہوئیں۔

سن طباعت درج نہیں۔ لیکن کاغذ اور کتابت کے انداز سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کی طباعت پچھلی صدی عیسوی کے ربع ثالث سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا

---

۱ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قصبہ کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی کے ایک صاحب علم و فضل خاندان کے فرد فرید تھے سنہ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی درسیات کی تحصیل اپنے خاندان کے بزرگوں سے کی۔ بعد ازاں تکمیل علوم و فنون کے لئے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ وہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غیر معمولی ذہانت، علمی شوق و شغف اور مطالعہ کی کثرت کے نتیجہ میں شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوئے اور مختلف مباحث میں حصہ لینے لگے۔ ایسی ہی ایک محفل میں نواب ضابطہ خان سے ان کا تعارف ہوا اور تکمیل درسیات کے بعد وہ شاہ صاحب کی اجازت خصوصی کے ساتھ، اس کے ہی ایک مصاحب کی حیثیت سے رہے۔ انہوں نے ایک طویل مدت تک ریاست بھوپال میں امور مذہبی کے صدر اور مفتی کی حیثیت سے کام کیا اور اعزاز و اکرام پایا

مفتی صاحب نے زندگی کا بیشتر حصہ اپنے وطن مالوف کاندھلہ میں گذارا۔ انہوں نے مختلف موقعوں پر کانپور بریلی، خورجہ، سہارن پور اور تھانہ بھون کا بھی سفر کیا۔ وہ بیاسی سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۱۲۴۵ھ بوقت مغرب راہی ملک بقا ہوئے۔

مفتی صاحب اپنے عہد کے متداول علوم پر قدرت رکھتے تھے۔ طب میں انہیں مہارت خاص تھی۔ وہ اہل حال و قال اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ مختلف علمی و ادبی موضوعات پر کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حالات مشائخ کاندھلہ، ص ۱۲۹-۵۰)

سائز موجودہ صورت میں ساڑھے پانچ × ساڑھے آٹھ انچ ہے۔ کاغذ ہلکے بادامی رنگ کا ہے۔ دونوں مثنویات کو ملا کر صفحات کی تعداد ۳۲ بکٹ کہانی پورے ۲۱ صفحات پر آئی ہے۔ ۳۲ سطری ہے۔ مگر دوسرے صفحہ پر جہاں سے اشعار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے صرف ۱۵ شعر درج ہیں۔ ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے۔

اسی اشاعت کے سرورق یا خاتمہ پر کہیں مؤلف کا نام نہیں آیا۔

دوسرا نسخہ مطبع نول کشور کا چھپا ہوا ہے۔

دونوں نسخوں میں جہاں تک اصل تصنیف کا سوال ہے تعداد اشعار مساوی ہے۔ لیکن دوسرے نسخہ میں اشعار مناجات کے عنوان سے ۱۳ شعر اور بھی درج ہیں جن کی بحر دوسری ہے۔ آغاز کا شعر یہ ہے:

اے خدائے قادر بے چون و چند	تیرے قبضہ میں ہے سب پست و بلند

اور گیارہ شعر کے بعد اختتام اس شعر پر ہوا ہے:

کر عطا دل کو میرے اپنا ہی درد	ہو ہوائے حرص و دنیا دل سے سرد

اگرچہ مطبوعۂ مطبع احمدی کے نسخہ کی قدامت پر کوئی خارجی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی لیکن طرز املا اور رسم کتابت کو داخلی ثبوت کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں مجھے کو (مجے) ارر میں نے کو (منے) لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کاف ہندی پر دوسرا موکز موجود نہیں۔ الفاظ ملا کر لکھے گئے ہیں۔ ٹ کو (ت ؕ) دو نقطوں کے ساتھ املا کیا گیا ہے۔ یہ باتیں نسخۂ مزبور کی قدامت پر دال ہیں۔ نسخۂ مطبوعہ نول کشور میں یہ صورت موجود نہیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کار پردازان مطبع کی فرد گذاشت کا نتیجہ ہو یا پھر کسی قانونی گرفت سے بچنے کے لئے انہوں نے ایسا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس نظم کی اشاعت اول ہو اور خود مفتی صاحب کے اہل خاندان نے اُسے مفتی صاحب کے مرتبہ سے کم تر سمجھ کر ان کے نام کے ساتھ اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھا ہو۔ یہ احتمال ضعیف کچھ اس وجہ سے بھی پیدا ہوتا ہے کہ مولوی احتشام الحسن صاحب کاندھلوی نے جو مفتی صاحب کے اولاد میں سے ہیں اپنی کتاب حالات مشائخ کاندھلہ میں حضرت مفتی صاحب کے حالات و کمالات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن ان کی تصانیف کے سلسلہ میں انہوں نے اس کتاب کا نام نہیں لیا، بلکہ

ے ایک خط میں اس سے اپنی لا علمی کا اظہار کیا۔ مگر یہ مفتی صاحب ہی
، تصنیف ہے۔ اس کا ثبوت بلوم ہارٹ کی فہرست سے بھی فراہم ہوتا ہے، اور
۔ اس کے ایک دوسرے مطبوعہ نسخے سے بھی جس کے خاتمۃ الطبع میں اس
، صراحت موجود ہے:

«الحمد للہ کہ یہ کتاب بکٹ کہانی تصنیف مولوی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کی ماہ مئی سنہ ۱۸۸۱ عیسوی کو مطبع فیض منبع منشی نول کشور صاحب واقع کانپور میں باہتمام لالہ بشیشر دیال صاحب چھپی۔»

یہ کتاب صرف ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ کا رنگ زردی مائل بادامی
ے اور اسے ۶ × ۱۲ انچ کی تقطیع پر چھاپا گیا ہے۔

بارہ ماسہ جس کی صورت میں یہ بکٹ کہانی پیش کی گئی ہے ایک ہندی
نف سخن ہے جس میں ایک ایسی عورت (ہندو) کی جانب سے بیان غم فراق یا
برھرن» ہوتا ہے جو اپنے شوہر کی جدائی میں سال میں بارہ مہینے رو رو گذارتی
ے صبح و شام اس کی بیقراریاں بڑھتی جاتی ہیں اور وہ ہر ساعت بلکہ ہر لمحہ تڑپ
پ کر اپنے «بدیسی پیا» کو یاد کرتی ہے اور اپنی سکھیوں سہیلیوں اور پڑوسنوں
کو اپنی داستان الم سناتی ہے۔ موسموں اور مہینوں کا آواگون اس کی روح مجروح
۔ نت نئے ستم ڈھاتا ہے۔ وہ دوسری عورتوں کو اپنے اپنے شوہر کے ساتھ ہنستے
بلتے دیکھتی ہے، مگر ان کی خوشیوں میں شریک نہیں ہو سکتی بلکہ انہیں اس
طرح سکھ کرتے دیکھ کر اس کا دکھ بڑھ جاتا ہے کہ اس کے اپنے من کی
نگنائی سونی ہے اور سیج کے پھول اس کے لیے کانٹے بن گئے ہیں۔ تیج تہوار
کے موقع پر یہ غم جدائی اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ جب اپنی سکھی سہیلیوں سے کہہ
کہہ کر ہار جاتی ہے تو برہمنوں پنڈتوں، اماموں، ملانوں کے پاس جاتی ہے کہ
ہی کوئی تدبیر کریں، کوئی جادو چلائیں کہ اس کا پیتم جو نہ جانے کہاں چلا
گیا ہے، اس کے گھر واپس آ جائے۔ موسم کی کیفیات کا بیان غم کی شدت
کے اظہار کے لیے ہوتا ہے جیسے سرمد شہید کے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں:

٭ مکتوب بنام مضمون نگار مؤرخہ ۲۲ اگست ۱۹۶۹ء۔

سرما بگذشت و ابن دل رار ہمان
گرما بگذشت و این دل زار ہمان
اللہ ہمہ سرد و گرم عالم
برما بگذشت و این دل زار ہمان

آہ و بکا کے ساتھ اس صدمۂ جاں کاہ کا اظہار سال کے گیارہ مہینے تک مسلسل ہوتا رہتا ہے ۔ آخر جب بارھواں مہینہ بھی ختم ہونے کے قریب آتا ہے تو آنسوؤں کا تار ٹوٹ جاتا ہے ۔ دل کی دھڑکن ٹھہر جاتی ہے اور ڈھونڈنے والے کو اس کی منزل مل جاتی ہے ۔ کوئی آکر چپکے سے یہ خبر سنا دیتا ہے کہ وہ آرہا ہے ۔ اور جب وہ آجاتا ہے تو سارے غم خوشیوں میں بدل جاتے ہیں اور جذبات کے جن پھولوں پر اوس پڑ گئی تھی وہ پھر کھل اٹھتے ہیں ۔

کسی ایسی ہندو عورت کی داستانِ فراق اور وہ بھی اس کی اپنی زبانی پراکرت یا بھاشا ہی میں بیان ہو سکتی ہے ، اور ہندی الفاظ کا سہارا لے کر ہی اس کے نسوانی جذبات ، اور اس کے اندر چھپی ہوئی ایک ہندوستانی عورت کے کردار کو اُبھارا جا سکتا ہے ۔ ایک ایسی عورت کے کردار کو جسے پڑھنا لکھنا بھی نہیں آتا اور جس کا ماحول قصبات اور دیہات کا ماحول ہے ، مہذب شہروں کا نہیں ۔ چنانچہ اس کی زبان اپنی اساسی صورت میں وہ کھڑی بولی ہے جو مغربی یو ، پی کے اضلاع میرٹھ ، مظفر نگر اور سہارن پور میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جسے یہاں کی گھریلو زبان کہا جا سکتا ہے ۔ عبداللہ انصاری کی طرح زیرِ نظر بکٹ کہانی کے مولف نے بھی اُسے « زنانی بولی » قرار دیا ہے ۔

زباں ہر چند ہے ساری زنانی
و لیکن دردِ دل کی ہے کہانی

زنانی بولی سے مراد یہاں ریختی کا انداز نہیں ہے بلکہ ایک دیہاتی عورت کا فطری لب و لہجہ ہے ، اس لئے کہ قصبے اور دیہات کی سطح پر زنانی اور مردانی بولی میں فعل کی تذکیر و تانیث کی بعض صورتوں کے علاوہ کوئی ایسا فرق نہیں ہوتا جس کی وجہ سے دونوں کی بولی کو الگ الگ خانوں میں بانٹا جا سکے ۔

اس بکٹ کہانی کی زبان کا مطالعہ ہمیں کھڑی بولی کے اس روپ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو اردو کی اصل روپ ریکھا ہے۔ اس پر ہریانوی اور برج کا بھی اثر ہے اور پنجابی اور میواتی کا بھی۔ لیکن اس کا رنگ روپ اور آکار اپنا ہے۔

مفتی صاحب کی تعلیم و تربیت کا زمانہ اب سے دو صدی پہلے کا دور ہے اس وقت سے اب تک زبان میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں قصباتی اور دیہاتی سطح پر اتنی نہیں آئیں جتنی شہری اور ادبی سطح پر آئی ہیں اس اعتبار سے بھی اس کی زبان کا مطالعہ کھڑی بولی کی اساس اور بعض مراحل ارتقا کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس سے بعض لسانی رشتوں کی تفہیم میں بھی مدد ملتی ہے اور زبان کی ترقی کی سمت و رفتار کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض اجزا جو اس وقت جزو زبان تھے اج اس علاقے کی بولی سے نکل گئے ہیں اور بعض ابھی تک اس کی زمین میں جڑ پکڑے ہوئے ہیں۔ یہ صورت حروف، افعال، اور اسما سب میں کم و بیش مشترک ہے

بکٹ کی زبان پر مختلف پراکرتوں کے جو اثرات ہیں ان میں ہریانوی اور برج کے اثرات پنجابی اور اودھی کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہیں۔ پنجابی کا اثر بولی جانے والی زبان میں جس حد تک محسوس کیا جاسکتا ہے اتنا بکٹ کی زبان میں نظر نہیں آتا۔ مثلاً، الفاظ پر تشدید لگانے یا پھر فعل ماضی کی صورت میں «الف» سے پہلے «ی» لگانے کی مثالیں اس میں نہیں ہیں۔ (اول الذکر کی صرف ایک مثال «سنگار» ہے)۔ اس کے مقابلے میں فعل حال کی صورت میں ہریانوی اثر جو بکٹ میں ملتا ہے اور خودبریختہ میں بھی، میر کے زمانے تک موجود رہا ہے۔ وہ اب یہاں کی کتابی بولیوں میں مفقود ہے۔

آوتا ہے، آوتے ہیں، لاوتا ہے، پیوتی ہوں، جیوتی ہوں، افعال میں «و» کا استعمال افضل کے علاوہ جعفرزٹلی، شاکرناجی اور آبرو کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایسے افعال کو بے تکلف استعمال کیا ہے۔ لیکن مقامی طور پر اب یہ استعمال نہیں ہوتے۔ ممکن ہے یہ متقدمین کی زبان کے تتبع اور دہلی میں مصنف کے قیام کا نتیجہ ہو۔ اس علاقے کے لوک گیتوں میں بھی یہ صورت نہیں ملتی۔

یہاں برج کے جو اثرات بکٹ کی زبان پر ہیں وہ مقامی بولیوں اور یہاں کے گانوں اور گیتوں میں اب بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً، بعض افعال و الفاظ میں طویل مصمتے کا استعمال اب بھی ہوتا ہے، اور لگنے کو «لاگنا»، بجنے کو «باجنا»، پتے کو پات اب بھی کہا جاتا ہے۔

برج اور بعض دوسری پوربی بولیوں میں «ل» کی آواز «ر» کی آواز سے بدل جاتی ہے، اس نظم میں بھی ایک سے زیادہ موقعوں پر ہولی کو «ہوری»، جلوں کو «جروں»، کالی کو «کاری» اور «رنگ ڈالیں» کو «رنگ ڈاریں» کہا گیا ہے۔ لوگ گیتوں میں یہ صورت اب بھی ملتی ہے۔ لیکن بولی ٹھولی میں اب اسکی تنبیہ نہیں کی جاتی تاہم «بھیگیں» کو «بھیجیں» اور بھاگنے کو «بھاجنا» اب بھی کہا جاتا ہے جو برج کے باقی رہنے والے اثرات کی غمازی کرتا ہے۔

بکٹ میں بعض لفظوں کی جمع بھی برج کے قاعدے سے بنائی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ پاؤں کی جمع پاویں اور بچھوے کی جمع بچھوں استعمال ہوئی ہے۔ جمع بنانے کا یہ طریقہ کھڑی میں رائج نہیں۔

«لینا اور دینا» بمعنی لیا اور دیا برج میں لینو اور دینو ہے۔ ممکن ہے یہ اپنی موجودہ شکل میں کسی پوربی بولی سے ماخوذ ہو۔ ہم کی جگہ ہمن کی ضمیر کا استعمال بھی برج یا کسی دوسری پوربی بولی کا مرہون منت ہے:

بھرت ہیں (بھرتے ہیں)، کرت ہیں (کرتے ہیں)، جرت ہوں (جلتی ہوں)، دھرت ہیں (دھرتے ہیں)، بھئی (ہوئی)، بھیا (ہوا)، بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ جیسے افعال حال بھی پوربی بولیوں کے اثرات کے غماز میں کھڑی کے علاقے میں ان کا رواج نہیں۔

برج اور دوسری پراکرتوں کے اثرات اسما و افعال کے علاوہ ضمائر اور حروف کی شکل بھی بکٹ میں موجود ہیں۔

کھڑی میں مجھ اور تجھ کا استعمال ضمیر مفعول کی صورت میں بڑی، ے، اور، کو، کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن بکٹ کی زبان میں یہ اضافہ عمل میں نہیں آتا۔ اُکیلی چھوڑ کرکے مجھ نہ جاؤ۔

یہ اور اس نوعیت کی اور بہت سی مثالیں بکٹ میں مل جاتی ہیں۔ مجھ اور تجھ کا استعمال اضافی حالتوں میں کھڑی میں نہیں ہوتا۔ لیکن بکٹ میں مجھ ساتھ،

مجھ پاس، مجھ درپہ، مجھ دل اوپر جیسی مثـــالیں بہت سی مل جائیں گی. اضافی حالت میں ، کے ، علامت اضافت کے ساقط ہوجانے کی مثالیں بھی ان مثالوں کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں. جیسے باغ اندر، پی پاس، اوس پاس، پیارے ملن کا یہ صورت کھڑی میں مفقود ہے. ہاں غالب کے زمانہ تک اردو میں اس کا رواج رہا ہے.

میرے تئیں اور اس کے تئیں کا استعمال ریختہ میں ایک زمانہ تک مروج رہا ہے. اس نظم میں بھی اس کی مثالیں مل جائیں گی. ایک موقع پر پوجنے کے ، تاگ ، بھی آیا ہے. کھڑی بولی میں تئیں یا تاگ کا کوئی وجود نہیں.

بکٹ کی زبان پر دوسری بولیوں کے یہ اثرات پراکرتوں کے ایک دوسرے سے رشتوں اور رابطوں کی نشان دہی کرتے ہیں. لیکن جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، اس کی زبان کی اساس کھڑی بولی پر ہے. اس کھڑی بولی پر جو اس علاقہ کے دیہات اور قصبات کی عوامی زبان ہے. یہی وجہ ہے کہ باعتبار زبان و بیان اس کا بڑا حصہ دیہاتی بولی کے بے لاگ حسن اور اس کے تر و تازہ رُخ کو پیش کرتا ہے. اس کا ایک نمایاں پہلو بعض ایسے مصادر کے مشتقات بھی ہیں جن کا استعمال دیہات و قصبات تک محدود ہے. مثلاً پھرنا (پھننا)، رمنا (مل جانا، گم جانا)، بلنا (جلنا)، بالنا (جلانا)، میلنا (ملانا)، مولنا (ٹوٹنا)، بہارنا (جھاڑو دینا)، لانا (لگانا)، بسرانا (نظر انداز کرنا)، بسرنا (بھول جانا)، دہنا (گلانا)، دگنا (آگ جلنا) ان میں سے بعض مصادر کے استعمال اردو میں قدیم محاورات میں ضرور مل جاتا ہے. علاوہ بریں بھوانے کو (بھجانا) اور کہلوانے کو (کھانا) اب بھی کہا جاتا ہے. یہ صورت بکٹ کے علاوہ افضل کے یہاں بھی ملتی ہے اور متقدمین شعرائے اردو کے یہاں بھی.

اس علاقہ کی زبان یا قدیم کھڑی بولی کا اثر بکٹ کی زبان پر سب سے زیادہ فعل حال کی صورت میں ملتا ہے. کھڑی کے دیہی علاقوں میں فعل مضارع کو حال کے معنی میں بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے. یہی صورت زیر نظر نظم میں بھی ہے. سوویں (سوئی ہیں)، کریں (کرتی ہیں)، رووٗں (روتی ہوں)، بھیجیں (بھیگتی ہیں) جیسی مثالیں یہاں تلاش کی چیز نہیں. علاوہ بریں مضارع کے اصل صیغوں پر ہے، ہو، ہوں، ہیں، علامتوں کا اضافہ کر کے فعل حال بنایا جاتا ہے. جیسے، پھرے ہے (پھــــرتا ہے)، کروں ہوں (کرتی ہوں)، جرو ہوں

(جلتی ہوں) ، رہو ہو (رہتی ہو) فعل حـــال کی بہ صورت ذوق کے زمانہ تک اردو شاعری میں بھی رائج رہی ہے ۔

فعل مستقبل بنانے کے لئے یہاں کی عوامی زبان میں بالعموم گا، گے، گی، لگانے کے بجائے کا، کے، کی، بڑھایا جاتا ہے اور اس سے پہلے 'نے' علامت مصدری موجود ہوتی ہے ۔ جیسے 'وہ نہیں کانے کا'، 'میں نہیں کرنے کی'، 'تم نہیں پانے کے'، 'وہ نہیں جانے کی'، وغیرہ وغیرہ ۔ بکٹ میں بھی اس کی مثالیں جگہ جگہ مل جائیں گی ۔ اس کے علاوہ مضارع کے صیغے بھی مستقبل کے معنوں میں استعمال کئے جاتے ہیں زیر نظر نظم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں ۔ مثلاً اری اس درد کے مارے نہ جیئوں ۔

ماضی استمراری کے افعال بھی یہاں کی بولی میں مروجہ اردو سے کچھ الگ ہوتے ہیں اور اُن کی علامت 'تا تھا، تے تھے'، یا 'رہے تھے'، کے بجائے صرف 'تھا تھی، تھے وغیرہ ہوتی ہے اور اُسے مضارع کے صیغوں پر بڑھایا جاتا ہے ۔ جیسے کہا جا تھا (کہا جاتا تھا) ، آ جا تھا (آ جاتا تھا) ، گذر جا تھی (گذر جاتی تھی) روؤں تھی (روتی تھی) ، بکٹ کی زبان بھی یہی ہے ۔ ایک آدھ موقعہ پر بکٹ میں 'میں' کو جو اب ضمیر فاعلی ہے ۔ ضمیر مفعولی کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے ۔ میں یونہی چلتی چلاتی دلی کی مثال ہے ۔

'نے' علامت فاعلی کے طور پر اس علاقہ کی عوامی زبان میں موجود نہیں بکٹ میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ۔ ہاں ایک موقع پر 'نے' کو علامت مفعول کے طور پر استعمال کیـا گیا ہے جس کا رواج یہاں کی بولیوں میں ہے ۔ اردو میں غائب ضمیروں میں مضاف الیہ اور مضاف کے مابین حرف کا، کے، کی، علامت اضافت کے طور پر استعمال ہوتا ہے ۔ لیکن بکٹ میں اس کے سقوط کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں ۔ اس کے مقابلہ میں جار اور مجرور کے مابین 'کے' کا اضافہ کیا جاتا ہے ۔ جیسے 'عبارت کے اوپر'، وغیرہ ۔ فعل کے امـدادی جزو کے طور پر 'کر' یا اس کے علاقہ کی بولی میں بہت کم مستعمل ہے ۔ یہی صورت بکٹ میں بھی ملتی ہے ۔ سب مل مناویں (سب مل کر مناویں) ، میں رو رو بہایا (رو رو کر بہایا) ، منت کر مناؤں (منت کر کے مناؤں) ۔ اس کے برعکس 'کر' کے ساتھ 'کے' کا اضافہ ایسے مواقع پر بھی ہوتا ہے جہاں ادبی زبان میں اس کو غیر ضروری

سمجھا جاتا ہے. اکیلی چھوڑ کر مجھ نہ جا: ہماری زبان میں ، ہے ، اور ، ہیں ، زمانۂ موجود کی علامت اظہار کے طور پر آتے ہیں. لیکن اس علاقہ کے دیہات و قصبات میں ان کے ساتھ گا ، گے کا اضافہ بھی عمل میں آتا ہے اور ہے کی جگہ ، ہیگا ، اور ہیں کی جگہ ، ہنگے ، (ہینگے) بولتے ہیں. یہی صورت بکٹ میں بھی ملتی ہے. یہ قدیم اردو اور موجودہ دہلی کی کرفنداری میں موجود ہے.

پنجابی کی طرح کھڑی میں بھی بعض موقع پر «س» کی آواز «ہ» سے بدل جاتی ہے چنانچہ پاس دیہات و قصبات میں پاہ (پہ) کی صورت میں بولا جاتا ہے. اس نظم میں بھی پاس کو «پاہ» استعمال کیا گیا ہے جو ایک موقع پر ضرورت شعری کی وجہ سے «پا» ہوگیا ہے.

«کو» اردو میں علامت مفعول یا علامت ظرف زبان کے طور استعمال ہوتا ہے. لیکن اس کا «اب کو» بمعنی اب جیسی صورتوں میں استعمال دیہات و قصبات کے ساتھ مخصوص ہے. مثلاً

تمامی رین کو راگوں میں ریجھیں یعنی تمام رات

سجن گھر کو نہ آوے (سجن گھر نہ آئیے) ۔ گئی رات کو (کل رات کو)

کبھی «کو» کا استعمال حرف جار کے طور پر ہوتا ہے.

رہی میں پی کو سب کو بوجھ کر کے

تین کی ضمیر میر و مرزا کے عہد تک اس کا استعمال رہا. اب یہ متروک ہے. اس علاقے کی زبان میں اب بھی اس کا چلن عام ہے. بکٹ میں بھی ایک آدھ موقع پر یہ خبر آئی ہے.

اس علاقہ میں واحد رسم بول کر جمع ارر جمع بول کر واحد مراد لیا جاتا ہے. بکٹ میں دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں. مثلاً

بہت تعویذ اور منتر پڑھایا

لگا مت گ جلتی کے دلوں میں

اری ، اور ارے (ری رے) برج اور بعض دوسری پوربی بولیوں میں بھی صرف خطاب ہے، اس کا استعمال بکٹ میں بار بار بلکہ ہزار بار ہوا ہے.

دیہات میں کیوں کر کو تخفیف حروف کے ساتھ «کو کو» کہا جاتا ہے. اس کے مقابلے کا لفظ جو استعمال نہیں ہوتا «جیوں کر» ہے جسے دیہات میں

اسی قاعدہ تخفیف کے ساتھ «جو کر» بولا جاتا ہے. بکٹ میں اسی تلفظ کے ساتھ ان کا استعمال ہوا ہے ۔

بکٹ میں کھڑی اور بعض دوسری پراکرتوں کے اثرات آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں. اس کا اندازہ اس کی نفسیات پر ایک نظر ڈالنے سے بھی ہوسکتا ہے. اگر ایک طرف اس میں نیہہ (محبت) ، تپت (گرمی) ، شگن ، جتن، سکل (تمام) ، بکھم (بھیشم ۔ خوفناک) ، میگھ (بادل) ، بدیسا (پردیس) ، بچھوہا (وچھوہ ۔ جدائی) ، سکھ (تعلیم ۔ نصیحت) ، پھرن (پھوار) ، دوہ (دُکھ) ، دوس (دوش ۔ قصور) دوہیلی (دشوار) ، دیورا ، جیوڑا ، سکھڑا (سکھ) ، چھوھما ، چھوہ (غصہ) ، کنت (شوہر) وغیرہ. جیسے الفاظ آئے ہیں تو دوسری طرف اچھی بڑی تعداد میں نپٹ (بے طرح) ، لھوڑ (بہت اسی طرح) ، مرینا را (الگ) ، برانا (غیر) کولا (کونا). ڈانکنی (ڈنکنی بری عـــورت) وغیرہ جیسے خالص دیہاتی سطح پر استعمال میں لانے والے الفاظ یہی شامل ہیں اور اس کے ادبی اور لسانی مزاج کا پتہ دیتے ہیں ۔

ترکیب ہند کی مثالیں بھی بکٹ میں موجود ہیں. جیسے، مانند پانی ، ہنگام ہولی ، گھر بگھر وغیرہ . متقدمین کے یہاں اس طرح کی ترکیبیں عام تھیں ۔

بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں بھی اختلاف اردو پایا جاتا ہے ۔ مثلاً مقدور کو مونث استعمال کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں سیج ، بھیجتا اور ابتدا مذکر ہیں ۔

بعض ترکیبی افعال کا استعمال بھی محاورۂ اردو سے مختلف ہے جیسے، اکیلی کرنا (اکیلی چھوڑ دینا) ، تسلی کرنا (تسلی دینا) ، مسی کرنا (مسی لگانا) ، کاجل کر (کاجل لگانا) ، مور کوکنا (مور کا چنگھاڑنا) ، غل ڈالنا (شور مچانا) ، شگن منانا (شگون لینا) نذر بدنا (منت ماننا) ، خبر کہنا (خبر کرنا) . تمام کو ہر موقع پر تمامی لکھا ہے. لیکن ولیکن ہے. موسلا دھار کو موسل دھار کہا گیا ہے. گو یا کا لفظ دو موقع پر آیا ہے اور دونوں تخفیف کے رجحان کے تحت «گیا» کے تلفظ کے ساتھ استعمال ہوا ہے. کبھو (کبھی) اور کسو (کسی) کا استعمال میں ہوا ہے.

بکٹ کی زبان پر کھڑی بولی اور اس کے قدیمانہ انداز کے جو اثر ہے اس کا اندازہ گذشتہ صفحات میں پیش کئے ہوئے لسانی جائزہ سے ہوجاتا ہے. اس کے

اس انداز کے فقرے اور مصرع بھی اس کے قدیم طرز ادا کی نشاندہی ہیں۔

کس کام میرے (میرے کس کام آئے گا)؛ عمل اپنے سے؛ کرم اپنے سے؛ و (چاہتی ہو)؛ قیامت کے جو دن مجھ کتی کے؛ مرے بھاگوں لکھا ہے۔

یا

پپیہــاسی دنوں پی پی پکاروں
پیا سے مل کے گل کے جوں کھلوں گی
کلیجہ پھٹ امنڈ چھاتی کو آیا
جو تو پردیس جا تو ڈھونڈھ لاؤں
نہیں کوئی خبــر لینا سویرا
نہ تو جلتی کے اوپر پھوس لارے
پر اس میں درد کی ماری نہ جیئوں
اری گرمی میں کنت آتا سناری

قدیم ریختہ کا وہ اسلوب بھی اس میں برتا گیا ہے جس میں آدھا تہائی ع تو فارسی ہوتا تھا اور باقی حصہ اردو یا ہندی میں ترتیب پاتا تھا۔

قــرار از دل دریں موسم بگاری
چوں شبنم چشم پرنم میں رہی ری
بہ ہجراں شمع ساں از غم جروں ہوں

سے متعدد مصرع اس میں موجود ہیں۔

مصنف کے سامنے افضل کا بارہ ماسہ یا بکٹ کہانی رہی ہے اور اس ٍ کا تاثر ہی اس دوسری روایت کی تخلیق کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اس اندازہ شاعر کے اس اعتراف سے ہوتا ہے:

ستی ہوگی بکٹ تم نے کہانی   سب اوس کے خامہ کی آتش فشانی
ولیکن میں جو دیکھا اوسکو سارا   طبیعت نے مری اک جوش مارا
یہ آیا دل میں کہئے اک کہانی   بیاں ہو جس میں سوزِ دل نہانی

کچھ ایسے شعر بھی ہیں جو زیر نظر نظم میں شاہ افضل کی بکٹ کہانی سے جوں کے توں نقل ہوگئے ہیں۔ مثلاً

ستی جب مور کی آواز بن سوں   شکیب از جاں برفت ، آرام تن سوں

اری جب کوک کویل نے سنائی   تمـــامی تن بدن میں آگ لائی

بعض استاد معمولی سی تبدیلی کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ جیسے

شاہ افضل

سبھی سکھیاں پیا سنگ سکھ کرت ہیں   بن سی ناریاں سب دکھ بھرت ہیں

مفتی الٰہی بخش

سلونوں میں سکی سب سکھ کرت ہیں   سلونے بن اری ہم دکھ بھرت ہیں

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پہلی روایت کے مقابلہ میں دوسری روایت محض نقل روایت کی موضوع اور مواد کے اشتراک نے دونوں میں ہم آہنگی اور ہم رنگی ضرور پیدا کردی ہے۔ ایکن پہلی روایت کے مقابلہ میں دوسری روایت کچھ زیادہ نکھر اور سنور کر سامنے آئی ہے جس سے مفتی صاحب کی تحقیقی اور ادبی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے اور اسے اردو کے اس انداز کے شعری سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دوسری روایت میں ترتیب میں قدرے اختلاف ہے اور اشعار کی تعداد میں بھی۔ شاہ افضل کے یہاں حمد و نعت سب تالیف کے ابواب یا اشعار نہیں ہیں۔ مفتی صاحب کے یہاں ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ زبان کے ادبی معیار اور لسانی امتزاج کے الگ الگ معیاروں سے قطع نظر دونوں کی لسانی خصوصیات قریب قریب یکساں ہیں۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ افضل کا لسانی حلقہ بھی وہی ہے جو مفتی صاحب کا ہے اور اس اعتبار سے افضل کا اصلی وطن پانی پت کے بجائے جھنجھاں ہونا چاہئے۔ ان کی بکٹ کہانی کے مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے بیان کے مطابق بھی ان کے یہاں ہریانوی کے اثرات کم ہیں۔

> «افضل کا تعلق والد کی شہادت کے مطابق پانی پت سے تھا جو ہریانی کے علاقہ میں واقع ہے۔ لیکن افضل کی زبان ہریانوی کے اس قدر بھی لسانی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین کی زبان پر پائے جاتے ہیں۔[1]»

اس اعتبار سے شاہ افضل جمنا کے اُس پار (پانی پت) سے زیادہ اِس پار (جھنجھان) کے لسانی حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود مفتی صاحب کا وطن آبائی جھنجھان ہی ہے۔

---

۱ بکٹ کہانی مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ص ۲۹۷

* دیوی سنگھ چوہان

لفظ ' گَرتی ' کی قرأت

دکھنی زبان میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں الفاظ اپنی اصلی شکل میں قدیم سے رائج ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اساتذۂ زبان اُن الفاظ کی صحیح نس تاریخ جاننے کی اطمینان بخش کوشش نہیں کرتے۔ دکھنی کی کئی کتابیں اردو میں شامل ہیں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اس قس بعض کتابوں مثلاً' پھول بن '، ' معراج العاشقین '، ' مینا ستونتی '، ' پرت نامہ '، کلمۃ وغیرہ میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں ان کی اصل اور تاریخ پر ہم نے نوائ کے بعض شماروں میں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون میں لفظ ' گَرتی بحث کی جائے گی۔

' گَرتی ' کا لفظ دکھنی میں عام ہے۔ اس کا استعمال ملا وجہی کی س میں دو مرتبہ، دیوان ہاشمی بیجاپوری میں تین بار اور ملک الشعرا ملا غواص کلیات میں، میری معلومات کی حد تک دو دفعہ ہوا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ د کتابوں میں بھی اس لفظ کا استعمال ہوا ہوگا۔ چونکہ دکھنی زبان کی کتابوں کا متن ابھ اطمینان بخش طور پر متعین نہیں ہو پایا ہے اس لئے مذکورہ بالا کتابوں میں کہیں : لفظ کی صحیح قرأت نہیں دی گئی ہے۔ جب صحیح قرأت ہی متعین نہ ہو تو اس درست معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لفظ ' گَرتی ' کا مراٹھی میں زمانۂ قدیم سے چلن ہے۔ مراٹھی ویوتپتّی (मराठी व्युत्पत्ति कोश) میں کالکرنی نے اس لفظ کی اصل اور معنی بتائے ہیں۔ نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ لفظ سنسکرت اصل ' گَرہ وَتی ' سے بنا ہے۔ اس معنی ہیں با عصمت عورت، ستی یا با وفا عورت۔ ڈاکٹر جولس بلوک نے جو زبان اور آریہ بھاتییہ بھاشاؤں کے ایک مشہور فرانسیسی عالم گذرے ہیں، ا ایک شکل ' کرت ' بتائی ہے۔ ملاحظہ ہوں فقرات ۸۷، ۸۸ اور ۱۶۹۔ انھوں نے

---

* جناب دیوی سنگھ وینکٹ سنگھ صاحب چوہان، بی۔ اے؛ ال ال۔ بی۔ (عثمانیہ)؛ دکن پبلک سروس کہ حکومت مہاراشٹر، بمبئی۔

دوسری شکل «گھرت» بتائی ہے جو ان پڑھ دیہاتی طبقے میں مروج ہے۔ بلوک نے اس لفظ کی بنیاد سنسکرت لفظ «گرہستھ» بتائی ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ یہ لفظ مراٹھی میں تذکیر کے طور پر کبھی استعمال نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ تانیث ہی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

یہ لفظ دیہاتی اور ناخواندہ طبقے میں زیادہ بولا جاتا ہے۔ کتابوں میں اس کا استعمال ہوتا ہے، لیکن بہت کم۔ مراٹھی کے لاونی ادب میں جو اس زبان کا مایۂ ناز سرمایہ ہے اس کا چلن زیادہ ہے۔ لاونی ادب کے متعدد شاعروں نے اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ یہاں ایک شاعر پٹّھے بابو راؤ کی لاونیوں میں سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

(१) करितां माझा कंटाळा परि विनवितं सख्या वेळा
पट्ठे बापुराव म्हणे गाळ **गरत** मराठीमोळा (पा. १८)

(२) आम्ही भल्याच्या **गरती** नारी कथिल्या, माझा मराठी मोळा
खरा भ्रतार भोळा । आजवर मी आहे त्याची कोरी गे (पान १८)

(३) दिसंना तुम्हाला आसुनि अमुचा मराठमोळा **गरतीचा**
अगर तुम्हाला निघना धीर पदर धरावा फिरतीचा (पा. २६)

آج کل کے مراٹھی ادب میں بھی لفظ «گرتی» استعمال ہوتا ہے۔ اس میں ایک مخصوص قسم کی تہذیب پائی جاتی ہے۔ نسوانی تہذیب میں وہ ایک خاص کیرکٹر کا حامل ہے۔ پونا کے مشہور لیڈر شری این۔ جی۔ گورے نے جو پی۔ ایس۔ پی پارٹی کے صدر ہیں، اپنی ایک کہانی میں (مطبوعہ سکال، شنبہ، پونا، مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء) اس لفظ کا استعمال اس طرح کیا ہے:

पण एवढे मात्र खरे की मास्तराची नजर वाईट आहे
अशी तक्रार **गरती** बायकांच्या तोंडूनही ऐकूं येई.

اب وجہی کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

«دنیا میں محبت کسی سوں نا لانا۔ اس زمانے کے مرداں کوں کیا پتیانا۔ ایک جاگا نظر، ہزار جاگا دل۔ کون عورت ایسے مرد سوں رہے گی مل۔ بات خرافات، مرداں کی ذات سو بے وفا۔ ایسیاں خاطر کرتے روئیے، ہلاک ہوئیے۔ اپس کوں عذاباں میں بھائیے تو کیا نفا۔ ایسیاں سوں جیو لائیے تو کچھ حاصل نہیں بغیر جفا۔» (سب رس، ص ۲۱۹)

ان چند جملوں کا مفہوم صاف اور آسان ہے، بشرطیکہ خط کشیدہ لفظ کو

اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے ۔ متن میں اس لفظ کو 'کرتے' کی شکل میں پیش کیا گیا ہے ۔ لیکن قارئین بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ جملہ "ایسیاں خاطر کرتے روئے... تو کیا تھا۔" ادھورا ہے۔ اس جملے میں کوئی فاعل ہی موجود نہیں۔ کون روئے ؟ کون ہلاک ہوئے؟ دراصل فاعل لفظ 'گَرتی' ہے جسے 'کرتے' کی شکل دی گئی ہے۔ اگر اس لفظ کو 'گرتی' پڑھا جائے تو مفہوم بالکل صاف ہوجاتا ہے۔ ان جملوں کا مطلب یہ ہے کہ آج کل مرد کی ذات بہت بے وفا ہے۔ اُس کی نظر ایک جگہ ہوتی ہے تو دل ہزار جگہ۔ ایسے مرد کے لئے گرتی یعنی ستی یا باعصمت عورت کیوں روئے ، کیوں ہلاک ہوئے۔

> (۲) "اتال عشق ملامتی ، کلاونتی ، بازاری ، یہاں تو بہوتیچہ خواری ، بہوتیچہ دشواری ۔ ۔ ۔ ایک جائے سوں جیو نہیں لاتی۔ سو جنیاں کنے جاتی۔ ایک گھر میں تو چار چار بھار۔ یو بھی عجب تماشے کا ہے لھار۔ طبیعت بہت نازک، بہت نرم، وو بےحیائی ہور یو شرم۔ جس کنے گتی اسکیچہ ہوں کر دکھلاتی، ہزار جنس سوں جیولاتی۔ ناز شرم یوں کرتی فاش، اصیلاں بچاریاں کیا قماش۔ جانو ایک تے دسرے کی چھاتوں نہیں پڑی، ایسے گڑتے ایسی شرم کی ایسی بڑی۔ گھنگھٹ میں تے موں بھار نہیں کاڑتے، بازار میں کھڑے اچھ پردے پھاڑتے۔"
> (سب رس ، ص ۲۴۶)

مولوی عبدالحق نے اصل مخطوطے کی نقل من و عن شائع فرمائی ہے۔ متن کو بغور پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان جملوں میں فاعل عورت ہے اور صیغۂ واحد میں ہے۔ اس میں فعل 'ہوں' بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لئے فاعل کے متعلق شبہ کی کوئی گنجایش نہیں۔ اب یہ جملہ ملاحظہ ہو: "ایسی گرتی ایسی شرم کی ایسی بڑی" متن میں گڑتے شائع ہوا ہے جو بےمعنی ہے۔ اگر اس کو 'گرتی' پڑھا جائے تو جملے کے معنی بالکل صاف ہوجاتے ہیں۔ بات کو اور واضح کرنے کے لئے آخر میں کہا گیا ہے کہ ایسی عورت "بازار میں کھڑی اچھ پردے پھاڑتی۔" یہاں پر وجہی نے حقیقتہً فاحشہ عورتوں کی مذمت کی ہے اور ان کو طنزاً گرتی کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی عورت فاحشہ ہے۔

وجہی کی سب‌رس ناگری رسم‌الخط میں بھی شائع ہوئی ہے جس کو ڈاکٹر شری رام شرما نے مرتب کیا اور دکھنی پرکاشن سمیتی، حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس میں بھی قرأت کی کئی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ اردو رسم الخط میں اس طرز تحریر کی خصوصیات کی بناء پر صوتیات کی جو غلطیاں چھپی رہ گئی تھیں وہ ناگری رسم‌الخط کی وجہ سے نمایاں ہوگئیں۔ دونوں ایڈیشنوں کی غلطیوں کو دیکھنے کے بعد یہ صداقت واضح ہوجاتی ہے کہ دکھنی کے مطالعہ کے لئے مراٹھی زبان کا علم ضروری ہے۔ اوپر کے دونوں اقتباسات ڈاکٹر شرما کی کتاب سے ہی نقل کئے جاتے ہیں:

दुनिया में मुहब्बत किसी सूं न लाना: इस ज़माने के मर्दों कूं क्या पतियाना । एक जागा नज़र, हज़ार जागा दिल, कौन औरत ऐसे मर्द सूं रहेगी मिल? बात, खुराफ़ात मर्दों की ज़ात सब बेवफ़ा । ऐसियां (ऐस्यां) खातिर करते [गरति] रोवे, हलाक हुए (होए) । अपस कूं अज़ाबा में भाये तो क्या नफ़ा । ऐसियां (ऐस्यां) सूं जीव लाए, तो कुछ हासिल नहीं बग़ैर जफ़ा । अज़ाबां पृष्ठ (१६७)

اب دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔ تانیث کے صیغۂ واحد کو قوسین میں مضمون نگار نے رکھا ہے۔

"अताल इश्क़ मलामती, कज़ाबन्ती, बाज़ारी । यहां तो बहुती च खारी । बहुती च दुश्वारी । ... एक जने सूं जीव नहीं लाते (लाती), मौ जन्यां कने जाते (जाती) । एक घर में, तो चार भार, यू भी अजब तमाशे का है ठार । तबियत बहुत नाज़ुक, बहुत नर्म । वो बे हयाई होर यू शर्म । जिस कने गये (गई) उसके (की) च होकर दिखलाते (दिखलाती), हज़ार जिन्स सूं जीव लाते । (लाति) । नाक्क शर्म करते (करती) फ़ाश, असीलां खिचारियां (बिचान्यां) क्या तमाशा । जानो एक ते दूसरी (दूसरे) की छांव नहीं पड़ी । ऐसे करते (ऐसी करती) ऐसी शर्म की ऐसी बड़ी । घूंगट में ते मू भार नहीं काढते (काढती), बाज़ारमें खड़े (अक्क) पर्दे फाड़ते (फाड़ती) । ,, पृष्ठ (१७२)

ہاشمی بیجاپوری نے (وفات ۱۱۰۹ھ ۱۶۹۸ء) تین بار لفظ "گرتی" کا استعمال کیا ہے۔ لیکن افسوس کہ دیوان ہاشمی کے مرتب ڈاکٹر حفیظ قتیل نے تینوں جگہ اس کی غلط قرأت دی ہے۔ دکھنی کے مخطوطوں میں "گرتی" کو "کرتے" لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں گ پر بھی ایک ہی مرکز لگایا جاتا تھا۔ اسی طرح سے تحریر میں یائے معروف اور یائے مجہول میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہم ایک کتاب کو جدید طریقے پر مرتب کر رہے ہیں تو ہم کو چاہئے کہ متن کو صحیح شکل میں پیش کریں۔ نیچے اُن اشعار کو جن میں شاعر نے لفظ "گرتی" استعمال کیا ہے، پیش کیا جاتا ہے:

(۱) پہنے سونیں کسنبا لہو عاشقاں کا لےکر
اُجلا کتے ہیں سیلا رنگ دار چاند صاحب
انکھیاں سو مارنا ہور بھی لب چکھا چلانا
کرتے ہیں بھی کرت پن [گرت پن] گھر چار چاند صاحب

ہاشمی نے اس شعر میں باعصمت عورتوں کے کچھ عاشقانہ طور ، باوجود ان کی عصمت کی تعریف کی ہے. گرتی اور گرت پن ایک ہی

(۲) کیں سب بی بیاں موگریل سٹ کتی خون کنگھی کرتے ہیں
چکنٹیگا ہو کرتے [گـــرتی] ننھی چپ سراوارا کا ہیۓ

اس شعر میں ایک ایسی نوجوان عورت کا ذکر ہے جس کا شوہر پاس نہیں ہے . وہ کہیں دوسرے گاؤں کو چلاگیا ہے . چونکہ عورت اپنے ء بچھڑی ہوئی ہے اس لئے اس نے آرایش سے ہاتھ اٹھالیا ہے . وہ موٗ کنگھی کو دور رکھنا چاہتی ہے کیوں کہ وہ نوجوان گرتی ہے .

(۳) معشوقہ اپنے شوہر کے چال چلن پر شبہ کرتی ہے اور سہ کہ فلاں عورت سے اس کا لگاو ہے . لیکن پھر اس عورت پر شبہ کرنے کا دل جھجکتا ہے .

چھنالا کرتی [گرتی] کوں کیوں [کَـوُں] میں میری پیٹ بجکو دسق
بُری اُستے کتی ہوں میں چلنت کو دیکھ چنچل کی

یہاں پر معنی بالکل واضح ہیں کہ شبہے کی بنا پر وہ کسی دوسر کو جو گرتی ہے چھنال ، فاحشہ کہنے سے باز رہنا چاہتی ہے .

آخر میں ہم ملک الشعرا غواصی کے مستعملہ لفظ گرتی کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں . کلیات غواصی میں قصیدہ نمبر ۲۱ (واقعۃً میں شاعر نے عبداللہ قطب شاہ کی ملکہ کی مدح کی ہے . الگ الگ ملکہ کی توصیف کی گئی ہے . شعر نمبر ۱۸ ملاحظہ ہو :

کرتے [گرتی] تیرا سنگاتی سلطان عبداللہ جو
شاہاں کے تـار پر کا ہے شاہوار مـــوتی (ص

شعر کا پہلا لفظ ،کرتے، بالکل بے معنی سا لگتا ہے. اسے اگر ،گ جائے تو معنی بالکل صاف ہوجاتے ہیں.

غواصی نے ایک فلسفیانہ غزل دل کے مکر و فریب پر لکھی ہے۔ (غزل نمبر٦ ص ۱۱۱) اس میں شاعر نے دل کی کثافت کی وجہ سے وصل حق میں پیدا ہو والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:

بڑا حیف جو یاں وو مت نا ہوا		مرے من گگن کا آجت نا ہوا
جنم گھوٹیا اجنوں اس حد تلک		پرت کا منجے فام رت نا ہوا
کہاں تھے سنیا دل کی باتاں کوں میں		یو دل کرتے [گرتی] منج پر سوات نا ہوا
وو فتنے بھریا سو ہے فتنا عجب		اسی تھے یتا جگ میں فتنا ہوا
لگیا ہے ضرور اب منجے سوسنا		سجن تھے درد دوکھ جتنا ہوا
تل اتنا اُسوں عشق دھرتا جو تھا		دیکھ آخر تسل اتنا سو کتنا ہوا

غواصی پہ کرتا ادکھ رحم آج
بڑا حیف جو یاں وو مت نا ہوا

شاعر اس غزل مسلسل میں دل کے مکر اور فتنوں سے زندگی برباد ہو اور وصال حق سے محروم ہونے کا ذکر کررہا ہے۔ تیسرے شعر کا ثانی مصر خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ "دل کرتے" کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ اگر "کرتے" کو "گرتی" پڑھا جائے تو معنی نکل آتے ہیں۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ گر کے معنی باعصمت عورت، ستی یا پتی ورتا کے ہیں۔ اگر بیوی باعصمت ہو تو شو کی زندگی، مفلوک الحالی اور غربت کے باوجود عزت کی زندگی ہوتی ہے۔ سم میں اس کا سر اونچا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی مالدار و ذیجاہ شخص بیوی فحش زندگی اختیار کرتی ہے تو اس کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ا معاشرتی زندگی کی حقیقت کو غواصی نے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اس نے اپنے دل کو گرتی یعنی باعصمت دیکھنا چاہا تھا۔ لیکن اس کی شکا ہے کہ وہ گرتی ثابت نہیں ہوا۔ مثل دنیاوی شوہر کے غواصی کا دل بھی فتنہ فریب کا شکار ہوگیا اور اسے وصل خدا نہ مل سکا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ دل عم دھوکا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں اتنی مکاری اور دھوکے بازی پائی ج ہے۔ اس غزل کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہئیے۔ میری ناقص رائے میں غواصی کی ایک عمدہ غزل ہے۔

یہ فلسفیانہ مسئلہ ہندؤوں کے ویدانت میں بھی اہم ترین مانا گیا ہے۔ سنسکرت اور دوسری بھاشاؤں میں اس مسئلہ پر دفتر کے دفتر لکھے گیے ہیں۔ بھگوت گیتا میں من یا دل کے خطرات کو جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً

यततो ह्यपि कौन्तेय पुरुषस्य विपश्चित:
इन्द्रियाणी प्रमाथीनि हरन्ति प्रसभं मन: । २.६०
चन्चलं हि मन: कृष्ण प्रमाथि बलवद् दृढम् ।
तस्याहं निग्रहं मन्ये वायोरिव सुदुष्करम् ॥ ६.३४

انسان کے حواس خمسہ بہت فتنہ انگیز اور باغی ہیں۔ ہر قسم کے تحفظ کے باوجود وہ ودوان اور عالم کے من (دل) کو بھگا لے جاتے ہیں۔ دوسرے شلوک کا مطلب اسی قسم کا ہے۔ انسان کا من یا دل بہت چنچل ہے۔ وہ فتنہ انگیز، زبردست اور قوی ہے۔ اس کو قابو میں رکھنا ہوا کو مقید کرنے کی مانند محال ہے۔ اسی مشکل مسئلے کو غواصی نے اپنی قادر الکلامی سے استعارہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

دکھنی کے لسانی مسائل پر ابھی تک کافی روشنی نہیں پڑی ہے۔ ایسے بہت سے مسائل ہیں جن کو حل کرنے کی کسی نے کامیاب کوشش نہیں کی۔ لسانی مسائل اور صرف و نحو پر ہر مرتب، نیا ہو یا پُرانا، وہی باتیں دہرا دیتا ہے جن کی طرف مولوی عبدالحق نے اشارہ فرمایا تھا۔ مندرجہ بالا غزل کے پہلے شعر کے مصرعِ اول میں لفظ 'جو' عام معنی سے ہٹ کر ایک الگ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ یہاں پر حرف ربط ہے اور اس کے معنی ہیں 'کہ' یا انگریزی that۔ 'جو' کے اس معنی کی طرف محمود خاں شیرانی نے اپنی مشہور تصنیف 'پنجاب میں اردو' میں ایک جگہ اشارہ کیا ہے۔ 'جو' اس معنی میں ہر دور اور ہر شاعر کے یہاں مستعمل رہا ہے۔ اس کی بنیاد ہے سنسکرت یَتْ یا یَدْ بمعنی کہ۔ یہ دو جملوں کو جوڑنے کا فرض انجام دیتا ہے۔ «بڑا حیف جو یاں وو مت نا ہوا» مماثل ہے اس جملے کے 'بڑا افسوس ہے کہ وہ مِت یعنی دوست نہیں ہوا۔ اسی طرح سے چھٹے شعر کے مصرع اول میں بھی 'جو' کے معنی 'کہ' کے ہی ہیں۔ جو بمعنی کہ کا استعمال ہر موجودہ انڈو آرین زبان میں ایک زمانے تک ہوتا رہا ہے۔ مراٹھی زبان میں وہ مہانو بھاؤ دور میں مروج تھا۔ بعد میں متروک ہوا۔ گویا وہ مراٹھی زبان میں شک ۱۵۰۰ / ۱۶۲۲ء سے متروک ہے۔ گجراتی زبان میں بھی وہ متروک

ہے۔ البتہ اس گجراتی میں جو بمبئی اور اطراف کے پارسی بولتے ہیں اب بھی مستعمل ہے۔ اس لحاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جو' بمعنی 'کہ' دکھنی میں کافی زمانے تک استعمال ہوتا رہا، یعنی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ایک یا ڈیڑھ صدی بعد تک مستعمل رہا۔ ہم نے ایک مقالہ ہندی میں اس مسئلے پر لکھا ہے جو ناگری پرچارنی سبھا میں شائع ہو رہا ہے۔

مآخذ

۱ ۔ مراٹھی ویوتپتی کوش از کے۔ پی۔ کلرنی، بمبئی، ۱۹٦۴ع
۲ ۔ مراٹھی زبان کا ارتقا (مراٹھی) از جولس بلوک، ترجمہ وی جی۔ پرانجپے، پونا، ۱۹۴۱ع
۳ ۔ لاونیاں از پٹھے باپو راؤ، اِدھکاری، پونا، ۱۹۲۸ع
۴ ۔ سب رس از وجہی، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۲ع
۵ ۔ سب رس از وجہی، مرتبہ ڈاکٹر شری رام شرما (ہندی)، حیدرآباد، ۱۹۵۵ع
٦ ۔ دیوان ہاشمی، مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل، حیدرآباد، ۱۹٦۱ع
۷ ۔ کلیات غواصی، مرتبہ محمد بن عمر، حیدرآباد، ۱۹۵۹ع

* گیان چند جین

تحقیق کے مسائل

[خطبۂ صدارت جو تیسری کل ہند اساتذۂ اردو کانفرنس منعقدہ علی‌گڈھ کے «تحقیق کے مسائل» سے متعلق اجلاس میں پڑھا گیا۔]

اساتذۂ کرام،

اردو تحقیق یونی ورسٹیوں کا مسئلہ ہے۔ (واضح رہے کہ یونیورسٹیوں میں میں کالجوں کو بھی شامل سمجھتا ہوں کیونکہ ہر کالج علمی حیثیت سے کسی نہ کسی یونیورسٹی کا جز ہوتا ہے) لیکن یونیورسٹیوں کے باہر بھی داد تحقیق دی جاتی ہے وہ تحقیق مقدار میں کمتر لیکن معیار میں برتر ہوتی ہے۔ درسگاہوں کے باہر کے محققین کو بھی میں اپنی برادری کا فرد سمجھتا ہوں کیونکہ وجہی کے الفاظ میں

« جکوی بات ہماری چلیا وہ ہماراج ہے۔

ہرچند فہم داری ہے چلیا توکیا ہوا بات ہماری ہے »

ان کی جنس کی گاہکی اہل مدرسہ ہی کرتے ہیں اسلیے میری تجویز ہے کہ اردو کانفرنس کے موقع پر ان بزرگ محققوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے تو ہم سب کے لیے فیض کے دریا بہہ جائیں۔ دوسرے مضامین مثلاً معاشیات کی کانفرنس میں وہ ماہرین بھی شرکت کرتے ہیں جو کسی درسگاہ سے متعلق نہیں ہوتے۔

درس‌گاہوں میں تحقیق کرنے والوں کو بہ آسانی دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے ایک تو کل وقتی ریسرچ اسکالر اور نو عمر اساتذہ جو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے کام کرتے ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ دوسرے وہ تجربہ‌کار اساتذہ جو ڈگری کے لیے تحقیق نہیں کر رہے ہیں یا پھر ڈی لٹ کی ڈگری کے لیے کام کر رہے ہیں یونیورسٹیوں کی تحقیق کے بہتر کام انہیں سے متوقع ہیں گو شاذ و نادر اول‌الذکر گروہ میں بھی بڑے درخشاں شرارے دکھائی دے جاتے ہیں لیکن تحقیق کے معیار کو بلند کرنے کا مسئلہ دراصل اسی گروہ سے وابستہ ہے۔ یہ مسلمہ ہے کا

* پروفیسر ڈاکٹر گیان چند جین استاد شعبۂ اردو، جموں و کشمیر یونیورسٹی، حلقۂ جموں، مصنف اردو کی نثری داستانیں، تحریریں وغیرہ۔

بیشتر صورتوں میں نئے ریسرچ اسکالروں کا معیار تحقیق قابل تشفی نہیں ہوتا۔ اس مرحلے پر میں یہ واضح کردوں کہ اسکی وجہ اردو کی کساد بازاری نہیں۔ پستی معیار کا معاملہ اردو سے مخصوص نہیں۔ میں نے دوسرے مضامین مثلاً ہندی، انگریزی، معاشیات، تجارت تاریخ وغیرہ کے تحقیقی کام دیکھے ہیں اور انکی صورت‌حال اردو سے ذرا بہتر نہیں۔

تحقیق کے لیے ایک خاص قسم کے مزاج اور ایک خاص قسم کے علمی پس منظر اور تربیت کی ضرورت ہے۔ یہ مزاج اور یہ تیاری عام نہیں اسلیے یہ آواز الھائی جارہی ہے کہ تحقیق کی اجازت عام نہیں ہونی چاہیے۔ اردو ریسرچ میں داخلہ لینے والے بیشتر وہ بدنصیب نوجوان ہوتے ہیں جو روزگار حاصل نہ کرسکے یا جو چھوٹی ملازمت سے قدرے بہتر ملازمت چاہتے ہیں انہیں ریسرچ ڈگری کی دست‌کاری درکار ہے۔ ملازمت کے حصول یا مزید ترقی کی خواہش بری نہیں ادب برائے ادب کی طرح تحقیق برائے تحقیق کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن محض صلے پر نظر رکھ کر تحقیق کے کام میں عجلت یا رشید حسن خان کے الفاظ میں «ہاتھ کی صفائی سے کام لینا جائز نہیں»۔ ریسرچ میں صرف ان طلبہ کو لینا چاہیے جنھوں نے اسکی صلاحیت کا کوئی ثبوت دیا ہے۔ جس شخص نے کبھی ایک مضمون بھی نہ لکھا ہو وہ ایک کتاب کیونکر لکھ سکتا ہے؟

ریسرچ کے لئے باصلاحیت طلبہ کا انتخاب صدر شعبہ کی ذمہ داری ہے لیکن موجودہ نظام میں سفارشوں اور دباؤ کے آگے اصول نرما جاتے ہیں پھر یہ بھی تو ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں شخصوں کو گنا کرتے ہیں۔ ہر جماعت اور ادارے میں کثرت تعداد قوت کی ضامن ہے۔ جس شعبے میں جتنے زیادہ ریسرچ اسکالر درج رجسٹر ہوتے ہیں۔ شعبے کی کلاہ فخر میں اتنے ہی سرخاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی معائنہ کرنے والی ٹیم آتی ہے تو دریافت کرتی ہے کہ شعبے میں کتنے طلبہ ریسرچ کر رہے ہیں۔ ریسرچ کی مقدار کے مطابق کتابوں کے لئے روپیہ دیا جاتا ہے۔ اس لئے ہر صدر شعبہ کی خواہش ہوتی ہے کہ شعبے میں ریسرچ اسکالروں کی تعداد قابل قدر ہونی چاہئے وہ کام کریں یا نہ کریں مردم شماری کے تو کام آئیں گے۔ ہر استاد کے لئے بھی یہ نشان امتیاز ہے کہ اس کی نگرانی میں چند اسکالر کام کر رہے ہیں اگر اس کی نگرانی میں

کسی کو ڈگری بھی مل گئی تو استاد فوق پی ایچ ڈی کے مرتبے پر فائز ہوگیا۔ ج
طلبہ اور اساتذہ دونوں کے حق میں یہی ہے کہ ریسرچ میں زیادہ داخلے ہوں
داخلے کے وقت انتخاب معلوم۔

بیکار گریجویٹوں کو دیکھ کر تجویز کی جاتی ہے کہ یونیورسٹی کی تہ
کے دروازے صرف چیدہ با صلاحیت طلبا پر کھولے جائیں اور معمولی ملازمت
کے لئے یونیورسٹی ڈگری کی قید اُٹھالی جائے۔ ایسا ہی کچھ پی ایچ ڈی کے معام
میں کرنے کی ضرورت ہے۔ ریسرچ میں داخلہ محدود کیا جائے۔ نیز استاد کے ا
ریسرچ کی نگرانی کے تجربے کو کوئی وصف نہ قرار دیا جائے۔ اردو کو چھوڑ
میں نے کئی دوسرے مضامین کے ایسے نگراں دیکھے ہیں جنھوں نے متعدد پی ایچ
دلادئیے۔ لیکن خود ساری عمر تحقیق میں ایک مضمون بھی نہ لکھا۔ یہ یقینی
کہ وہ پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تو عین ممکن ہے کہ نہ کرسکتے۔ ایک یونیورسٹی
یو جی سی کی معائنہ کرنے والی ٹیم کے ایک افسر نے ایک پروفیسر سے پو
"آپ نے کوئی پی ایچ ڈی بنایا ہے؟" جواب ملا "پندرہ" یہ تعداد سن کر اف
بھاگ کھڑا ہوا مزید کچھ نہ پوچھا۔ کاش اس نے پوچھا ہوتا کہ آپ نے کس
ریسرچ کی ہے؟ اس سوال پر پروفیسر صاحب بھاگتے نظر آتے۔ جب تک پی ایچ
کی دمک اور پی ایچ ڈی کے نگراں ہونے کے افتخار کو قطع نہ کیا جائے گا
بوالہوس اس طرح کھنچا چلا آئے گا۔ جب تک حصار تحقیق صرف باذوق و
کے لئے محدود نہ کیا جائے گا معیار بہتر نہ ہوسکے گا۔

انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے اصولوں پر کئی کتابیں ہیں۔ اردو
کوئی جامع کتاب نہیں۔ حال میں دو ایک کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے علاوہ ج
جستہ کئی مضامین میں مخصوص پہلوؤں پر غور کیا گیا ہے۔ اس مسئلے پر تو
مبذول کرانے کا سہرا انجمن اساتذہ ہی کے سر ہے۔ عثمانیہ اور دلی یونیورسٹ
میں ریسرچ سے قبل ایک مختصر کورس کا اہتمام کیا گیا ہے۔ بقیہ جگہوں پر نہ
جب ریسرچ اسکالر یا یا تحقیق کے جنگل میں پھنستا ہے تو اس کی سمجھ
نہیں آتا کہ کس راستے سے ابتدا کرے۔ اس موقع پر رہنما یا نگراں کی ذات خ
کا کام کرتی ہے۔ اچھا نگراں وہی ہوسکتا ہے جس نے خود تحقیق کی ہو۔ ج
کا مزاج تحقیقی ہو جو اپنے طالبعلم کی رہنمائی کے لئے وقت اور توجہ دینے کو تیار

نگران تحقیق کی ذات والا صفات کے بارے میں بڑے بڑے شہر آشوب، ہجو، مرثیے اور نوحے لکھے گئے ہیں اور ان میں زیادہ تر حقیقت ہوتی ہے، میں اس نازک موضوع پر صرف یہ کہوں گا کہ علمی دیانت داری کا تقاضا ہے کہ نگران صرف اتنے ہی طلبہ کو اپنی نگرانی میں لے جن کی دیکھ ریکھ کے لئے وہ وقت نکال سکتا ہے، صرف ان موضوعات پر نگرانی کرے جن پر اسے عبور ہے اور کسی کو اپنے سایہ عاطفت میں لینے کے بعد اسے ہر طرح سے سہارا دینے کی ضرورت ہے۔ اس کی راہ میں سنگ گراں بن جانے کی نہیں۔ یہاں پھر کچھ مجبوریاں سامنے آجاتی ہیں۔ بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں میں صدر شعبہ کے علاوہ بقیہ اساتذہ میں کوئی نگراں تحقیق مقرر کئے جانے کی شرائط پوری نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں صدر شعبہ کو بعض ایسے موضوعات پر کام کرنے والوں کو بھی اپنے ساتھ ٹانکنا پڑتا ہے جن کے موضوعات میں اسے زیادہ درک نہیں۔ اس صورت حال کا علاج صرف یہ ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو بآسانی نگراں مقرر کیا جائے۔ نیز یہ شرط اُڑا دی جائے کہ اسکالر مسلسل دو سال نگراں کی قدم بوسی میں گزارے گا۔ مشکل یہ ہے کہ یونیورسٹیاں باہر کے کسی استاد کو نگراں مقرر کرنے میں اپنی سُبکی سمجھتی ہیں۔ اِسلئے بہ مشکل اجازت دیتی ہیں۔

موضوع اور نگراں کے انتخاب کے بعد مواد کی فراہمی کا مسئلہ درپیش آتا ہے ملک میں صرف چند مقامات پر اچھے کتب خانے ہیں بقیہ درسگاہوں کے اساتذہ اور طلبہ کو کتب کی فراہمی ہفت خواں بن جاتی ہے۔ باہر جاکر کچھ عرصہ قیام کرکے متعدد کتابوں سے استفادہ کیا جاتا ہے لیکن بعض اوقات کچھ کتابیں یا مخطوطے ایسی بنیادی صورت اختیار کرلیتے ہیں کہ تحقیق کے دوران انہیں مسلسل پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ لائبریریوں سے کتابوں کو مستعار دینے کی شرائط میں نرمی برتی جائے۔ میں اپنا ایک تجربہ پیش کرتا ہوں۔ میں نے غالب کے قلم زد کلام کی شرح لکھی مجھے اس کے لئے فرہنگ آنند راج (مطبوعہ) کی ضرورت ہوئی جو میری ہی یونیورسٹی کے دوسرے ڈویژن یعنی سری نگر کی لائبریری میں ہے۔ میں نے بذات خود لائبریرین سے درخواست کی، جموں کی لائبریری سے لکھ کر بھیجوایا کتاب ایک ماہ کے لئے مستعار دیدی جائے آج تک کوئی جواب نہیں ملا۔ مجھے کہیں سے ایران کی مطبوعہ فرہنگ آنندراج ملگئی، جسے میں

نے جموں لائبریری کے لئے خرید لیا۔ جہاں علم کے کنوؤں پر اس طرح مہر لگالی جائے وہاں تحقیق کے پیاسوں کی آبیاری کیونکر ہو سکے گی۔ میں مختلف جامعات کے اردو شعبوں کے صدروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسی صورتوں میں ذاتی دلچسپی لے کر چھوٹے اداروں میں کام کرنے والوں کی امداد کریں۔ ترقی یافتـــہ اور ترقی پذیر درسگاہوں کے بیچ «انکٹاڈ» کے اصول پر تعاون ہونا چاہئیے۔

تحقیق کے شروع میں یہ بھی معـــلوم نہیں ہوتا کہ کسی موضوع کے لئے ضروری مواد کس ذخیرے میں مل سکےگا۔ مطبوعات کی حد تک تو اطمینان کیا جاسکتا ہے کہ ہر بڑی لائبریری میں موجود ہی ہوں گے۔ مخطوطات کے بارے میں انکل پچو تلاش کرنی پڑتی ہے اگر سب ذخیروں کے مخطوطات کی فہرستیں شائع ہوجائیں تو جوئندوں کو پابدگی کے ائے زیادہ نہ بھٹکنا پڑے۔ مخطوطات کی فہرستیں اجمالی نہیں وضاحتی ہونی چاہئیں۔ اردو کے دو اہم کتب خانے جن میں بیش بہا مخطوطات ہیں اور جن کی فہرستیں ہنوز شائع نہیں ہوئیں۔ اسی شہر بلکہ اسی احاطے میں ہیں مسلم یونیورسٹی لائبریری اور انجمن ترقی اردو لائبریری علی گڑھ۔ جب تک یہ فہرست شائع نہ ہونگی کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں فارسی چہار درویش کا دنیا میں قدیم ترین مخطوطہ ہے۔ جو جہاندار شاہ کے سال جلوس یعنی ۱۷۱۲ء میں تحریر کیا گیا۔ اور جو محمد شاہی عہد کے محمد علی معصوم خ کو اس قصے کی تصنیف سے حتمی طور پر بے دخل کر دیتا ہے۔

بڑے کتب خانوں کے بارے میں تو خط و کتابت سے بھی کچھ پتہ چل جاتا ہے چھوٹے کتب خانوں کے دفینے تاریکی میں رہتے ہیں اور بعض موضوعات کے لئے ان میں کوہ نور اور مغل اعظم جیسے ہیرے مل جاتے ہیں۔ ایک ریسرچ اسکالر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مرزا ہوس کا کلام مرتب کر رہے تھے اتفاق سے بھوپال کے ایک صاحب سے خط و کتابت ہوئی میں نے سراغ دیا کہ حمیدیہ کالج بھوپال میں دیوان ہوس کا ایک مخطوطہ ہے نیز بھوپال ہی میں مولانا محوی صدیقی کے ذخیرے میں ایک اور بیش بہا مخطوطہ ہے جس میں ہوس کی ایک ایسی طویل داستانی مثنوی ہے جس کا اور کہیں پتہ نہیں چلتا وہ ایک ماہ کے لئے بھوپال آ کر رہے اور دونوں مخطوطوں سے استفادہ کیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی مجھ سے مراسلت

ہوگئی اور انہیں دو مفید نسخوں کا علم ہوگیا۔ کلام مصحفی کے مخطوطات بہت کمیاب ہیں۔ حمیدیہ کالج میں مصحفی کے دیوان دوم کا کوئی ڈیڑھ سو سال پرانا مخطوطہ ہے۔ کلیات مصحفی جلد دوم ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ میں نے اس کے مرتب نثار احمد فاروقی سے پوچھا کہ آپ نے بھوپال کا نسخہ دیکھا؟ انہوں نے اس کے وجود سے لا علمی کا اظہار کیا اور اس پر افسوس کیا کہ انہیں پہلے معلوم نہ ہوسکا۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی سر پھرا، بستر بدوش، جہانیاں جہاں گرد محقق چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کی نیز نجی کتب خانوں کے مخطوطات کی چھان بین کے لئے بھارت درشن پر نکل پڑے اور ایک فہرست مخطوطات تیار کردے۔ دیوان ضاحک بہار کے ایک گم نام نجی ذخیرے ہی سے تو دریافت ہوا۔ مشکل یہ ہے کہ نجی ذخیروں کے مالک اپنی دولت خوابیدہ کو اشاعت کی ہوا نہیں دکھانا چاہتے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ جہاں کسی نجی ذخیرے کا دیکھنا ملے اور اس میں کچھ قلمی کتابیں ہوں تو ان کی فہرست نوٹ کرلیں اور « ہماری زبان » میں چھپوا دیں تاکہ ان کے بارے میں کچھ تو اتا پتا مل سکے۔

ریسرچ کے طریق کار کی اور بہتر تفہیم کے لئے میری تجویز ہے کہ ہر سال اردو تحقیق کا ایک سمر اسکول (Summer School) منعقد کیا جائے جس میں منجملہ دوسروں کے چوٹی کے محققین مثلاً پروفیسر مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مالک رام صاحب بھی درس دیں۔ کسی دوسرے ادب کے ایک جید محقق کو بھی تدریس کے لئے دعوت دی جاسکتی ہے۔ یو جی سی (U.G.C.) سمر اسکولوں کے مصارف اٹھانے کے معاملے میں فراخ دل ہے اس لئے اس کے انعقاد میں کم از کم مالی دشواری نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مخطوطات کی روش املا، کاغذ، روشنائی اور جلد بندی وغیرہ سے ان کے عہد کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ میں اس قسم کی شناخت سے نا بلد ہوں۔ سیکھنا چاہتا ہوں اگر تحقیق کا ایسا سمر اسکول منعقد کیا جائے تو میں بھی بطور طالبعلم اس میں شرکت کرنا چاہوں گا۔

تجربہ کار اساتذہ تحقیق کا جو معیار قائم کرتے ہیں اپنی نگرانی میں جیسے کام کراتے ہیں اس سے درسگاہ میں تحقیق کی جہت اور سطح متعین ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے صدر شعبہ کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہوتی ہے اردو کے بے لاگ محقق

رشید حسن خاں نے نوائے ادب میں تحقیق سے متعلق بعض مسائل کے عنوان ؛ ایک نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز سلسلہ شروع کیا ہے۔[1] مضامین کیا ہیں تحـ کا شہر آشوب ہیں ایک دلچسپ اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

"انہیں میں سے ایک گروہ اور بھی ہے جو تعداد میں کم ہے لیکن اثراز ہونے کے لحاظ سے سب سے زیادہ نقصان رساں ہے..... یہ ان اساتذہ پر مشت ہے جنھیں استادوں کے استاد کہنا چاہئیے ہمارے نظام تعلیم کا یہ کرشمہ ہے استاد جس قدر بلندی کے زینوں پر چڑھا جائے گا اسی قدر وہ دنیا کے دوسر دھندوں میں زیادہ پھنستا جائے گا اور آخر میں ایک منزل وہ آتی ہے جب وا وہ اس بلندی پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے پاس اتنا وقت نہیں بچتا کہ وہ لکھ پڑھنے کا بھی حق ادا کرسکے اس منزل پر یہی مشکل در پیش نہیں ہوتی کہ مطالعے کا حق ادا نہیں کرسکتا اصل مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف ، قطع تعلق بھی نہیں کرسکتا کیونکہ انھیں اوراق جمشیدی کی مدد سے تو وہ اپنا طا ہوش ربا سجائے ہوئے ہے"[2]

خوب لکھا ہے۔ پوری طرح لطف اور روشنی لینے کے لئے پورا مضمون پڑھ میں کہ داستانوں کا حشیش خوردہ ہوں مجھ پر تو اوراق جمشیدی کے ذکر نے ؛ کی کیفیت طاری کردی مقالہ نگار نے یونیورسٹی پروفیسر کا ذکر خیر کیا ہے بجا تسلیم ہے کہ تحقیق کے مثالی نمونے پیش کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ، سے بڑے استادوں پر ہے یہ بھی صحیح ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس میں ان پر الزام رکھا گیا ہے وہ بعض کے لئے درست ہوسکتا ہے لیکن اکثریت کے لئے انسانی فطرت اور تعلیمی نظام جن خرابیوں کو جنم دیتا ہے وہ یونیورسٹی پروفیسر ہی سے مخصوص نہیں ۔ تجارت پیشگی ، نمایش بازی ، جوڑ تور صرف استا ہی کا اجارہ نہیں ۔ یہ چھوٹے استادوں بلکہ شاگردوں میں بھی پائی جا سکتی ہ ہاں ایک حقیقت سے مجھے انکار نہیں کہ یونیورسٹی کے شعبے کے صدر پاس فرصت کی کمی ہوتی ہے لیکن یہ کم فرصتی لازماً کمیٹی اور امتحان کاموں میں ڈوب جانے کا نتیجہ نہیں، اس عہدے کی فطرت میں مضمر ہے۔ یونیور

---

۱ نوائے ادب مشترکہ شمارہ ۲ - ۳ نیز شمارہ ۴ ۱۹۶۷ء شمارہ ۱ ۱۹۶۸

۲ نوائے ادب جنوری ۱۹۶۸ ص ۴۷

ں وائس چانسلر اور رجسٹرار کے دفتر کے عمال خالص انتظامی اور دفتری مے داری رکھتے ہیں صدر شعبے کے علاوہ دوسرے اساتذہ خالص علمی اور تدریسی م کرتے ہیں لیکن یونیورسٹی کے شعبے کا صدر ایسی مخلوق ہے جو دفتری اور علمی دونوں قسم کی ذمہ داریاں لیے رہتا ہے۔ کالجوں میں صدر شعبہ کو دفتری م نہیں کرنے پڑتے دفتری اور علمی کاموں میں خدا واسطے کا بیر ہے آدھ گھنٹہ فائلوں پر کام کیجئے دو گھنٹے تک دماغ علمی مشاغل کے ڈھب کا نہیں رہتا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ درسگاہوں کا ماحول پورے طور پر علمی نہیں ہوتا۔ نہ علمی کاموں کے لئے سو فی صدی سازگار ہوتا ہے نہ مستثنیات کو چھوڑکر حکام بالا دست اس قسم کے کاموں کی قدر کرتے ہیں۔ معلم کا المیہ یہ ہے کہ اسے ہمیشہ منتظم کے ماتحت کام کرنا پڑتا ہے۔ جو درسگاہ کا سربراہ ہوگا اسکی مشین کو رواں دواں رکھے گا وہ منتظم ہوگا۔ سربراہی کے عہدے پر آنے کے بعد علمی منصب برقرار نہیں رکھ سکتے۔ مسلسل کام نہ کرتے رہنا اسکالرشپ کی موت ہے۔ ہمارے نظام میں منتظم کے لئے یہ ممکن نہیں۔ اسے تو ہر وقت ہڑتالوں اور مظاہروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

درسگاہ کا کام چلانا اور طلبا سے نپٹنا فرد واحد کے بس کی بات نہیں اسے کچھ رفقائے کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اساتذہ میں سے کچھ درسگاہوں کے سربراہ کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں، انتظامی اور دفتری امور میں مدد کرتے ہیں۔ یہ مشیر علمی کاموں سے زیادہ انتظامی امور کے ماہر ہوتے ہیں۔ درسگاہ کا سربراہ انہیں لوگوں سے خوش رہتا ہے۔ صرف تحقیق میں لگے ہوئے پروفیسر سے اسے کون سی امداد ملتی ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ہر درسگاہ میں خالص معلم، خالص محقق، خالص مصنف کو ناقدری کا شکوہ رہتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار کو اس کی علمی فتوحات سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حد اساتذہ تقریبیں کراتے ہیں، انتظام میں سربراہ کی مدد کرتے ہیں۔ درسگاہ کے کم و مہ پر ان کی دھاک جمی رہتی ہے۔ ان کے شعبوں کو ہر قسم کی سہولتیں ملتی ہیں یہ صورت حال دیکھ کر علمی کاموں کے لئے حوصلہ برقرار نہیں رہتا۔

درسگاہوں کے سربراہوں اور انتظامیہ کی کوشش رہتی ہے کہ صدر شعبہ کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اور دفتری ذمہ داریوں کی طرف گھسیٹا جائے۔ اگر صدر شعبہ

کا مزاج علمی ہے تو وہ خود کو اس آلودگی سے کم سے کم ملوث ہونے دے گا اور اپنا وقت بچا کر علمی مشاغل کو دینا چاہیے گا۔ جہاں درسگاہ کے سربراہ کے علاوہ صدرشعبہ بھی غیرعلمی مزاج کا ہو وہاں شعبے کے دوسرے اساتذہ کا تو کام تمام ہو گیا۔ صدر شعبہ نہ خود کام کرے گا نہ دوسروں کو چین سے بیٹھ کر کرنے دے گا۔

کالجوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہے۔ سرکاری کالجوں میں سکریٹریٹ کے چھوٹے تانا شاہ دور سے سوئیاں چبھوتے رہتے ہیں تو پرائیویٹ کالج کے سکریٹری یا منیجر (جو اکثر کوئی آڑھتی یا ٹھیکیدار ہوتا ہے) اساتذہ کو اپنی انگلیوں پر نچانا چاہتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یونیورسٹی ہو کہ کالج کہیں وہ طمانیت اور آزادی کا ماحول نہیں جو علمی کاموں کے لئے ضروری ہے۔ کچھ درسگاہوں کے سربراہ ضرور علم و ادب کے فروغ سے دلچسپی رکھتے ہوں گے اور حوصلہ افزائی کرتے ہوں گے مستثنیات کہاں نہیں ہوتے۔ لیکن میری تو جس یونیورسٹی کے استاد سے بات ہوئی اسے وہاں کے غیر علمی، غیر منصفانہ بلکہ سازشی ماحول کا زخم خوردہ ہی پایا۔ علم کے جن مندروں میں آزاد فضا ہونی چاہئے وہاں خلابازوں کے مصنوعی سیاروں کے اندر کی سی گھٹن، بے اطمینانی اور غیر محفوظ ہونے کا احساس ہی ملا۔ یہ غیر ہمدردانہ ظالم ماحول تحقیق کے لئے سب سے بڑا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ مبارک ہیں وہ علم کے دھنی جو سخت حالات سے شکست نہ مان کر کام میں جتے ہوئے ہیں۔

درسگاہوں کے اس ماحول سے نا اُمید ہو کر میری یہ خواہش یا تجویز ہے کہ اردو کا ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جس میں صرف تحقیق کی جائے تدریس نہ ہو۔ بمبئی کے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایم اے کی تعلیم کی وجہ سے پورا زور تدریس پر صرف ہوگیا ہے جس کی وجہ سے تحقیق دب کر رہ گئی ہے۔ تعلیمی کمیشن نے بہ صرف کثیر ہر زبان کی ایک اکیڈمی بنانے کی تجویز کی ہے۔ کیا خوب ہو کہ یہ اکیڈمی بنیادی طور پر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہو اور یونیورسٹیوں کی طرح نیم سرکاری ادارہ ہو یا کسی یونیورسٹی سے ملحق ہو۔ لیکن وہاں کے شعبہ اردو کے تحت نہ ہوتا کہ انسٹی ٹیوٹ کا کردار شعلے کی آلایشوں سے محفوظ رہ سکے۔ چوں کہ اردو کی بیش بہا کتب اور نسخ کمیاب و

نایاب ہیں اور ایک اچھا کتب خانہ چند ایک سال میں نہیں بن سکتا اس لئے مناسب ہوگا کہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایسے شہر میں قائم کیا جائے جہاں پہلے سے اردو کا بہت اچھا کتب خانہ موجود ہو تاکہ انسٹی ٹیوٹ کے اسکالر اس سے بھی استفادہ کرسکیں۔

یہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے۔ ملک کے وسائل کم ہیں۔ اس لئے انہیں ایک منصوبے کے تحت زیادہ ضروری کاموں میں صرف کیا جارہا ہے۔ کیا اردو کے رسائل بھی اس طرح محدود نہیں؟ تحقیق کے ساز و سامان کم ہیں اور تحقیق کا رجحان رکھنے والی طبائع شاذ۔ اردو میں مختلف اداروں میں آج کل جو تحقیقی کام ہورہا ہے وہ خودرو اور بے ہنگم قسم کا ہے۔ کسی طے شدہ جہت میں نہیں ہورہا ہے۔ اس سے دو خرابیاں رو نما ہورہی ہیں: (۱) یہ عام شکایت ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں میں نادانستہ پی ایچ ڈی کے کاموں میں تکرار ہو رہی ہے۔ میں صرف اس صورت میں تحقیقی موضوع میں تکرار روا سمجھتا ہوں کہ پہلے کام پر اضافہ و ترقی کی گنجایش ہو یا کسی دوسرے پہلو کو روشنی میں لایا جائے۔ چونکہ پی ایچ۔ڈی کی ابتدائی تحقیق میں اس ترقی کا امکان کم ہے اس لئے نوخیز اسکالروں کی تکرار سے بچنا چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنے کے لئے کوئی مرکزی ادارہ ہو۔ (۲) اردو ادب کے جوگو شے اور مصنفین تاریکی میں نہیں ان پر کام ہیں کیا جارہا ہے۔ جو جانے پہچانے ہیں انہیں پر مزید توجہ کی جارہی ہے۔

دلی کانفرنس میں ڈاکٹر رضی الدین احمد نے ایک مرکزی کمیٹی کی تجویز پیش کی تھی میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ اس کا نام انٹر یونیورسٹی اردو ریسرچ بورڈ رکھا جاسکتا ہے۔ یہ بارہ ممبروں پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ جس میں دس ممبر مختلف جامعات سے لئے جائیں اور دو ان جید محققین میں سے جو کسی شعبۂ اردو میں تدریس پر مامور نہیں۔ اس کی بیٹھک ہر سال جولائی یا اگست کے مہینے میں ہونی چاہئے۔ جس میں مختلف یونیورسٹیوں میں مجوزہ کاموں کو ایک باقاعدہ اسکیم کے تحت منظم کیا جاسکے۔ کوشش کی جائے گی کہ یو جی سی اس بورڈ کو تسلیم کرلے اور اس کے لئے کچھ سہولتیں فراہم کرے۔ ورنہ ہر ممبر اپنی یونیورسٹی کی جانب سے اس میں شرکت کے لئے آ سکتا ہے۔

تحقیق کے لئے کن موضوعات پر کام کئے جانے کی ضرورت ہے اس پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ میں ایک بار پھر زور دینا چاہتا ہوں کہ اردو ادب کا سب سے پہلا مطالبہ ترتیب متون کا ہے۔ یہ دشوار کام نئے ریسرچ اسکالر نہ کرسکتے تجربہ کار اساتذہ ہی کرسکتے ہیں۔ کام بہت ہے، با صلاحیت افراد کم وسائل اور بھی کم۔ ان کے علاوہ حوالے کے لئے ذیل کے کام بھی ضروری ہیں

(۱) تحقیق شروع کرنے والوں کے لئے اُن کے موضوع پر جامع ببلیو گرا اور اشاریہ میسر ہو تو وہ ہادئ اول کا کام دے گا میرے علم میں صرف ایک صنف ڈرامہ اور دو مصنفوں اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ببلیو گرافیاں مرتب ہو ہیں۔ اقبال سے متعلق کلید اقبال مرتبہ ملک نذیر احمد اور آزاد سے متعلق عابد ر بیدار اور ابو سلمان شاہجہانپوری کے اشاریئے رسالہ اردو ادب میں شائع ہوئے ہ ضرورت ہے کہ ہر صنف اور ہر اہم مصنف کی ببلیو گرافی تیار کی جائے۔ ببلیوگرافیوں کے دو حصے ہوں گے۔ صنف کی ببلیو گرافی میں پہلے حصے میں صنف کی تخلیقات یا تخلیقات کے مجموعوں کی تفصیل ہوگی۔ دوسرے حصے میں صنف پر لکھی ہوئی کتابوں اور مقالوں کا اشاریہ ہوگا۔ مصنف سے متعلق ببلیو گ میں پہلے حصے میں اس کی تمام تصانیف کی تفصیل ہوگی۔ دوسرے حصے میں سے متعلق کتابوں اور مقالوں کا اشاریہ ہوگا۔

اس قسم کا ایک بڑا کام رسالوں کا اشاریہ ہوگا۔ رسالوں کی پوری ف سامنے رکھ کر ایک فہرست مضامین مرتب کی جائے اور پھر اسے موضوع کے ا سے ترتیب دیکر شائع کیا جائے۔ اب تنقیدی و تحقیقی مضامین کے مجموعے بڑی تعداد میں آ چکے ہیں۔ ان کے مضامین کا بھی ایک مجموعی اشاریہ مرتب جا سکتا ہے۔ ببلیو گرافیوں کے سلسلے میں جب ابتدائی کام ہوجائے تو اس میں نزاکتیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً قصۂ چار درویش کا اشاریہ، داستان امیر کا اشاریہ، مثنوی سحرالبیان کا اشاریہ، ان میں ایک طرف مخطوطوں، ایڈیشنوں ترجموں کی تفصیل ہوگی تو دوسری طرف ان سے متعلق تحقیقی و تنقیدی تحر کا حوالہ ہوگا۔ اس قسم کے بڑے کاموں کو پی ایچ ڈی کے لئے اور چھوٹے کو ایم اے فائنل کے تحقیقی مقالے کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ببلوگرافیاں یا اشاریئے وجود میں آجائیں تو نیا کام شروع کرنے والوں کے لئے خام مواد مل جائے۔

(۲) حوالے کا دوسرا کام مختلف مصنفوں کی فرہنگ تیار کرنی ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کے دو کام ہوتے ہیں۔ ایک کسی مصنف کی ڈکشنری ، دوسرے جسے Concordance کہتے ہیں۔ یہ شعرا ہی کی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس میں کسی شاعر کی تخلیقات میں مستعمل تمام الفاظ کو ہجائی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے اور وہ الفاظ جن سطور میں استعمال ہوئے ہیں ان کے حوالے کے ساتھ قلمبند کیا جاتا ہے۔ جون بارٹلیٹ کی مرتبہ شکسپیر کے ڈراموں کی ضخیم کنکارڈینس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں اسے نہایت عالمانہ کام سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی ترتیب میں علمیت کی ضرورت ہی نہیں۔ صرف عرق ریزی درکار ہے۔ انگریزی میں وید کے متروں کی کنکارڈینس بھی دیکھنے میں آئی جو شاید ان کا محض اشاریہ تھا۔ اردو میں اس مفصل پیمانے پر کام کرنے کے نہ وسائل ہیں نہ کوئی افادیت نظر آتی ہے۔ لغت اور کنکارڈینس کو سمو کر ایسا کام کیا جا سکتا ہے جو مفصل لغت اور مجمل کنکارڈینس ہو۔ اس میں کسی مصنف کی تخلیقات میں مستعمل الفاظ، محاوروں اور ترکیبوں کے جو مختلف مفہوم ملتے ہیں وہ درج کر کے ان کے استعمال کی دو تین مثالیں دی جائیں: کنکارڈینس سے اس میں یہ فرق ہوگا کہ اس میں غیر اہم الفاظ مثلاً میں، تو، آیا، گیا درج نہیں کئے جائیں گے۔ سوائے ایسی صورتوں کے جہاں یہ الفاظ ایک سے زیادہ مفاہیم میں استعمال ہوئے ہوں۔ دوسرے اس میں کسی لغت کے استعمال کی تمام مثالیں درج نہیں کی جائیں گی جب کہ صرف دو تین مثالیں درج کی جائیں گی۔ اہم دکنی شعرا اور شمالی ہند کے شعرا میں میر، نظیر اکبرآبادی، غالب، انیس، اقبال وغیرہ نیز نثر نگاروں میں وجہی، عیسوی خاں، میر امن، رجب علی بیگ سرور، اور سرشار وغیرہ اس قسم کی مفصل فرہنگ کے سزاوار ہیں۔ اردو کو ترقی یافتہ زبانوں کے ادب سے آنکھیں ملانی ہیں تو کبھی نہ کبھی اس قسم کے دو تین کام تو کر کے پیش کرنے ہی ہوں گے۔

(۳) تیسرا کام مصنفوں کی سوانحی ڈکشنری، نیز ادبی اصطلاحوں کی ڈکشنری ہے۔ جب یہ دونوں لغات تیار ہوجائیں تو اردو ادب قاموس (لٹریری انسائیکلو پیڈیا) کا نمبر ہے۔ اس میں مندرجہ سابق دونوں لغات کے تمام اندراجات تو ہونگے، ان کے علاوہ دوسرے متعدد اندراجات بھی ہوں گے۔ مثلاً زیرباد، آگ کا دریا، کروچے،

شجاع الدولہ، بنگالی تراجم وغیرہ۔ سوانحی ڈکشنری نیز ادبی قاموس فرد واحد کے کرنے کے کام نہیں ہیں۔ ان کے لئے علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے انداز پر ایک کمیٹی یا تنظیم قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

تحقیق کا فائدہ تب ہی ہے جب وہ شائع ہوکر منظر عام پر آئے۔ تحقیقی کتب کی اشاعت کی راہ میں جو دقتیں ہیں ان سے وہ سب واقف ہیں جنھیں اس مشکل سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ اتنی دیدہ ریزی اور عرق ریزی کے بعد اگر مصنف یہ چاہے کہ اس کی محنت کا کچھ مالی معاوضہ بھی ملے تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ مجھے ایک تجارتی ناشر کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ نئے مصنفوں کے تحقیقی مقالے صرف اس شرط پر شایع کرتا ہے کہ نقد معاوضے کے قسم کی کوئی چیز نہیں دی جائے گی۔ صرف کتاب کی پچیس جلدیں بھینٹ کردی جائیں گی۔ پی ایچ، ڈی کے بعض اچھے مقالے اسی طرح شائع ہو رہے ہیں۔ یہ اہل قلم کی بے بسی سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ کہنے کے لئے یو جی سی سے تحقیقی کتب کی اشاعت کے لئے پوری مدد ملتی ہے لیکن اول تو وہ ایک لمبے سرخ فیتے میں بندھی ہوئی ہے دوسرے وہاں بھی مصنف کے حق محنت کی کوئی قدر نہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ تحقیق کے کاموں کی اشاعت کے لئے کہاں سے روپیہ آئے اور کون سا ادارہ اس کام کو اپنے ذمے لے۔ پیچھے جس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یا اکادمی کا ذکر کیا گیا ہے وہ وجود میں آسکتی تو مقالوں کی اشاعت کی کوئی بہتر سبیل ہوسکتی۔

حضرات، ہمارے ملک کے لئے کہا جاتا ہے کہ یہ غریب باشندوں والا متمول ملک ہے۔ یعنی یہاں کے وسائل کا پوری طرح استعمال ہوسکے تو خوشحالی ہی خوشحالی کا راج ہوجائے۔ اردو ادب بھی اسی طرح ایک بہت بڑا ادب ہے، ترقی پذیر ادب ہے، اس کے کتنے پہلو ہیں، جنھیں سنوار کر سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ تبھی اس کی جملہ رعنائیاں روشن ہوسکیں گی۔ متن کی ترتیب، چھوٹے بڑے پبلک پرائیویٹ کتبخانوں کی فہرست سازی، اشاریوں اور فرہنگوں کی تیاری، قاموس ادب کی تالیف، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام، ان سب اسکیموں کے لئے کارکن بھی چاہئیں اور مالی وسائل بھی۔ درسگاہوں میں مختلف مضامین کا بجٹ پڑھنے والوں کے تناسب سے تیار ہوتا ہے۔ اردو کے کتنے طلبہ ہوتے ہیں؟ اس لئے درسگاہیں اور حکومت اردو کے وہ مالی دستگیری نہیں کرتیں جو اس بڑے ادب کا تقاضا ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر نا امیدی ہوتی ہے۔ جو ملک معاشی حیثیت سے
ییب ہوتا ہے اس کا معیار تعلیم بلند نہیں ہوسکتا۔ جس زبان و ادب کے پاس
ادی وسائل کم ہوتے ہیں اس کے علمی کاموں کی سطح بھی زیادہ بلند نہیں ہوسکتی
کن اگر ہم اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کا شیوہ چھوڑ کر مل جل کر کام کریں تو
امیدی کے بادل چھٹتے نظر آئیں گے۔ ضرورت ہے تنظیم، تعاون اور منصوبہ بندی
ی۔ بعض جگہ اچھے کتب خانے ہیں لیکن ان کتب سے فائدہ اٹھانے والے کارکنوں
ی تعداد کافی نہیں۔ بعض جگہ کارکن ہیں تو ان کی ضرورت کی کتب میسر نہیں۔
ض اساتذہ میں کتابی کام کی صلاحیت ہے لیکن وسائل مہیا کرنے کی نہیں۔ بعض
و وسائل حاصل کرنے کا ڈھب آتا ہے تو اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے تحقیق
تصنیف میں خاطر خواہ وقت نہیں دے سکتے۔ اگر کچھ نمایندہ اساتذہ سال میں
ک دو بار مل کر طے کر لیا کریں کہ خود کیا کام کرسکتے ہیں اور اپنے یہاں
ے اساتذہ اور اسکالروں سے کیا کیا کرا سکتے ہیں، کس کام کے لئے کن وسائل
ی ضرورت ہے اور ایک درسگاہ دوسری درسگاہ کو ان کی تکمیل میں کیا مدد
ے سکتی ہے تو میں نے ابھی جو لمبی چوڑی کاغذی اسکیمیں پیش کی ہیں ان میں
ے بیشتر عمل کی دنیا میں ابھرتی دکھائی دیں گے۔ تنظیم ہی طاقت ہے۔ میرے
ے امید افزا بات یہ ہے کہ اردو کے نا مساعد حالات کے باوجود نئے ریسرچ
سکالروں میں کام کرنے کا شوق اور لگن ہے۔ کاش ہم اساتذہ کو بھی اس شوق
ضول سے کسی قدر ذوق جنوں مل سکے!

* ذاکر حسین فاروقی

منیر شکوہ آبادی

سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی ۹ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ مطابق ۲۳ نو ۱۸۱۴ء کو اتر پردیش کے ضلع مین پوری کے قصبہ شکوہ آباد میں پیدا ہوئے چنانچہ اپنے وطن، تاریخ پیدایش وغیرہ سے متعلق وہ خود لکھتے ہیں :

شکوہ آباد ایک قصبہ ہے آباد وہی ہے مسکن آبا و اجداد
سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں ہوا گلچیں ریاض گفتگو میں
جناب والد مرحوم و مغفور کہ تھا احمد حسین اسم ان کا مشہور
معزز تھے وہ اس قصبے میں سب سے رہے مشہور منشی کے لقب سے
خدا دے رتبۂ عالی و برتر رہیں جنت میں ہمراہ پیمبر
بحمد اللہ یہ ہے شہرۂ عام کہ میرا سید اسمٰعیل ہے نام
تخلص ہے منیر از بسکہ مشہور برنگ مہر تاباں مطلع نور
نویں تاریخ ذی حجہ کی جو ہے ہمایوں ماہ ہے روز نکو ہے
اسی دن مجھ کو دنیا میں اتارا اسی سے نام اسمٰعیل رکھا
عطا معراج کی عرش علا تک نسب پہنچا دیا آل عبا تک

منیر نقوی سید تھے۔ ان کے اجداد دور شاہی میں ممتاز عہدوں پر فائز رہ ان کے والد منشی احمد حسین کی علمی صلاحیت بہت اچھی تھی۔ وہ شاعر بھی ت شاد تخلص کرتے تھے اور سودا کے شاگرد تھے۔ ان کے بڑے بھائی اولاد حس بڑے متجر عالم اور درجۂ اجتہاد پر فائز بزرگ تھے۔ منیر نے اپنے والد اور بڑ بھائی سے تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کا کلیات شاہد ہے کہ ان کی علمی صلاح بہت بلند تھی۔ وہ عربی اور فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ فارسی کی غزل اور مکاتیب سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں اس زبان پر گہرا عبور حاصل ت ایرانی اساتذہ کی زمینوں میں انھوں نے جو قصائد کہے ہیں وہ بھی فارسی سے

* ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھنوی بی۔اے۔ پی ایچ۔ڈی استاد اردو، مہاراشٹر کالج، بمبئی۔ مصنف دبستان دہ داستان آرزو

کے گہرے شغف کا پتا دیتے ہیں۔ عربی زبان و ادب کے وہ حدیث، تفسیر، فقہ، کلام، رجال اور تاریخ وغیرہ پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کئی مذہبی کتابیں بھی لکھیں جو بدقسمتی سے غدر کے ہنگامہ میں تلف ہوگئیں۔

شعر و سخن کا شوق منیر کو ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ دوران تعلیم ہی میں انھوں نے شعر کہنا شروع کردئیے تھے۔ شعر گوئی کے ساتھ ہی تحقیق زبان کا بھی ذوق ان میں پیدا ہوا۔ وہ بذریعہ خط و کتابت مجتہد الشعراء ناسخ لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور ان سے نکات زبان و فن کا درس لیتے رہے۔ یہ وہ دور تھا جب شعر و ادب کی دنیا میں ہر طرف ناسخ کا سکہ رواں تھا اور دہلی کے شعراء بھی — حتیٰ کہ مرزا غالب بھی — ناسخ کی طرز کی تقلید کو طرۂ افتخار جانتے تھے۔ منیر بھی اپنی کم‌سنی کے باوجود ناسخ کے ارادتمندوں میں شامل ہوئے۔ ایک تو خود جوہر قابل اور دوسرے ناسخ کے سے استاد کامل کا فیض تربیت، چنانچہ ابتدائے نوجوانی ہی میں منیر کے کمال کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا۔ جگہ جگہ وہ مشاعروں میں بلائے جانے لگے اور بڑے بڑے امراء ان کے قدردانوں میں شامل ہوگئے۔

۱۲۵۲ھ میں راجہ بختاور سنگھ کاشی نے آگرہ میں ایک بہت بڑا مشاعرہ منعقد کیا۔ منیر بھی اس میں طلب کئے گئے۔ اس مشاعرہ میں شرکت کے لئے اودھ کے سابق وزیر اعظم معتمد الدولہ نواب آغا میر کے بیٹے نواب نظام الدولہ بھی کانپور سے آگرہ گئے تھے۔ منیر نے مشاعرہ میں اپنی وہ معرکہ آرا غزل پڑھی جس کا مطلع ہے :

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا	بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

نظام الدولہ کو غزل بہت پسند آئی اور وہ منیر کو اپنے ہمراہ کانپور لےآئے۔ چند ہی ماہ بعد ناسخ کانپور پہنچے اور نواب امین الدولہ کے مہمان ہوئے۔ منیر نے استاد کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کیا اور جب تک ناسخ کانپور میں رہے ان سے برابر اکتساب فیض کرتے رہے۔ اس وقت منیر کی عمر محض چوبیس سال کی تھی لیکن یہ ناسخ کے سے یکتائے زمانہ کا فیض تربیت تھا وہ کم عمری ہی میں اساتذہ کے زمرہ میں شمار کئے جانے لگے۔ وہ خود فخریہ انداز میں کہتے ہیں :

دیــا استاد ناسخ سا شہنشاہ که جس کا سکه ہے ماہی سے تا ماہ
اسی مغفور کا صدقه ہے بالکل که ہر کوچه میں ہے تحقیق کا غل
اسی سے اختر اقبال اردو ثریا سے ہوا پہلو بــه پہلو

ناسخ چند ماہ کانپور میں قیام کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور منیر کو یه ہدایت کر گئے که وہ سید علی اوسط رشک سے مشورۂ سخن کرتے رہیں۔ رشک زبان و بیان کے بہت بڑے محقق تھے اور آگے چل کر ناسخ کے جانشین ہوئے۔ ان کا لغت اور رسالۂ تذکیر و تانیث زبان کا قیمتی سرمایه ہیں۔ رشک کا پایۂ استادی ہمارے ادب میں مسلّم ہے۔ ان کے کلام کی پختگی، روانی، سادگی اور درد و سوز پکار پکار کے کہتا ہے که وہ اپنے دور کے میر تھے۔ منیر نے کافی عرصه تک رشک سے استفادہ کیا۔ انھیں اپنے استاد سے گہری عقیدت اور شیفتگی تھی چنانچه انھوں نے ایک غزل استاد کی شان میں کہی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

یکتائے عصر و عالم و فاضل جناب رشک علامــه و محقـق کامل جناب رشک
استاد شاعران جہــاں سید جلیــل خناط و عابد و متوکل جناب رشک
اردو لغـات و قاعـدۂ فـن شاعری طے کرچکے تمام منازل جناب رشک
سب میں مجلدات ضخیمه تمـام کیں تصنیف کے جو ہوگئے مائل جناب رشک
دیوان تینوں مصحف اعجاز نظم ہیں رد کرچکے ہیں جادوئے بابل جناب رشک
ناسخ تھے آفتاب سپہر کمال کے برج علوم کے مه کامل جناب رشک
تصحیح میں ہیں رشک گروہ معاصرین تحقیق میں ہیں فخر اماثل جناب رشک

منیر ۱۲۵۶ھ تک نواب نظام الدولہ کے ملازم رہے۔ قلعه میں انھوں نے نواب کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

فـزاینـدۂ قـــدر اہل کمال سخن آفرین و سخن دان پناہ
به بحر سخاوت گرانمایه دُر به برج شرف ہمچو خورشید و ماہ
گہربخش و فیاض و اشراف دوست به اقـلیم اخلاق صاحب کلاہ

۱۲۵۷ھ میں میر لکھنؤ پہنچے۔ انھیں یه شہر بہت پسند آیا، چنانچه کہتے ہیں:

پیش نظر ہے سیر گلستان لکھنـــؤ ہر ایک سمت نور کا جلوہ ہے، دیکھ لو
جلسے مشاعروں کے ہیں یاروں کی صحبتیں ہر ایک فن شعر میں یکتا ہے، دیکھ لو
پریوں کی دید ہے سر بازار رات دن ہر کوچه میں طلسم کا میلا ہے، دیکھ لو

اس شہر کو میں کیوں نہ کہوں جنت نہم   اس کا نظیر دہر میں عنقا ہے، دیکھ لو
تاریخ میرے آنے کی ہاتف نے یوں کہی   زندہ منیر خلد میں پہنچا ہے، دیکھ لو

لیکن لکھنؤ کی جنت منیر کے لئے جہنم ثابت ہوئی۔ وہ مسلسل بیروزگاری اور پریشان حالی کا شکار رہے۔ وجہ یہ تھی کہ منیر اول تو ناسخ کے شاگرد تھے اور ناسخ معتمد الدولہ کا ساتھ دینے کی وجہ سے حکومت وقت کے معتوب تھے۔ دوسرے کئی سال تک خود معتمد الدولہ کے بیٹے کے ملازم رہ چکے تھے۔ اس لئے ارکان سلطنت ان سے اور بھی مشتبہ تھے۔ یہ محمد علی شاہ کا زمانہ تھا اور سلطنت اودھ زوال پذیر ہوچکی تھی۔ امرائے دولت اپنی اپنی فکر میں غلطاں تھے اور کوئی یہ پسند نہ کرتا تھا کہ ایک ایسے شاعر کو اپنی ڈیوڑھی سے منسلک کرے جس کا تعلق ناسخ اور معتمد الدولہ کے خاندان سے رہ چکا ہو۔ چنانچہ منیر کو بڑی پریشان حالی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ اسی دوران میں مرثیہ گوئی پر توجہ ہوئی یہ وہ دور تھا جب مرزا دبیر مرثیہ گوئی کی مملکت میں کوس عن الملکی بجا رہے تھے۔ میر انیس اس وقت تک لکھنؤ نہیں آئے تھے۔ چنانچہ منیر نے مرثیہ میں مرزا دبیر کی شاگردی اختیار کی اور درجنوں مراثی نظم کئے جو بالآخر تنگ حالی اور مفلسی کے ہاتھوں کسی مالدار متشاعر کے ہاتھ فروخت ہوگئے۔

مرزا دبیر سے منیر کی عقیدت کا اظہار اس نظم سے ہوتا ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

خلیل کعبۂ فکر رسا جناب دبیر   حکیم طور فصاحت ضیا جناب دبیر
جہان معنی و سرمایہ بخش دانش و علم   مربی ورع و اتقا جناب دبیر
شباب علم بدیع و بیان و معنی و نظم   مسیح ہر سخن جانفزا جناب دبیر
شہ سریر فصاحت مہ سپہر کمال   عروج طالع طبع رسا جناب دبیر
فرزدق و متنبی و دعبل و حسان   پکارتے ہیں کہ ہیں مقتدا جناب دبیر
بیاض نقش قدم شرح مسلّم منبر   کتاب واقعۂ کربلا جناب دبیر
ہر ایک مرثیہ عرش الکمال مضموں ہے   سخن وری میں ہیں معجزنما جناب دبیر
محیط و ہمت و در یگانۂ ایثار   سفینۂ یم خلق و عطا جناب دبیر
گل حدیث، مناقب کے روضۂ کافی   پناہ کشتی بحر البکا جناب دبیر

مرزا دبیر کی شاگردی پر ایک جگہ یوں اظہار فخر کیا ہے:

عطا کی مرثیہ میں اس کی اصلاح که جس کی بزم ہے خورشید مصباح
مسیحائے سخن اعجاز گستر دبیر پاک دیں، مقبول داور
چلے جب تک نسیم صبح گاہی سلامت ان کو رکھنا یا الٰہی

اس پریشانی اور بے روزگاری کے عالم میں ظفرالدولہ نواب علی اصغر خ
نے ان کی دستگیری کی، جس پر احسان شناسی کا جذبہ دعائیہ کلمات کی شَ
میں اُبل پڑا:

یا الٰہی رہیں جب تک فلک و ماہ و نجوم
تا کہ ہے سبز زمانہ میں چمن خلقت کا
تا چمن میں ہیں نہال اور نہالوں میں شاخ
تا کہ شاخوں میں ہیں گل، گل میں اثر رنگت کا
تا کہ رنگت میں لطافت ہے لطافت میں صبا
تا صفائی میں رواں قافلہ ہے نکہت کا
تا کہ نکہت سے دماغوں کو ہو کیفیت عطر
تا کہ ہو عطر سے روحوں کو مزا راحت کا
راحت و عیش بڑھے، جاہ و حشم افزوں ہو
تیرے قبضہ میں خزانہ رہے ہر دولت کا

لیکن چند ہی ماہ بعد یہ بساط الٹ گئی اور منیر مجبوراً کانپور چلے گئے جہ
معتمدالدولہ کے خلف اصغر معین‌الدولہ باقر علی خاں ظفر جنگ کے ملازم ہوگئے
مگر یہاں زیادہ دنوں تک نہ نبھ سکی۔ اس لئے انھوں نے ملازمت ترک کرد
اور پھر وہی بیروزگاری اور پریشان حالی کا دور شروع ہوگیا۔ اس ناسازگار ا
پُرآشوب زمانہ میں نواب احمد حسین سالک نے ان کی بڑی دستگیری اور امد
فرمائی۔ چنانچہ کلیات میں ان کی مدح میں دو قطعات تہنیت اور کئی تاریخیں موج
ہیں ایک قطعہ کی تشبیب ملاحظہ ہو۔ تلاش، مضامین آمد خیالات اور زور ب
قابل توجہ ہیں:

ازل کے دن سے نہیں ہے علاقہ کوئی شے چمک ہے بہر قمر، چاک دل کتاں کے لئے
اثر ملا سخن تلخ کو ہلاہل کا بنی حلاوت جاں لذت بیاں کے لئے
نصیب فصل بہاری کو سرخروئی ہے بنی ہے زردیٔ رخ موسم خزاں کے لئے

ہجوم غم کہیں کشتوں کے کھیت کا حاصل کہیں شگفتہ دلی کشت زعفراں کے لئے
برائے تیغ سخن جوہر فصاحت ہیں سخن کا ہے خم و چم خنجر زباں کے لئے
شراب آب بقـــا بھر ساغر ظلمات مسیح و خضر بنے عمر جاوداں کے لئے
پئے طواف حرم اہل قید ساعی ہیں برہمنوں کی جبیں سجدۂ بتاں کے لئے
نزول جانب پستی برائے صید زبوں عروج طائر فردوس آشیاں کے لئے
نظر کے واسطے آنکھیں حواس بھر دماغ لہو رگوں کے لئے مغز استخواں کے لئے
بتوں کے واسطے انداز دلبری و ادا نیاز و عجز و وفا طبع عاشقاں کے لئے
خلش ہوئی مژۂ تیر کے لئے پیدا بنی ہے چین و شکن ابروئے کماں کے لئے
تلاش معنی روشن برائے طبع منیر منیر مدحت احمد حسین خاں کے لئے

قصیدہ میں تشبیب سے مدح کی جانب گریز ایک بڑی سخت منزل ہوتی ہے جہاں شاعر کے کمال اور اس کی قدرت بیان کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ "اگر گریز فطری اور مربوط ہو تو شاعر کی پختہ مشقی اور استادی سلیم کی جاتی ہے۔ اور اگر ربط کا دامن چھوٹ جائے تو اسے کمزوری کی دلیل سمجھا جاتا ہے" مذکورہ بالا قصیدہ میں گریز اتنا فطری، اتنا خوبصورت اور اتنا مربوط ہے جس کی مثال کمتر دستیاب ہوتی ہے۔ منیر کا یہ قصیدہ ان کے ابتدائی دور شاعری سے تعلق رکھتا جب نہ ان کا فن نکھرا تھا اور نہ تجربے اور مشق نے انہیں وہ پختہ مشقی عطا کی تھی جو عمر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن مضامین کی آمد، فکر کی ندرت، اور بندشوں کا حسن ان کے روشن مستقبل کا صاف پتا دے رہا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس شخص میں مضامین کی دریافت اور تخلیق کی صلاحیتیں موجود ہیں

نواب احمد حسین خاں کی مدح میں دوسرا قصیدہ بھی خوب ہے۔ صرف دعائیہ قطعہ کے چار شعر ملاحظہ ہوں:

جب تک کہ آفتاب سے تارے چھپا کریں
جب تک ہیں ذرے مہر درخشاں کے سامنے
جب تک پڑے ہوں بال حسینوں کی پشت پر
آئینے تا ہوں چہــرۂ خوباں کے سامنے
جبتک کہ گل چمن میں کریں بلبلوں سے ناز
جب تک ہوں بلبلیں گل بستاں کے سامنے

ممدوح کو شکوہ سکندر نصیب ہو
ہر ایک دم ہو عیش فراواں کے سامنے

کچھ دنوں بعد اسدالدولہ رستم الملک محمد ذکی خاں بہادر فیل جنگ ع
نواب بہادر ذکی نے منیر سے اصلاح لینا شروع کی اور انہیں لکھنؤ بلا بھیج
میں دو سال تک لکھنؤ میں رہے۔ نواب بہادر کی سفارش سے انہیں واجد علی
کے دربار میں رسائی نصیب ہوئی۔ جہاں انہوں نے ایک نہایت شاندار قصہ
نذر گذرانا۔ اس کا مطلع ہے:

آئینۂ سخن کے لئے گھر ہو آب میں ہاتھ آئے سیر کشتیٔ اسکندر آب میں

نہایت سنگلاخ زمین ہے۔ لیکن منیر پتھروں کو کاٹ کر ہیرے اور سمندر کا
چاک کرکے موتی نکالے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

واجد علی شہنشہ بحر و بر جہاں نوشیرواں ہے بر میں تو اسکندر آب میں
دریا دل و فرشتہ خصال و محیط فیض خشکی میں ابر جود، کرم گستر آب میں
کیا کیا کہوں میں فیض کی اس کے تعلیاں جانے در و صدف ہیں مہ و اختر آب میں
شاہنشہ جہاں کی عدالت ہے اس قدر مشکل نہیں جو آگ بنائے گھر آب میں
وہ عدل ہے کہ ربط نقیضین ہو عیاں ہر قطرہ آگ میں رہے ہر اخگر آب میں
نور خدا ہے جسم منور میں یوں بھرا گوہر میں جیسے آب رہے، گوہر آب میں

بادشاہ کے لئے دعا ان الفاظ میں کی ہے:

جبتک ہوں آسماں و زمیں، ماہ و آفتاب جبتک کہ لعل کان میں ہو، گوہر آب
جبتک ہوں تاک باغ میں، انگور تاک میں جبتک شراب خم میں ہو، نشہ شراب
جبتک کہ چوب خشک سے کشتی بنا کرے جبتک کہ کشتیوں کے رہیں لنگر آب
تا ہو حیات خانۂ ہستی میں میہماں جبتک طناب موج کھنچے یکسر آب
خشکی میں ہوں عروج سلیماں کے مرتبے جاری ہو حکم صورت اسکندر آب
مثل نجوم فوج سمندر میں ہو رواں پیدا ہو صورت فلک اخضر آب
افزوں ہو عمر و دولت سلطاں خدا کرے الیاس بر میں، خضر صفا پرور آپ

اگلے زمانہ میں سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا استادی، کہنہ مشقی، قد
بیان اور کمال سخنوری کی دلیل تسلیم کیا جاتا تھا۔ قصائد میں خاص طور
سنگلاخ زمینیں اختیار کی جاتی تھیں تاکہ زبان و بیان پر شاعر کی قدرت کا اظ

ہوسکے اور سامعین یہ سمجھنے اور ماننے پر مجبور ہوجائیں کہ شاعر کی علمی، ذہنی اور فکری سطح بلند ہے۔ غزل میں بھی تمام ممتاز اساتذہ نے مشکل بحریں اور سنگلاخ زمینیں اختیار کرکے اپنی استادی تسلیم کرائی ہے۔

منیر دو سال تک لکھنؤ میں رہے اور زندگی یک گونہ سکون سے بسر ہوتی رہی۔ اس کے بعد نصیر الدولہ، معین الملک۔ نواب تجمل حسین خاں حشمت جنگ، رئیس فرخ آباد نے بڑے اصرار سے انہیں بلایا۔ چنانچہ منیر نے لکھنؤ چھوڑا اور اور فرخ آباد چلے گئے۔ نواب موصوف نے ان کی بڑی قدر افزائی فرمائی۔ فرخ آباد کے بڑے بڑے امرا ان کے شاگرد ہوگئے اور ان کے فیض تربیت سے فرخ آباد ایک اچھا ادبی مرکز بن گیا۔

نواب تجمل حسین خاں کی مدح میں منیر نے ایک پر زور قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:

قلـــزم فیض سے کسکے ہوئے پیدا گوہر
اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر

حسب عادت زمین بھی سنگلاخ اختیار کی ہے اور اس میں مضمون آفرینی کے اچھے جوہر دکھائے ہیں

شومیٔ قسمت نے روز بد دکھایا۔ نواب جنت کو سدھارے اور منیر ایک بار پھر بے سہارا ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نواب یوسف علی خاں ولیعہد رام پور تھے۔ وہ منیر کے قدردانوں میں تھے۔ انہیں جب حالات کا علم ہوا تو طلبی کا پروانہ روانہ کیا۔ لیکن منیر فرخ آباد چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ شقہ کے جواب میں ایک عریضہ ارسال کردیا جس میں تعمیل ارشاد کا عذر کرتے ہوئے یہ وعدہ کیاکہ آیندہ کسی موقع پر رام پور ضرور عدم حاضر ہوں گا۔ اس منظوم عریضہ کا یہ شعر خوب ہے:

دربار میں منیر غزل خوانیاں کرے　　طوطی حضور مول لیں یہ بولتا ہوا

منیر رام پور گئے ضرور مگر اس وقت نواب یوسف علی خاں عرش آشیاں ہوچکے تھے۔

الور اور دھولپور کے مہاراجگان نے بھی منیر کو طلب کیا۔ لیکن وہ پریشاں حالی اور بیروزگاری کے باوجود فرخ آباد سے نہیں نکلے۔ آخر ۱۲۶۱ھ میں نواب علی بہادر، والیٔ ریاست باندہ ان کے شاگرد ہوئے اور ان کے اصرار پر منیر باندہ منتقل ہوگئے۔

منیر کے فرخ آباد نہ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ زہرہ نامی ایک مغنہ کے عشق میں مبتلا تھے اور فقر و ناداری، افلاس و بیروزگاری کے باوجود اس کی جدائی کا غم سہنے پر تیار نہیں تھے۔ نواب صاحب باندہ کی ملازمت انھوں نے محض اس لئے قبول کرلی تھی کہ اس میں انھیں آزادی تھی کہ جب چاہیں باندہ میں رہیں اور جب چاہیں فرخ آباد میں قیام کریں۔ چنانچہ وہ اس سہولت سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے اور اکثر و بیشتر فرخ آباد ہی میں رہا کرتے تھے۔

باندہ کی ملازمت کو ایک ہی سال گذرا تھا کہ منیر کی محبوبہ کا انتقال ہوگیا جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ زہرہ کے قطعۂ تاریخ انتقال میں انھوں نے اپنے داغہائے دل کی نمود ان الفاظ میں کی ہے:

دیدیا داغ فراق اسدی دل کو مرے ہائے اے جان جہاں، تیری جوانی ہے ہے
ہائے وہ حسن، وہ ناچ اور وہ گانا تیرا رہ گئی سارے کمالوں کی کہانی ہے ہے
زخمی خنجر ابرو کو تڑپتا چھوڑا نہ پلایا مجھے تلوار کا پانی ہے ہے
ہائے وہ چشم سیاہ و نگہ شرم آلود وائے ان گیسوؤں کی مشک فشانی ہے ہے
سب میں مشہور ہے جو مجھ سے وفا کی تونے کہی جاتی ہے مروت کی کہانی ہے ہے
بے ترے اے گل تر بلبلوں کو باغوں میں ہے ترانے کے عوض مرثیہ خوانی ہے ہے
ہائے وہ خوبی تقریر و سخن فہمی ہائے خاک میں مل گئی ساری ہمہ دانی ہے ہے
ہائے میں مر نہ گیا تیرے عوض اے گلرو رہ گیا دل میں ترا داغ جوانی ہے ہے
رو کے پڑھتا ہے یہی مصرع تاریخ منیر زہـرۂ مہر لقـا، لیلیٔ ثانی ہے ہے
(۱۲۶۲)

منیر نے زہرہ کی ایک اور تاریخ وفات کہی ہے جو محض لفظوں کی نشست بدل دینے سے تین مختلف بحروں میں پڑھی جاتی ہے: مثلاً

ع نیا یہ اب مجھے غم ہوگیا دل (بحر ہزج)

ع یہ اب مجھے غم ہوگیا اے دل نیا (بحر رجز)

ع اب مجھے غم ہوگیا اے دل نیا یہ (بحر رمل)

نواب علی بہادر کو منیر سے گہری عقیدت تھی اور منیر بھی اپنے مربی محسن شاگرد سے بہت محبت کرتے تھے۔ نواب کی شان میں متعدد قصائد، قطعہ

تہنیت، عرائض اور قطعات تاریخ ان کے کلیات میں موجود ہیں۔" انھوں نے ایک مدحیہ قطعہ صنعت غیر منقوطہ میں بھی کہا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

مدعاء اہل عالم سرور اہل کرم مہر عدل و کوہ حلم و عالم علم عطا
وہ سوار عرصۂ مہر اور اس کا راہوار عمر اعدا روح و طاؤس و ہما وہم و ہوا
لمحۂ طور کرم سرو مراد اہل دل مہر لامع ماہ ساطع سرور ملک عطا
حکم اُس کا کوہ آسا اور وہ لعل کرم عدل اس کا عطر گل وہ اہل دل کا مدعا

۱۲۶۴ھ میں منیر کا پہلا دیوان شائع ہوا جس کا نام نواب صاحب باندہ نے "منتخب العالم" تجویز کیا۔ یہ تاریخی نام ہے، اور اس سے ۱۲۶۴ھ نکلتے ہیں۔ اس وقت منیر کی عمر محض ۳۵ سال کی تھی۔ لیکن اس کم عمری میں بھی وہ ملک کے ممتاز اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ بھی بکثرت موجود تھے جو ان کے کمال سخن اور زبان و فن پر ان کی قدرت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

باندہ میں منیر کے چند سال فراغت سے بسر ہوئے۔ لیکن یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوستانی ریاستیں یا تو ختم ہوچکی تھیں یا انگریزوں کی باجگزار بن چکی تھیں۔ مراٹھوں کے بعد سکھوں کا منیر اقبال بھی ہمیشہ کے لئے ڈوب چکا تھا۔ دہلی میں بہادر شاہ ظفر موجود تھے۔ لیکن سرکار انگریزی یہ فیصلہ کرچکی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد لال قلعہ پر بھی قبضہ کرلیا جائے گا اور مغلوں کی برائے نام بادشاہت بھی ختم کردی جائے گی۔ لارڈ ڈلہوزی کی تسخیر ملکی اور الحاق کی پالیسی پورے شباب پر تھی۔ انگریزوں نے محض یہی نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کا خاتمہ کردیا تھا بلکہ ملک کی معاشی زندگی بھی تہ و بالا کردی تھی۔ دیسی صنعتوں کو تقریباً ختم کردیا گیا تھا۔ تعلیم گاہیں ویران کردی گئی تھیں۔ ریاستوں کے خاتمہ کے ساتھ بے روزگاری کی وبا عام ہوچکی تھی۔ پورا معاشرہ تلپٹ ہوکر رہ گیا تھا۔ غلامی کے احساس نے دلوں میں پژمردگی، ہمتوں میں پستی اور عزائم میں افسردگی پیدا کردی تھی۔ منیر حساس بھی تھے اور محب وطن بھی۔ ان کا دل اپنے وطن کی غلامی اور تاراجی پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس وقت جب کہ مرزا غالب ملکہ وکٹوریہ سے "کوئن پوئیٹ" (دربار انگریزی کے ملک الشعرا) ہونے کی درخواست کرکے اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ منیر باندہ اور

فرخ آباد کے رؤساء کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر ابھار رہے تھے ۔ اسی دور میں انتزاع سلطنت اودھ کے واقعہ نے ہندوستان بھر میں ایک آگ سی لگادی ا ۱۸۵۷ء میں اتر پردیس ، دہلی اور بہار میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے ۔ منیر ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے ، انھوں نے سمجھا بجھاکر نواب صاحب باندہ اور نواب فرخ آباد کو بھی انگریزوں کے خلاف انقلاب کی مہم میں شامل کرادیا ۔ نواب صاحب باندہ کی فوجوں کو شکست ہونے لگی ۔ تو منیر حصول امداد کے لئے فرخ آباد گئے لیکن وہاں تفضل حسین خاں کی بازی الٹ چکی تھی ۔ اس لئے باندہ کو کمک پہنچنے کا سوال ہی نہیں تھا جو مدد حاصل بھی ہوئی وہ سود مند ثابت نہیں ہوئی ادھر بہادر شاہ ظفر نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالہ کردیا ۔ جرنیل بخت خ نامراد و مایوس دہلی سے فرار ہوگئے ۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی فوجوں نے گھونگھٹ دکھایا ۔ مولوی احمداللہ ، نواب مجیدالدین احمد خاں ، نواب بہادر خاں ا عظیم اللہ خاں کو بھی ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا ۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں حصہ لینے والے تمام لوگ یا تو مارے گئے یا قید فرنگ کا شکار ہوئے ۔ نواب صاحب باندہ بھی شکست کھاکر بھاگنے پر مجبور ہوئے ۔ منیر کے لئے یہ دور انتہا صبر آزما تھا ۔ ان کی گرفتاری کا اشتہار شائع ہوچکا تھا اور کوئی انہیں پناہ دینے پر تیار نہیں تھا ۔ آخر مجبوراً گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ روپوش ہوگ اور اسی روپوشی کے عالم میں دو سال تک ادھر اُدھر بھٹکتے رہے ۔ چراغ المجالس نے اس زمانہ کا ایک واقعہ لکھا ہے جو درد ناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی وہ لکھتے ہیں :

«میرے ایک بزرگ جو نواح فرخ آباد کے رہنے والے ہیں ، بیان فرماتے تھے کہ ایک رات کو ایک قدآور فقیر آیا جو ایک تہمد لگائے ملا کچیلا کرتا پہنے ہوئے تھا ۔ اس نے نہ دست سوال دراز کیا نہ منہ سے کچھ بولا ، تصویر کی طرح خاموش ، دیر تک گردن جھکائے کھڑا رہا ۔ زبان حال سے گویا میر مرحوم کا یہ شعر پڑھتا ہو»:

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے

« والد مرحوم نے پوچھا ، بھئی تم کیا چاہتے ہو؟ جب بھی اس نے کوئی

جواب نہیں دیا۔ والد مرحوم نے نوکروں کو کسی بہانہ سے وہاں سے بھیج دیا اور اس فقیر سے کہا «میر صاحب، میں نے آپ کو پہچان لیا۔ مگر افسوس! میں آپ کو چھپا نہیں سکتا۔ اگر مجھے کچھ نقصان پہنچے اور آپ بچ جائیں جب بھی مضائقہ نہیں۔ مگر افسوس کہ آپ کا اشتہار گرفتاری جاری ہے۔ آپ ضرور گرفتار ہوجائیں گے»۔ یہ کہہ کر کچھ ان کی خفیہ خدمت کی نہ معلوم کتنی اشرفیاں دیں۔ وہ صاحب چلے گئے۔ دو چار دن بعد والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ «بیٹا، تم نے ان فقیر کو نہیں پہچانا، وہ سید منیر تھے۔»

اسی دربدری، رو پوشی اور مصیبت کے عالم میں انہوں نے ایک بڑا معرکہ آرا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

نور خورشید جو ہو صاعقۂ طور حمل موسی روز کرے عصر دل شب میں عمل

اس قصیدہ کے آخر میں اپنے حالات پر بڑے درد ناک انداز میں روشنی ڈالی ہے، ملاحظہ ہو:

اس زمانہ میں کہا ہے یہ قصیدہ میں نے که مصائب میں گرفتار ہیں اعلیٰ اسفل
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل
ننگ ہے ستر بدن، فرش ہے اک کہنہ حصیر جان و عزت کے تردد کے مصیبت پر بل
مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد پر کتابوں کے تلف ہونے سے ہے کرب اجل
میری تصنیف سے تھے جتنے رسالے نایاب ان کے گم ہونے سے ہے لذت ہستی میں خلل

یہ قصیدہ سنہ ۱۲۷۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس دوران میں جہاں انہیں افلاس، تنگدستی دربدری، پریشانی، خوف اور ذہنی و روحانی اذیت کا سامنا رہا وہیں یہ چیز بھی ان کے لئے سوہان روح تھی کہ روزانہ اس قسم کی خبریں ملاکرتی تھیں کہ فلاں دوست کو پھانسی ہوگئی۔ فلاں شاگرد کو گولی ماردی گئی۔ فلاں محسن گرفتار ہوگئے۔ فلاں عزیز کو حبس دوام کی سزا ہوگئی۔ ان خبروں سے ان کے دل پر جو کچھ گذرتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ پھر ہر وقت موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی ہمہ وقت گرفتاری کا کھٹکا لگا رہتا تھا اس صورت حال کے نتیجے میں قلب و ذہن کا جو عالم ہوگا اس کا علم بس اللہ کو ہے لیکن منیر بڑے مضبوط قلب و جگر کے آدمی تھے۔ اس حالت میں بھی فکر سخن سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ اس دور کی تمام غزلیں ان کے دیوان دونم میں موجود ہیں۔

اردو کے اساتذہ میں یہ شرف صرف منیر کو حاصل ہے کہ انھوں نے نہ صر
کہ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملاً حصہ لیا ، دربدری ، خانہ ویرانی ، قید ا
اور جلا وطنی کے مصائب برداشت کئے بلکہ اس جہاد حریت کی بہت سی داست
کو آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ کرگئے ۔ موت کے سایہ میں بھی ان محبان وطن
قطعات تاریخ وفات نظم کرتے رہے جنھیں پھانسیوں پر چڑھایا جارہا تھا یا جو قید ا
کی سزاؤں میں مبتلا کئے جارہے تھے ۔ کلیات منیر کی بدولت بہت سے شہیدان
کے نام آج تک زندہ ہیں ۔ منیر کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں وہ منفرد

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۷ء
جنگ آزادی میں مارے جانے والوں کے لئے منیر نے ہر جگہ لفظ «شہید» است
کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک
کا درجہ رکھتی تھی اور جن لوگوں نے اس «جہاد» میں اپنی جانیں جان آفریں
سپرد کیں وہ مرتبۂ شہادت پر فائز تھے ۔ چنانچہ انھوں نے اقبال مند خاں اور غ
حسین خاں رئیسان فرخ آباد کو پھانسی دی گئی تو تاریخ نکالی :

دونوں شہید راہ خدا آہ ! ہائے ہائے !!

(سنہ ۱۲۷۴ھ)

نواب سخاوت حسین خاں کو پھانسی ہوئی تو یہ تاریخ کہی :

ہوا شہید امیر دلیر با ہمت

(سنہ ۱۲۷۴ھ)

مولانا محمد باقر دہلوی کو گولی ماردی گئی تو ان کے قطعۂ تاریخ میں

خدا کی راہ میں مقتول ہوکے آخر کار — گئے جہاں سے وہ سوئے روضۂ رضوا
کہی منیر نے یہ ان کی مرگ کی تاریخ — شہید و متقی و عالم علوم نہا
(۱۲۷۴ھ)

امجد علی خاں کو پھانسی دی گئی تو یہ تاریخ نکلی :

ہائے اہل دل جواں امجد علی خاں شہید

(سنہ ۱۲۷۴)

منیر دو سال تک ادھر ادھر چھپتے رہے ۔ لیکن کب تک بچتے ۔ آخر
ہوئے ۔ دو سال تک ہندوستان میں قید و بند کے شدائد جھیلنے کے بعد عبور د

شور کی سزا کے مستحق قرار دئے گئے۔ وہ فرخ آباد سے الہ آباد لائے گئے اور وہاں سے براہ بنارس کلکتہ بھیج دئے گئے۔ بنارس پہنچے تو وہاں مشاعرہ تھا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ منیر قید ہوکر آئے ہیں تو کچھ لوگوں نے انگریز سپاہیوں سے کہہ سن کر اس کی اجازت لے لی کہ منیر شریک مشاعرہ ہوں۔ رات کو منیر ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں پہنے مشاعرہ میں پہنچے۔ انہوں نے غزل پڑھی اور حسب حال پڑھی:

جنگلوں میں کر رہی ہیں لالہ کاری بیڑیاں پاؤں کو دیتی ہیں رنگ خون جاری بیڑیاں
کس قدر کڑیاں اٹھاتی ہیں ہماری بیڑیاں ٹھوکریں کھاتی ہوئی آتی ہیں ہردم ساتھ ساتھ
دیکھئے منزل ہے بھاری یا ہیں بھاری بیڑیاں ہم ہیں پیدل، راہ طولانی، سفر ہے دور کا

معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عین مشاعرہ میں اس زمین میں چند شعر کہہ کر سنا دئے تھے۔ باقی غزل انڈمان پہنچ کر مکمل کی اور مقطع میں بیڑیاں کٹنے کی تاریخ بھی کہہ دی:

قطعِ زنجیر ستم کی ہے یہ تاریخ اے منیر
کٹ گئیں کیا لطف سے آپ ہی ہماری بیڑیاں

منیر نے فرخ آباد سے انڈمان تک کے سفر اور شدائد قید کا حال تفصیل کے ساتھ ایک قطعہ میں نظم کیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

چھٹ گئے سب گردش تقدیر سے فرخ آباد اور یاران شفیق
سو طرح کی ذات و تحقیر سے آئے باندہ میں مقید ہو کے ہم
خون ٹپکے ہر لب تقریر سے کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر
سہتے تھے ہم گردش تقدیر سے باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم
تھی نجس تر خانۂ خنزیر سے بول و غایظ کی جگہ بستر کے پاس
چاہتے تھے خنجر و شمشیر سے پانی تھا نایاب مثل آبرو
قطرۂ پیکاں جو ملتا تیر سے مثل گوہر جانتے اس کو عزیز
سہل تھی اس سختی تقدیر سے سختی نزع یہودی و مجوس

برطانوی جیل کی تصویر ملاحظہ ہو:

تھا یہ حاصل مطبخ تقدیر سے گالیاں تھیں کھانے کو یا زخم و داغ
نان گندم تھی سوا اکسیر سے روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں

گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب	خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
بھینس کی سانی سے بدتر دال تھی	سخت دانہ دانۂ زنجیر سے
کرکری، بدبو، ثقیل و بے نمک	سرد تر وہ بھی مزاج پیر سے
تھا بچھونا ٹاٹ، کمبل اوڑھنا	گرم تر پشمینۂ کشمیر سے
کوٹھری گرمی میں دوزخ سے فزوں	دست و پا بدتر تھے آتشگیر سے
کانپتے تھے موسم سرما میں یوں	جیسے عریاں سردیٔ کشمیر سے
محنت و مزدوری و تکلیف و رنج	تھا زیادہ حیطۂ تحریر سے

اور اب ذرا پولیس والوں کا کردار بھی ملاحظہ کیجئے :

اس جہنم کے مؤکل سب کے سب	دشمنی رکھتے تھے بے تقصیر سے
قاتل اشراف و اہل علم تھے	رنج پہنچاتے تھے ہر تدبیر سے
بے مروت، بے حیا، اہل دغا	کج طبیعت ہر جوان و پیر سے
ان کے ہونٹوں نے خاش کے واسطے	باتیں سیکھی تھیں زبانِ تیر سے
جعل میں ٹھگ، بدیا میں بے بدل	نقد جاں تک چھین لیں تزویر سے
کاہ سے اٹھوائیں وہ کوہ گراں	ور نہ گذریں کودک بے شیر سے

اب داستان سفر بھی مختصراً سن لیجئے :

پھر الہ آباد میں بھجوادیا	ظلم سے، تلبیس سے، تزویر سے
ننگی تلواریں کھنچی تھیں گرد و پیش	نوکیں سنگینوں کی بدتر تیر سے
جو الہ آباد میں گذرے ستم	ہیں فزوں تقریر سے، تحریر سے
پھر ہوئے کلکتہ کو پیدل رواں	گرتے پڑتے پاؤں کی زنجیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں، بیڑی پاؤں میں	ناتواں تر قیس کی تصویر سے
راستے میں ظلم اعدا بے شمار	ہر گھڑی تھے شامت تقدیر سے
بے حواس و بے لباس و بے دیار	دل گرفتہ جور چرخ پیر سے
سوئے مشرق لائے مغرب سے مجھے	تھی غرض تقدیر کو تشہیر سے
نقشہ کلکتہ میں کھنچوایا مرا	رنگ منھ کا اڑگیا تصویر سے
کالے پانی میں جو پہنچے یک بیک	کٹ گئی قید ستم تقدیر سے
یہ کہی تاریخ ہم نے اے منیر	صاف نکلے خانۂ زنجیر سے

(۱۲۷۷ھ)

اس قطعہ سے جہاں ان مصائب کا اندازہ ہوتا ہے جو منیر کو قید فرنگ میں اٹھانا پڑے ، وہیں یہ بھی معلوم ہو تاہے کہ غدر کے مجرموں کو کن شدائد کا سامنا کرنا پڑا. انگریزوں کے جیل خانے کیسے تھے ، پولیس کا طرز عمل کیا تھا ، اور انگریزوں نے جن محبان وطن کو گرفتار کیا تھا ان کو کتنی شدید انتقامی کارروائیوں کا شکار بننا پڑا فرخ آباد سے براہ الہ آباد کلکتہ تک پابہ جولاں پیدل سفر ہی کتنا صبر آزما اور جانگسل ہوسکتا ہے ، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ سختیاں محض منیر کے لئے نہیں تھیں ۔ یہ انگریزوں کا عام طریقہ تھا اور غدر کے سارے اسیروں کو انہیں مصائب و شدائد کا شکار ہونا پڑا تھا ۔ بدقسمتی سے ہمارے کسی دوسرے شاعر یا ادیب نے تو کیا کسی مؤرخ نے بھی انگریزوں کے ڈر سے ان لرزہ خیز اور روح فرسا مصائب کا ذکر کرنے کی جرأت نہیں کی. یہ منیر کی حقیقت نگاری ہی کا نہیں بلکہ ان کے باغیانہ فکر و قلم کا نتیجہ ہے کہ ہم مظلومین غــدر کی زندگی کے اس دردآفریں پہلو کی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں ۔

منیر انڈمان پہنچے تو اتفـاق سے وہاں قیدخانے کے لئے ایک منشی کی ضرورت تھی ۔ اس لئے جیلر نے انہیں چھ روپئے ماہوار پر قیدخانہ کا محاسب مقرر کردیا ۔ دو برس بعد آٹھ روپئے ماہوار ہوگئے ۔ اور مزید دو سال گذرنے کے بعد دس روپئے ماہوار ملنے لگے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

پہلے ہوئی چھ روپئے ہماری تنخواہ پھر آٹھ سے دس ہوئے خدا ہے آگاہ
نانوے کا پھیر رہا قید میں بھی لاحول و لا قــوۃ الاّ باللہ

ہر چند محاسبوں میں کم وقعت ہیں پر قیــدیوں کے کفیل کیفیت ہیں
لکھتے ہیں رہائی و اسیری سب کی ہم نقل نویس دفــتر قسمت ہیں

(باقی)

* احمر لاری

آفتاب ہند

" آفتاب ہند " انیسویں صدی کے وسط کا ایک اہم اخبار تھا جو بنارس نکلتا تھا۔ خبروں کے علاوہ اس میں علمی ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ پہلے اخبار ہفتہ وار تھا۔ بعد میں ایڈیٹر کی تبدیلی کی وجہ سے پندرہ روزہ ہوگیا۔ کے مندرجات سے اس دور کے ہندوستان کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی ز کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ کئی محققوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی سنہ اجرا، مدت اشاعت اور ایڈیٹر وغیرہ کے متعلق ان میں کافی اختلاف رائ راقم السطور کے زیر مطالعہ اس اخبار کی ۵۷۔۱۸۵۶ع (۷ اپریل ۱۸۵۶ ت ۱۸۵۷ع) کی فائل ہے جس کے اب تک کے مسلمات کی تردید ہوتی ہے۔ اس میں کل اکیس شمارے ہیں ۷ جولائی اور ۲۲ جولائی ۱۸۵۶ع کا شمارہ مشترکہ ۷ دسمبر ۱۸۵۶ء، ۲۲ دسمبر ۱۸۵۶ء ۲۲ مارچ ۱۸۵۷ اور ۷ اپریل ۱۸۵۷ کے ش شائع نہیں ہوئے تھے۔ اکیس عام شماروں کے علاوہ فائل میں ایک غیر معمولی بھی ہے جو ۱۰ فروری ۱۸۵۶ء کا ہے اور چار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مملکت کے الحاق سے متعلق انگریزی حکومت کے اعلانیہ کے لئے وقف ہے۔

اخبار کے پہلے صفحہ کے بالائی نصف حصے پر سورج کی تصویر ہے جس کے پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں۔ سورج کے دائرے کے اندر اردو او انگریزی میں "آفتاب ہند" لکھا اس کے علاوہ انگریزی میں یہ عبارت درج ہے : "ished 7 & 22 of every month" اور اردو میں یہ عبارت ہے، " قیمت اس کی چھ روپیہ سال پیشگی۔ سال ب پیشگی دینے والوں کو ٹکٹ لگاکر بھیجا جاتا ہے ہر مہینے کی ساتویں اور ب کو طلوع ہوتا ہے " اخبار دو کالمی ہے اور سائز ۷ × ۱۰ پر چوپا ہ صفحات کی تعداد معین نہیں۔ اوسطاً ہر شمارے میں سولہ صفحات ہیں۔ ا مہتمم (اڈیٹر) بابو گوبند شیرالی تھے اور یہ کاشی پریس بنارس میں چھپتا تھا،

* ڈاکٹر نور الامین احمر لاری، ام۔اے، پی ایچ۔ ڈی، استاد اردو، گورکھ پور یونیورسٹی، گورکھپور (یو پی

آخری صفحہ پر پرنٹ لائن پر درج منقولہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے :-

« مطبع کاشی پریس بنارس میں باہتمام بابو گوبند چندر شریالی بمکان بابو کالی ناتھ باپولی عرف راجا بابو مرحوم بہ محلہ کیدار گھاٹ مطبع ہوا۔ »

۱۸۵۶ع اور ۱۸۵۷ع کے شماروں پر بالترتیب جلد نمبر ۳ اور جلد نمبر ۴ درج ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ پندرہ روزہ «آفتاب ہند» ۱۸۵۴ع میں جاری ہوا۔

اس اخبار کا ذکر سب سے پہلے گارساں دتاسی کے یہاں ملتا ہے وہ لکھتا ہے۔

« بنارس سے ایک اردو اخبار جاری ہوا ہے جس کا نام آفتاب ہند ہے۔ اس کے اڈیٹر بابو گوبندرا گھوناتھ ہیں جو سکھوں کی تاریخ اور دوسری قابل قدر تصانیف کے مصنف ہیں۔ یہ اخبار اپنے مخصوص طرز تحریر اور اعلیٰ علمی و ادبی مضامین کی وجہ سے جو ہمیشہ اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں بہت مشہور ہے۔»[1]

دتاسی کے یہاں اڈیٹر کے نام میں تھوڑا سا فرق ملتا ہے۔ ۱۸۵۳ع کی سرکاری رپورٹ میں اخبار کے اڈیٹر کا نام گوبندرگھوناتھ شرالی درج ہے۔[2] غالباً دتاسی نے اڈیٹر کا نام سرکاری رپورٹ سے لیا ہے اور شرالی کو حذف کر کے صرف گوبند رگھوناتھ لکھا ہے۔ میرے پیش نظر جو شمارے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہے کہ اڈیٹر کا نام گوبند چندر شرالی تھا نا کہ گوبند رگھوناتھ شرالی۔ دتاسی نے اخبار کے سنہ اجرا پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے اور یہ لکھا ہے کہ یہ اخبار ہفتہ وار تھا یا پندرہ روزہ۔ لیکن چونکہ اُس نے اس اخبار کا ذکر اپنے ۲ دسمبر ۱۸۵۵ع کے خطبے میں کیا ہے اور اڈیٹر کا نام گوبندرگھوناتھ لکھا ہے، اس لئے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس پیش نظر پندرہ روزہ «آفتاب ہند» تھا جو ۱۸۵۴ء میں زیر اہتمام بابو گوبند چندر شرالی جاری ہوا۔

اس کے بعد اس اخبار کا ذکر حاجی سید محمد اشرف کی تالیف «اختر شاہنشاہی (مطبوعہ جون ۱۸۸۸ع) میں ملتا ہے۔ مؤلف مذکور اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

۱ خطبات گارساں دتاسی (خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ع)، ص ۱۸۴

۲ محمد عتیق صدیقی، صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ - ۱۸۵۳ع) ص ۹۶

« آفتاب ہند بنارس، مطبع کاشی پریس، با اہتمام بابو گوبند چندر شرالی به مکان بابو کالی ناتھ باپولی عرف راجه بابو مرحوم، به محله کیدار گھاٹ تھانه بمیل پوره، پندره روزه، به تاریخ ساتویں یا بائیسوئیں کو شائع ہوتا ہے، سالانه قیمت ٦ باره ورق اوسط، اجرائی ۱۸۵۴ع [1]

محمد عتیق صدیقی نے اپنی تالیف « صوبه شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوء میں محوله بالا اقتباس نقل کرنے سے پہلے یه جمله لکھا ہے: « اختر شاہنشاہی نے ذیل معلومات فراہم کی ہیں، جن میں سے بیشتر صحیح نہیں حالانکه حقیقت یه که مؤلف اختر شاہنشاہی کا بیان لفظ به لفظ صحیح ہے۔»

جدید دور کے محققوں میں غالباً سب سے پہلے مولانا امداد صابری نے « صحافت اردو جلد اول میں اس اخبار کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

« ۱۸۵۴ع میں بنارس سے یه پرچه شائع ہوا۔ اس کے اڈیٹر بابو گوبند رگھوناتھ تھے جو سکھوں کی تاریخ اور دوسری قابل قدر تصانیف کے مصنف تھے، یه اخبار اپنے مخصوص طرز تحریر اور اعلیٰ علمی و ادبی مضامین کی وجه سے مشہور تھا»

صابری صاحب نے جو سنه اجرا لکھا ہے، وہ صحیح نہیں۔ اگرچه انہوں اس کی صراحت نہیں کی، لیکن ان کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے که ان کا خطبات گارساں دتاسی ہے۔ اس لئے ایڈیٹر کے نام کے سلسله میں ان سے بھی غلطی ہوئی ہے جو دتاسی سے ہوئی ہے۔ « تاریخ صحافت اردو » کی تالیف صابری صاحب کا ایک اہم ماخذ « اختر شاہنشاہی » بھی رہا ہے۔ تعجب ہے که نے آفتاب ہند » کے سلسلے میں اس سے کیوں استفاده نہیں کیا۔

نثار احمد فاروقی نے بھی اپنے ایک مضمون کے ذریعه اس اخبار کا ذ کرایا ہے۔ فاروقی صاحب کو دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ہفته وار « آفتاب ہند دوسری جلد کے اٹھاره شمارے (٦ جنوری سنه ۱۸۵۳ء تا ۵ مئی سنه ۱۸۵۳ء) مل تھے۔ انہوں نے ان شماروں کی بنیاد پر بجا طور پر یه نتیجه اخذ کیا ہے که ہف

---

۱ اختر شاہنشاہی، ص ص ۳۲۔۲۰

۲ صوبه شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ - ۱۸۵۳ع) ص ۹۵ حاشیه

۳ تاریخ صحافت اردو جلد اول (طبع دوم) ص ۲۰۷

آفتاب ہند » یکم جنوری سنہ ١٨٥٢ء کو جاری ہوا اور اس کے اڈیٹر کاشی داس متر ہے۔[1] لیکن جہاں انہوں نے دتاسی کی اس بات کی تردید کی ہے کہ اس اخبار کے اڈیٹر گوبند رگھوناتھ تھے۔ وہاں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ اس تردید کی بنیاد یک غلط فہمی پر ہے۔ بات یہ ہے کہ فاروقی صاحب کے پیش نظر ہفتہ وار آفتاب ہند » کے شمارے تھے، اور دتاسی کے پیش نظر پندرہ روزہ « آفتاب ہند » کے۔

عتیق احمد صدیقی « ہندوستانی اخبار نویسی » (مطبوعہ دسمبر سنہ ١٨٥٧ء) میں آفتاب ہند » کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

« بابو کاشی داس نے بنارس سے ایک ہفتہ وار اردو اخبار آفتاب ہند کے نام سے جاری کیا۔ مؤلف اختر شاہنشاہی نے اس کا سنہ اجرا ١٨٥٤ء بتلایا ہے، لیکن دہلی یونیورسٹی لائبریری میں آفتاب ہند کی ایک فائل محفوظ ہے اور اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اجراء ١٨٥٢ء میں ہوا »[3]۔

عتیق صاحب نے اپنی دوسری تالیف « صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات » کو سرکاری رپورٹوں کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ اس میں آفتاب ہند کے متعلق سنہ ١٨٥٢ء اور سنہ ١٨٥٣ء کی رپورٹیں ہیں جو ذیل میں نقل کی جارہی ہیں۔

« ١٨٥٢ء کاشی‌ناتھ، مطبع کاشی سے دو ہفتہ وار اخبار شائع کرتے ہیں۔ کاشی باترا پتریکا بنگلہ میں اور آفتاب ہند اردو میں۔ آفتاب ہند کا طرز تحریر اچھا ہے۔ خبریں انگریزی اخباروں سے ترجمہ کی جاتی ہیں۔ یہ اخبار کچھ حد تک ذی اثر بھی ہے اور دیسی حلقوں میں پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے، اس کی اشاعت ١١٠ ہے۔ »[4]

١٨٥٣ء « گذشتہ مئی سے آفتاب ہند کا انتظام کاشی داس کے ہاتھوں سے نکل کر بابو گوبند رگھوناتھ شرالی کی طرف منتقل ہوگیا ہے۔ لیکن اخبار یا اس سال کی رپورٹ میں جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے، اس انتظامی تبدیلی کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن آفتاب ہند کے حسن تحریر میں یا اس

دیدو دریافت، مضمون « آفتاب ہند بنارس » ص ١٠٨

» » ص ١١٦ حاشیہ

ہندوستانی اخبار نویس (کمپنی کے عہد میں)، ص ٢٩٦

صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (١٨٠٨ء - ١٨٥٢ء) ص ٩٥ و ٩٦

کے صفحات میں شائع ہونے والے علمی و ادبی مضامین کی نوعیت میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے»۔[1]

سنہ ۱۸۵۲ کی رپورٹ میں ہفتہ وار «آفتاب ہند» کے اڈیٹر کا نام کاشی ...
دیا ہوا ہے۔ جو صحیح نہیں۔ در اصل اڈیٹر کا نام کاشی داس (متر) تھا جیسا سنہ ۱۸۵۳ء کی رپورٹ میں درج ہے۔ سنہ ۱۸۵۳ء کی رپورٹ میں بھی نام سلسلے میں ایک غلطی ملتی ہے۔ اس میں گوبند رگھوناتھ شرالی لکھا ہے۔ ... جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، صحیح نام گوبند چندر شرالی ہے۔

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں ہم جن نتائج پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہیں

(۱) ہفتہ وار آفتاب ہند» بابو کاشی داس متر کے زیر اہتمام یکم ج... ۱۸۵۲ء کو جاری ہوا۔

(۲) مئی سنہ ۱۸۵۳ء میں اس کا انتظام بابو گوبند چندر شرالی کے ہاتھوں منتقل ہوگیا۔ لیکن اس انتظامی تبدیلی کا اظہار نہ تو اخبار میں کیا اور نہ اس رپورٹ میں جو سرکار کو بھیجی گئی۔ گویا دسمبر ۱۸۵۳ء مہتمم کی حیثیت سے بابو کاشی داس متر کا ہی نام چھپتا رہا۔

(۳) جنوری سنہ ۱۸۵۴ء میں پندرہ روزہ «آفتاب ہند» زیر اہتمام بابو چندر شرالی جاری ہوا۔

(۴) ہفتہ وار «آفتاب ہند» اور پندرہ روزہ «آفتاب ہند» ایک ہی مطبع کاشی پریس[2] بنارس میں چھپتے تھے۔

۲

پندرہ روزہ «آفتاب ہند» کی پالیسی ہفتہ وار «آفتاب ہند» کی پالیسی مختلف تھی۔ ہفتہ وار «آفتاب ہند» سے نثار احمد فاروقی نے چند ایسے اق... نقل کئے ہیں۔ جن میں «انگریزی حکومت پر کھلے بندوں تنقید کی گئی ...

---

۱ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۸۰۱ء ۱۸۵۳ء)، ص ۹۶

۲ مؤلف «اختر شاہنشاہی» نے کاشی پریس کے بارے میں لکھا ہے: «کاشی پریس بنارس، مالک گوبند چ... اجرای سنہ ۱۸۵۴ء» (اختر شاہنشاہی ص ۱۹۰) مؤلف اختر شاہنشاہی کا یہ بیان صحیح نہیں کہ کا... جنوری سنہ ۱۸۵۴ء میں قائم ہوا در اصل یہ پریس کاشی داس متر نے اپنے ...کہ اخبار کاشی یاترا پترکا سنہ ۱۸۵۱ء میں قائم کیا تھا۔ (صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۹۴) اسی پریس ... نے جنوری سنہ ۱۸۵۲ء میں ہفتہ وار «آفتاب ہند» جاری کیا لیکن مؤلف اختر شاہنشاہی کے بیا... نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ «آفتاب ہند» کے ساتھ ساتھ کاشی پریس بھی بابو گوبند چندر شرالی ک... میں منتقل ہوگیا تھا۔

۳ ویدو دریافت، ص ۱۲۶

لیکن پندرہ روزہ آفتاب ہند انگریزی حکومت کا مکمل طورسے حاشیہ بردار تھا۔ پالیسی میں اس تبدیلی کا سبب مہتمم (اڈیٹر) کی تبدیلی بھی ہوسکتا ہے اور ہندوستان کے سیاسی حالات میں ڈرامائی انداز میں تغیر و تبدل بھی۔ ذیل کی خبر سے اس اخبار کی پالیسی کا بڑی حد تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

«تلسی پور کے راجہ نے سرکار ابد پائیدار کے حکم قضا توام سے سرتابی کی۔ نتیجہ اُس کا یہ نکلا کہ گرفتار ہوا اور حوالات میں رکھا گیا۔ قلعہ منہدم ہووےگا اور علاقہ شاید نیلام۔ بہت مناسب ہے کہ اس مفسد کا علاقہ ڈگڈگی بجاکر نیلام کیا جائے۔ بہیترے اخبار نویس اس چھوٹے زمیندار کو سرکار عالی مقدار کا ہم پنجہ سمجھتے تھے۔ اس کے قلعہ اور جنگل کو ناممکن الفتح تصور کرتے تھے۔ والئی نیپال کی رشتہ داری کے باعث اسے فرعون بے سامان کا درجہ دیتے تھے۔ اور لکھنؤ کے اکثر مفت خورے خیال کے گھوڑے دوڑاتے تھے کہ شاید اس کی دیکھا دیکھی اور بھی زمیندار سرکشی کریں اور ملک میں غدر مچے تو اون کے پوبارہ پڑیں۔ یہ نہ جانا کہ شیر کے آگے گیدڑ کیا جنگل میں گھسنے سے جان بر ہوسکتا ہے۔ سرکار نے اس ملک کو تلوار کے زور سے رکھا ہے۔ کچھ اخبار نویسوں کے بھروسے پر نہیں رکھا۔ ایک ملکی صاحب چند سواروں کو لیکر جنگل سے اس کوتہ اندیش کو پکڑ لایا اور پتہ بھی نہ کھڑکا... جناب فیض مآب مہتمم صاحب چشمۂ فیض دام فیضا نہم، سابق شاہِ اودھ کی وکالت پر کمرِ دروغ نویسی مضبوط باندھے ہوئے ہیں۔ ابھی برس روز نہیں گذرا جب ہم ضبطئی لکھنؤ کا حال بطور پیش گوئی کے آفتاب ہند میں لکھ لکھ کر بادشاہ کو متنبہ کرتے تھے تو مہتمم صاحب موصوف خفا ہوتے تھے اور ہمارے لکھنے کو جھوٹھ تصور کرکے سچے کا بول بالا جھوٹے کا منہ کالا مناتے تھے۔ اب فرمائیں کہ کون سچا ہوا اور کون جھوٹا تھا... واجد علی شاہ کی عملداری میں ہر روز ہر موضع کے درمیان سونٹھالوں کی سی بدعت اور غارتگری مچی رہتی تھی اور اوس کی در.ق کی قیامت تک بھی امید نہ تھی۔ بلکہ «امروز بیش از دیر و زو فردا بیشتر از امروز» کی نوبت مچی رہتی تھی.... (آفتاب ہند ۷ جولائی سنہ ۱۸۵۶ء)

سنہ ۵۷-۱۸۵۶ء کا زمانہ وہ تھا جب انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں. مہتمم «آفتاب ہند» سلطنت اودھ کی ضبطی کی پیشینگوئی تو کرسکتے تھے اور اس کی ضبطی پر خوشیاں بھی مناسکتے تھے، مگر وہ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کی نشاندہی کرنے سے قاصر تھے. ۱۰ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو جب یہ چنگاریاں سلگ کر شعلوں میں بدل گئیں اور میرٹھ کے ہندوستانی فوجیوں نے علم بغاوت بلند کرکے دہلی پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے اپنے اخبار میں اس طرح خامہ فرسائی کی :-

«میرٹ میں کچھ سپاہیوں اور سواروں نے دنگہ کیا اور پھر وہاں سے بھاگ کر دلی میں فساد اٹھایا. سرکاری فوج ہر چہار طرف سے ان کی سزا دہی کے واسطے روانہ ہوئی ہے. یقین کہ آج کل میں اون کے نیست و نابود ہونے کی خبر آتی ہو. مفصل حال اس کا دوسرے اخبار میں لکھا جاوے گا.» (آفتاب ہند ۲۲ مئی سنہ ۱۸۵۷ء)

پندرہ روزہ آفتاب ہند میں ہر قسم کی سیاسی، سماجی، معاشی اور انتظامی امور سے متعلق خبریں شائع ہوتی تھیں. خبروں کا ماخذ انگریزی و نیز دیگر ہندوستانی اخبارات تھے. علاوہ ازیں یہ اخبار خود اپنے ذرائع سے بھی خبریں حاصل کرتا تھا. مختلف شماروں سے چند خبریں یہاں بطور نمونہ نقل کی جارہی ہیں :-

«جنگِ روم روس :- کہتے ہیں کہ اس لڑائی میں سب ملاکر بائیس ہزار سپاہی تو انگلستان کے میدانِ کارزار میں کام آئے. اور ساٹھ ہزار فرانسیس کے. اور صفیر روس (کذا) کی زبانی معلوم ہوا کہ اون کی فوج میں پانچ لاکھ سے کم آدمی ہرگز ضائع نہ ہوئے پس رومیوں کے مقتول بھی اگر اس میں شامل کئے جاویں تو اس مہابھارتھ کی خونریزی کے تخمینے میں سات لاکھ آدمی آتے ہیں. بمبئے ٹیلیگراف :

(آفتاب ہند ۷ جولائی سنہ ۱۸۵۶ء)

«ترویج تزویج بیوگان :- اس باب میں ایک مدت ہوئی کہ قانون کا مسودہ چھپ گیا تھا. اب پختہ خبر پہنچی ہے کہ وہ عنقریب ذرہ سی ترمیم کے ساتھ قانون ہوکر گزٹ میں چھپا چاہتا ہے. اب ایک مسودہ اس بات کا طیار ہورہا ہے کہ جب تک ایک عورت بیاہی ہوئی موجود رہے تو مرد

دوسری شادی نہ کرنے پاوے۔ یہ بات بیشک خلق اللہ کے نہایت آرام اور رفاہیت کی ہوجاویگی، کیونکہ یہ نا انصاف کلین بنگالی روپیے کی لالچ سے سو سو پچاس شادیاں کرلیتے ہیں اور پھر اون عورتوں کا منہ بھی نہیں دیکھتے فرنڈ آو انڈیا۔» (آفتاب ہند ۷ جولائی سنہ ۱۸۵۶ء)

«ڈاکٹر اسپرنگر صاحب جو کہ مدت تک دہلی کالج (کے) پرنسپل رہے تھے اور اب کلکتے کے سرکاری مدرسے میں پرنسپل مقرر تھے۔ اور پچھم میں ان سے بہت آدمی واقف ہیں، افسوس ہے کہ دس برس پرانے مقدمے کی علت میں عہدۂ مذکور سے موقوف ہوکر اپنے پلٹن میں ڈاکٹری کا کام کرنے کے واسطے بھیجے گئے۔ فرنڈ آو انڈیا۔» (آفتاب ہند ۷ ستمبر ۱۸۵۶ء)

آفتاب ہنــــد میں ایسی خبریں بھی ملتی ہیں جن سے ہندوستانیوں کے جذبۂ حب الوطنی پر روشنی پڑتی ہے، اور انگریزی حکومت کے خلاف کچھ کر گذرنے کے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ خبریں تمام تر دوسرے اخبارات سے ماخوذ ہیں۔ لیکن مہتمم «آفتاب ہند» نے انھیں اس طور پر پیش کیا ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ہمدردیاں انگریزی حکومت کے ساتھ ہیں۔ ذیل میں چند ایسی خبریں نقل کی جاتی ہیں :۔

«مسلمانوں کا دیوانہ پن :۔ اس دفعہ فیض آباد میں پھر ایک فقیر نے اپنے تئیں مندرانی ظاہر کرکے کچھ آدمی مفسد جمع کیے تھے۔ یہ سن کر صاحب ڈپٹی کمشنر نے اون کو حکم دیا کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو لیکن شاہ جی نے صاحب کا حکم نہیں مانا۔ تب ناچار پلٹن کے سپاہی بلائے گئے۔ بندوقوں کی باڑھ چلتے ہی سب کے سب بھاگے اور بہیترے بے چارے جان سے مارے گئے۔ اور شاہ صاحب بھی گرفتار ہوئے انگلشمین۔»

(آفتاب ہند، ۲۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ء)

«اچانک :۔ چند روز سے انگریزی تلنگوں کی پلٹنوں کی سرکشی کا شور و غل اور انکار سپاہیوں کا نیا کارتوس کام میں لانے کے باب میں جس کو وہ گائے یا سور کی چربی کا بنا ہوا قیاس کرتے ہیں، سنا جاتا ہے چنانچہ اچانک کی چھاؤنی کے تلنگے بھی اس بات پر بگڑے تھے۔ لیکن بانی مبانی اس فساد کے رجمنٹ ۱۹ مقیم چھاؤنی برم پورہ تھے۔ چنانچہ اس پلٹن کو

سرکار کے حکم کے بموجب اچانک کی چھاؤنی میں لاکر وہاں والی سرکش فوج کے روبرو سزا دی گئی۔۔۔۔ دوربین۔»

(آفتاب ہند، ۲۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ء)

«ایک برہمن سپاہی چونتیسویں رجمنٹ ہندوستانی بارتکاب تمام سرجنٹ میجر پر تلوار اور بندوق سے مسلح ہوکر حملہ آور ہوا۔ اور کسی طرح کا خیال دل میں نہ لاکر میجر مذکور کو زخمی کیا جب یہ خبر وحشت اثر پلٹن میں مشہور ہوئی۔ ایجوٹنٹ بہادر اوسی دم چست و چاق مع پستول موقع واردات پر پہنچے اور سپاہی مذکور کی طرف فیر پستول کیا اتفاقاً نشانہ نے خطا کی۔ سپاہی اور بھی آگ بگولا ہوا اور صاحب موصوف کے گھوڑے پر بندوق ماری اور صاحب کو بری مجروح کیا۔ اس وقت تمام سپاہیوں کو حکم ہوا کہ اپنے سرجنٹ میجر کو بچائیں۔ مگر جو کہ اقبال سرکاری سے تمام فوج یکدل تھی، کسی نے نہ مانا اور کندہ ہائے بندوق سے صاحب کی خبر لی۔ اور نمک حرامی سے زدو کوب میں کچھ نقصان نہ کیا۔۔۔۔ یقین ہے کہ اس پلٹن کو بہ نسبت و ارجمنٹ کے زیادہ سزا دی جائے۔ قران السعدین»

(آفتاب ہند، ۲۲ اپریل سنہ ۱۸۵۷ء)

انگریزوں نے اردو ہندی کی تفریق کا جو بیج فورٹ ولیم کالج میں بویا تھا، وہ سنہ ۵۷-۱۸۵۶ء تک ایک پودے کی شکل اختیار کرگیا تھا۔ آفتاب ہند کے شمارہ ۷ مئی سنہ ۱۸۵۶ء میں بنارس کمشنری کے سررشتۂ تعلیم کے بارے میں ایک طویل مضمون ہے، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح انگریز اردو اور ہندی کے جھگڑے کو ہوا دے رہے تھے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

«سررشتۂ تعلیم کی اِن دنوں خوب گرم بازاری ہے۔ اکیسویں ماہ گذشتہ کو مکانِ کالج میں عہدۂ معلمی کے واسطے لوگوں کا امتحان ہوا۔ قریب سّتر اسّی آدمیوں کے وہاں اوس روز امتحان دینے کے لئے آئے تھے اور بعض بعض اون میں ایسے مولوی اور منشی تھے کہ وے معقولات و منقولات دونوں کے جاننے کا دعوٰی رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے حساب مطلق نہ سیکھا اور ہندی کا ایک حرف بھی یاد نہ کیا۔ اس باعث بہتیرے دامنِ امید کو گلِ مراد سے پُر کرنے کے عوض صرف خارِ حرماں دل میں چھوڑے ہوئے مارے غصے کے امتحان لینے والوں کو برا بھلا کہتے کہ یا!

اب یہ زمانہ آیا کہ معقولات اور منقولات کو چھوڑ کر حساب اور ہندی پوچھتے ہیں۔ کالج سے باہر گئے لیکن اس میں بے چارے امتحان لینے والوں کا کیا قصور ہے؟ بلکہ انھوں نے تو پہلے ہندی اور اردو دونوں معلموں کو دس دس روپیہ ماہواری برابر تنخواہ مقرر کی تھی۔ لیکن جناب لفٹیننٹ گورنر بہادر نے فرمایا کہ اردو کے معلم کو بالضرور ہندی والے کا نائب رہنا چاہیے اور اس سے کمتر تنخواہ پانی چاہیے تاکہ لوگوں کی نظر میں ہندی کی قدر بڑھے اور ہر شخص اس کی تحصیل میں کوشش کرے ۔ ۔ »
(آفتاب ہند ۷ مئی ١٨٥٦)

آفتاب ہند میں صرف خبریں ہی نہیں شائع ہوتی تھیں بلکہ اس میں علمی و ادبی مضامین، کتابوں کے اقتباسات، تصاویر اور علمی و ادبی موضوعات پر قارئین کے خطوط بھی شائع ہوتے تھے۔ مضامین بیشتر مہتمم، آفتاب ہند، کے قلم کے رہین منت ہوتے تھے

کتابوں کے اقتباسات عموماً ایسی کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں، جو پند و نصائح پر مبنی ہیں۔ مہاراجہ بنارس کی تالیف « نصیحت نامہ » کا ایک اقتباس دیکھیے

«آدمی سب آدم کی نسل بشریت میں برابر ہیں۔ نسب سب کا ایک ہے۔ مال کی کمی بیش کا اعتبار نہیں، اس میں ہمیشہ تغیر و تبدل لگا رہتا ہے۔ مگر شرافت اور بزرگی حقیقی عقل کے سبب حاصل ہوتی ہے۔ جس کی عقل جس قدر زیادہ ہے اوسی قدر اوسکا شرف و فضل زیادہ ہے » (آفتاب ہند ۷ اپریل ١٨٥٦)

۴ فروری ١٨٥٦ ع کو انگریزوں نے واجدعلی شاہ کو معزول کر کے مملکت اودھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس موقع پر گورنر جنرل کی طرف سے جو اعلانیہ جاری ہوا وہ آفتاب ہند کے غیر معمولی شمارہ ١٠ فروری ١٨٥٦ ع میں شائع ہوا تھا۔ اس اعلامیہ کی جستہ جستہ اقتباسات ذیل میں درج ہیں۔

« نقل اشتہار واسطے اطلاع سکنائے ملک اودھ بموجب حکم محکم بندگان نواب مستطاب معلیٰ القاب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے جاری ہوا

واقع تاریخ ہفتم فروری ١٨٥٦ عیسوی

بموجب اس عہد نامہ کے جو ١٨١٠ع کو ہوا سرکار دولتمدار کمپنی انگریز بہادر نے حفاظت بقیہ ملک سرکار اودھ کے جملہ معاندان اندرونی و بیرونی سے

اپنے ذمہ قبول کرلی اور باقی ملک اودھ ایسے سر رشتہ بندوبست کے جاری کرنے
کے واسطے معرفت اپنے اہلکاروں کے خود ذمہ دار ہوا کہ اس کے باعث سے رفا
خلائق و حفاظت جان و مال ساکنان ملک اودھ کو حاصل ہوں . . . تاالحال سرکا
کمپنی انگریز بہادر کو اجرا یسے امورات کے کہ جو محل اختیار و اقتدار ایک دودما
عالی شان کے ہو منظور نہ تھا۔ ہر چند انہوں نے اپنے رعایا کی نسبت کیسا ہ
احکامات خلاف عمل و انصاف کئے ہوں مگر ہمواره بہ نسبت کمپنی انگریز بہا
کے دوستی پر قائم رہے۔ تاہم کمپنی انگریز بہادر نے واسطے بچانے رعایا ملک اود
کے اس تعدی عظیم و پریشانی سے جو عاید حال رعایا کے علی الاتصال رہی بکم
کوشش متوجہ رہی . . . پچاس برس کے تجربہ سے بخوبی ثابت ہوا کہ عہد نا
۱۸۰۱ع منتج رفاہ عام و خیریت سکنائے اودھ کے نہیں ہوا اور یہ بھی واضح
کہ حفاظت سکنائے ملک مذکور کی اس تعدی عظیم سے جو کہ مدت سے لا
ہے کسی صورت ممکن الوقوع نہیں ہے، بجز اس کے کہ انتظام کلی ممالک اودھ مستد
سرکار کمپنی انگریز بہادر کو مفوض ہو وے اس غرض سے حسب الحکم خاص استرضا
انربل کورٹ آف ڈایرکٹرز یہ بات ٹھہری کہ عہدنامہ ۱۸۰۱ع میں کہ اس کے والی اود
نے انحراف تجاوز کیا۔ آج کی تاریخ سے بتمامہ ناجائز و ساقط ہے۔ چنانچہ وا
علی شاہ بادشاہ اودھ کو واسطے انعقاد ایک عہدنامہ جدید کے نصیحت کی گئی
جس کی رو سے مدام و مستدام نظم و نسق کل ملک اودھ کا بلااشتراک غیر سر
کمپنی انگریز بہادر کو تفویض کیا جاوے و مراتب ضروری واسطے بحال و برق
رکھنے منزلت و دولت و توقیر شاہ و اقربا اونکی کی ظہور میں آوے۔ لہذا شاہ موصو
نے ایسے عہدنامہ دوستانہ سے انکار کیا۔ فقط از انجا کہ شاہ اودھ واجد علی
مثل جملہ والیان پیشیں ملک اودھ کے اس میثاق استوار عہدنامہ ۱۸۰۱ع کے تہ
میں ملکر یا سہل انکا کردیا غافل ہو جسکی رو سے اجرا ایسے سررشتہ بندوبہ
کا اپنی ممالک میں کہ موجب رفاہ و خیریت رعایا کے ہو لازم گردانا گیا۔ واز ا
کہ عہدنامہ جس کے یوں ہی انحراف ہوا ناجائز و ساقط گردانا گیا . . لہذا اد
دیا جاتا ہے کہ آج کے دن سے نظم و نسق ممالک اودھ بلاشرکت غیرے دوام و مس
بقبضۂ اقتدار کمپنی انگریز بہادر کے آگیا ہے . . . ہر کسی کو بلا طرفداری ا
عدل گستری ہوتی رہے گی۔ جان و مال کی حفاظت کی جائے گی اور ہر ایک ش
اپنے حقوق واجبی پر بلا اندیشہ اور بلا دست اندازی کسی کے قابض و متصرف رہے

* ذکیہ انجم

نقد و تبصرہ

شعر و زبان

"شعر و زبان" ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مدد سے شائع ہوا ہے۔ مسعود صاحب شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی ان صفات کے اثر سے اُن کی تحریر میں نہایت خوش گوار توازن ملتا ہے۔ ان مضامین میں بھی اس توازن کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

نقاد کی حیثیت سے مسعود صاحب کی ایک قابل ذکر صفت یہ ہے کہ وہ نظریاتی کشمکش اور مفروضہ الجھنوں کا شکار نہیں ہوتے۔ اُن کا ذہن صاف ہے اور خیالات واضح۔ مغربی ادب کے مطالعے نے اُن کے یہاں اس وسعت نظر کو پیدا کیا ہے۔ جو ایک نقاد کے لئے ضروری ہے، وہ تہذیب و ادب کی اُن مشرقی روایات کے بھی مزاج داں ہیں جو ہمارے ادب کی بنیاد ہیں۔ وہ ان رویات کے صرف مزاج داں ہی نہیں، قدر شناس بھی ہیں، اُس وسعت نظر اور اس قدر شناسی نے اُن کے یہاں اُس متوازن انداز نظر کی تشکیل کی ہے جس کے بغیر اردو ادب خصوصاً شاعری کے ساتھ انصاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اُن کا یہ مجموعہ اُن کی اس صفت کا بھی آئینہ دار ہے۔

اس مجموعے کے مضامین دو حصوں میں منقسم ہیں: پہلے حصے میں سات مضمون ہیں ان میں سے چار مضمون: تخلیق شعر، مطالعۂ شعر، سماج اور شعر اور غزل کا فن، شاعری سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو مضمون: ہندی عروض اور اردو شاعری اور ہندی پنگل کی مبادیات، عروض سے متعلق ہیں۔ ایک مضمون: شمالی ہند کا پہلا مستند شاعر، محمد افضل افضل، تاریخ شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے حصے میں پانچ مضامین ہیں اور یہ سب زبان کے مختلف مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

* ڈاکٹر ذکیہ انجم ایم۔ اے، پی ایچ ڈی (دہلی)

مسعود صاحب کی تحریر بلیغ معنویت کے باوجود صاف، سادہ اور واضح ہوتی ہے۔ یہ صفت آج کل کم یاب ہے۔ اس کم یابی کی وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات ناقد کا ذہن صاف نہیں ہوتا۔ مسعود صاحب کے ان مضامین میں تنقیدی صاف بیانی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ حصۂ اول کے مضامین میں تخلیق شعر، سماج اور شعر اور غزل کا فن، خاص طور پر جاذب توجہ ہیں۔ ان مضامین میں فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس تبصرے کی تنگ دامنی اس کی متحمل نہیں ہوسکتی کہ تمام مضامین سے مثالیں پیش کی جائیں، اس لئے صرف ایک مضمون «تخلیق شعر» کے دو نہایت مختصر اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

«شاعر کا بار بار نامکمل نقوش کی طرف لوٹنا، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قوت ارادی سے شعری وجدان کی کیفیات کو پھر پیدا کرسکتا ہے۔ گو، ارادے سے پیدا کردہ اس ثانوی وجدان میں تنقیدی شعور کی بیداری کی وجہ سے ہمہ‌گیری نہیں ہوتی جو پہلے وجدان میں ہوتی ہے، یہ جزوی ہوتا ہے، محتاط ہوتا ہے۔»

«شعری تخلیق کے ابتدائی مدارج تمام تر وجدانی معلوم ہوتے ہیں، خاص طور پر اس لیے کہ سائنسی نقطۂ نظر تا حال ان کے تجزیے سے معذور ہے۔ یہ وجدان، شاعری کے اقسام کے مطابق، واضح یا مبہم ہوتا ہے۔»

غزل کے سلسلے میں فاضل پروفسر کے بعض بیانات محل نظر معلوم ہوتے لیکن وہ اتنے کم ہیں کہ ان کی حیثیت «خال رخ زیبا» سے زیادہ نہیں۔ مثلاً

«اردو میں غالب پہلے غزل گو تھے جنہیں وسعت بیان کے لیے تنگنائے غزل نا کافی معلوم ہوئی۔» (ص ۵۷)

غالب کا یہ شعر:

به قــدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئیے وسعت مرے بیان کے لیے

مدتوں اس ثبوت میں پیش کیا جاتا رہا کہ اور تو اور خود غالب جیسے غزل گو کو اس کا احساس تھا کہ غزل کی تنگ دامنی میں مہتمم بالشان مسائل او اعلا افکار کی وسعتوں کی سمائی نہیں ہو سکتی۔ اس ثبوت کے پیش کرنے میں

ترقی پسند نقادوں کی اکثریت تھی یہ شعر دراصل ان قطعہ بند اشعار میں سے ہے جو نواب تجمل حسین خاں کی مدح میں کہا گیا ہے۔ غالب کا مقصد صرف یہ ہے کہ غزل میں اس قدر وسعت کہاں کہ اس میں تجمل حسین خاں کی مدح سما سکے۔ مسعود صاحب کے یہاں اس غلط انتساب کی تکرار باعث تعجب ہے۔

ص ۴۷ پر مسعود صاحب نے عروضی ارکان آٹھ بتائے ہیں، لیکن ص ۹۲ پر لکھا ہے کہ رکن دراصل دس ہیں۔ آخر الذکر قول صحت سے زیادہ قریب ہے۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے: «اردو میں قطع نظر فارسی، عربی الفاظ کے کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو فاصلۂ صغرا، فاصلۂ کبریٰ .... کی مثال کہا جا سکے»۔ مسعود صاحب ماہر لسانیات کی حیثیت سے یقیناً اس کے قائل ہوں گے کہ اردو میں جو لفظ مستعمل ہیں، وہ اب کلّیۃً اردو کے ہیں۔ تفریق محض ناروا ہے کہ فلاں لفظ اردو کا ہے اور فلاں فارسی کا۔ اردو نام ہی ہے عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے الفاظ کے مجموعے کا۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو بہت سے لفظ ایسے مل جائیں گے جن میں فاصلۂ صغریٰ موجود ہوگا۔ مثلاً، لفظ حرکت جب بفتح دوم مستعمل ہوگا تو یہ فاصلۂ صغریٰ کی مثال ہوگا (یہ لفظ اردو میں دونوں طرح مستعمل ہے)۔ اصل یہ ہے کہ اردو میں ایسے سارے الفاظ کو خواہ وہ مفرد کیوں نہ ہوں، عروضی مرکب فرض کرکے، ان کو دو سببوں کا مجموعہ مان لیتے ہیں۔ مسعود صاحب نے جس طرح تحدید کی ہے اُس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔

ص ۷۴ پر انہوں نے ع: کریما ببخشای بر حال ما، کی بحر کو «عربی بحر» بتایا ہے۔ حالانکہ یہ خالص فارسی وزن ہے۔

فاضل مصنف نے «شکشا چھند» کی مثال میں یہ شعر نقل کیا ہے

ارے اُٹھ کہ اب تو سویرا ہوا نہیں دور تیرا اندھیرا ہوا

اور یہ بتایا ہے کہ اس کے پہلے مصرع میں اٹھارہ ماترئیں ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ فارسی کا شعر:

کریما ببخشای بر حال ما که هستم اسیرِ کمندِ ہوا

اسی شکشا چھند سے «ملتی جلتی عربی بحر میں» ہے۔ لیکن ان کی رائے میں فارسی شعر کے پہلے مصرع میں ۱۹ ماترائیں ہیں۔ جب کہ ہندی مصرع میں ۱۸ ہیں۔ دونوں کی ماتراؤں کو برابر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ «حال ما» کو

بغیر اضافت پڑھا جائے، ورنہ ۱۹ ماترائیں ہوجائیں گی۔ (ص ۷۴) یہ صحیح نہیں
مسعود صاحب نے ہندی کے مصرع میں ماتراؤں کی تقسیم اس طرح کی ہے:

ا رے اٹھ کہ اب تو س وے را ہ وا
ا ی ا ا اا ی ا ی ا ی

میں نے ماترائیں اسی طرح نقل کردی ہیں، جس طرح کتاب میں چھپی ہوئی ہیں، اور یہ صرف ۱۷ ہیں۔ یہاں ظاہرا کتابت کی غلطی ہے۔ اس میں آخری جزو «ہ وا» کو انھوں نے ایک گرو اور ایک لگھو آوازوں کا مجموعہ فرض کرکے، اس میں تین ماترائیں مانی ہیں اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اسی طرح «حال ما» میں آخری حصہ «لِ ما» بھی «ہ و» کی طرح ہے۔ فارسی مصرع کی ماتراؤں کی تقسیم بالکل ہندی مصرع کی طرح ہوگی اور بہ صورت اضافت بھی اس میں صرف اٹھارہ ماترائیں رہیں گی۔ اس طرح:

ک ری ما ب بخ شا ی بر حا ل ما
ا ی ی ا ی ی ا ی ی ا ی

ص ۷۵ پر مسعود صاحب لکھتے ہیں کہ «اردو کے اس شعر میں:

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے　　اک درد جگـــر میں ہوتا ہے

میں ۳۲ ماترائیں ہیں»۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ صرف ایک مصرع ہے، شعر نہیں، پورا شعر حسب ذیل ہے:

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے، اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اٹھ اٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

مسعود صاحب نے عظمت‌اللہ خاں کے عروضی اجتہادات کو بہت سراہا ہے۔ لیکن اس مضمون میں وہ اعتدال باقی نہیں رہا، جو ان کے مزاج اور تحریر کا عام وصف ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے ایک طویل مقالے میں واضح کیا ہے عظمت مرحوم کے بیشتر عروضی اجتہادات، اردو نظم کے مزاج اور اس کے آہنگ سے میل نہیں کھاتے۔ خود عظمت نے جہاں جہاں ان کو برتا ہے، ان مقامات پر غرابت کا رنگ بہت گہرا ہوگیا ہے۔

ص ۱۰۱ پر یہ بیان ملتا ہے: «شیخ محمد قیام‌الدین قائم پہلا تذکرہ نویس ہے جس نے اپنے تذکرے مخزن نکات (۷۵۵ء) میں

عہد لفضل افضل کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے» (ص ۱۰۱)

کسی تحدید کئے بغیر یہ لکھنا درست نہیں۔ خود انہوں نے آگے چل کر لکھا ہے کہ «افضل کی سوانح اور سیرت کے بارے میں سب سے اہم انکشافات علی قلی خاں والہ داغستانی کے فارسی تذکرے ریاض الشعرا میں ملتے ہیں جو ۱۷۴۷ء کی کی تصنیف ہے اور جسے قائم کے مخزن نکات (۵۵ ء) پر بھی تقدم حاصل ہے۔»

فاضل محقق کی رائے میں فارسی کے مخصوص حرف ژ کا اردو حرف تہجی سے اخراج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

«ان میں سے (ژ) سے مرکب الفاظ اس قدر کم ہیں کہ اس کا اخراج کیا جا سکتا ہے۔ صرف چند لفظ ہیں، اژدحام۔ اژدہا۔ ان کی دوسری شکل ازدحام، ازدہا، بھی رائج ہے۔ لیکن مژہ اور مژگاں کا کیا کیجئے گا . . . . . صرف ایک لفظ کی خاطر اسے آپ اردو صوتیات میں رکھنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں» (ص ۲۵۲)

مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں! (۱) اژدحام کوئی لفظ ہی نہیں صحیح تو ازدحام ہے، اور یہی رائج ہے۔ لہذا یہ لفظ اس فہرست سے خارج ہوا، (۲) مسعود صاحب کا خیال ہے کہ اردو میں صرف مژہ ایک لفظ ایسا ہے جس میں آتی ہے۔ اس کی ایک صورت مژگاں بھی ہے۔ لیکن یہ خیال صحت سے دور ہے ژالہ، مژہ پژمردہ، کژدم، اور اژاژ خالی بھی ادبی زبان میں مستعمل ہیں۔ مژد اور پژمردہ تو عام بول چال کی زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حرف اپنی ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہے چونکہ اردو میں ایسے حروف ابھی تک باقی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے جو صوتیات کے نقطۂ نظر سے «حرف مکرر» حیثیت رکھتے ہیں، لہذا اسے بھی اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔

کتابت کے بعض جملے بہ لحاظ روز مرہ یا محاورہ محل نظر معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

«اردو کے ایک نئے عروض کا ایک دھندلا سا خاکہ اپنے اس معرکۃ الارا مضمون میں دیا» (ص ٦٧)

«خشت مل جانے پر عمارت کا ٹھاٹھ وہ شاعر کے مذاق سلیم پر چھوڑ دیتے ہیں» (ص ۴۳)

اس کے بعض محتویات و مباحث اور نتائج میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے، مگر محنت کی قدردانی کے ساتھ، اسلامیات اور فلکیات دونوں موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کے لئے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

اردو میں وہابی ادب، از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ڈیمائی سائز، صفحات ۵۲، قیمت: دو روپئے۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کی ہندوستان میں تحریک جہاد یا بالفاظ دیگر وہابی تحریک کے پس منظر کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کرکے بتایا گیا ہے۔ یہ ایک مستقل احیائی تحریک تھی جس کا مقصد دینی، معاشرتی، سماجی اور ملکی و سیاسی اصلاح تھا۔ اس مختصر سی کتاب کی افادیت و اہمیت اس لئے اور بڑھ گئی ہے کہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) اور برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ وہابی ادب کے مخطوط و مطبوع ذخیروں کی مدد سے اِسے مرتب کیا گیا ہے، اور اس تحریک کے بارے میں براہ راست اس کے اصل مآخذ سے معلومات جمع کی گئی ہیں۔ ساتھ ہی اس تحریک کے معاصر ادب کی شہادتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس تحریک پر بہت لکھا جا چکا ہے مگر بقول خواجہ صاحب، وہ عقیدت یا مخالفت کے غبار سے اَٹا ہوا ہے۔ اور یہ رسالہ معروضی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ وہابی ادب پر رائے ظاہر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اردو نثر کی تاریخ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہوسکتا۔ وہابی مصنفین اور اہل قلم نے اردو نثر کے پر تکلف اسلوب کو بالکل بدل دیا ہے۔ "وہابی نثر نہایت صاف، سادہ اور زیور تکلف سے معرا ہے۔" مصنف کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ "اس میں وہ فنی خوبیاں بھی نہیں جو اسے حلقۂ سحر و شام سے نکال کر جاوداں بنادیں"۔ کیونکہ وہابی مصنفین اور اہل قلم اپنے رزمیہ ادب میں آداب بزم کے کچھ زیادہ پابند نہیں تھے، اور اس سے ان کا مقصد مسلم عوام کے ہر شعبۂ زندگی کی اصلاح تھا۔ ان کے ادب کا نقطۂ نظر خصوصی طور سے یہی تھا، چنانچہ وہ اس میں کامیاب رہے۔ اور بقول مصنف "بنگال سے لے کر پشاور تک اور جنوب میں کرنول اور ویلور تک، اصلاح رسوم و معاشرت، اور وہابی تحریک کی تبلیغ

و اشاعت کی ایک لہر دوڑادی تھی»۔ یہ رسالہ در اصل ایک انگریزی مقالے کا ترجمہ ہے ۔ جسے مصنف نے مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس ، امریکہ میں اگست ۱۹۶۷ء میں پڑھا تھا ۔

قاضی اطہر مبارکپوری

خطوط بہادر یار جنگ ، مرتبہ نذیرالدین احمد ، شائع کردہ ادبی بک ٹرسٹ ، عابد روڈ ، حیدرآباد ۱۹۶۸ء ، کراؤن سائز ، صفحات ۱۱۲ ، قیمت: ڈیڑھ روپے ۔

کتاب کی ابتدا میں بہادر یار جنگ کی تصویر ہے اور اس کے نیچے علامہ اقبال کا یہ شعر درج ہے :

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا بہادر یار جنگ کی زندگی اور شخصیت اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے ۔

بہادر یار جنگ کی خطابت کا ایک زمانے نے لوہا مانا ۔ لیکن ان کی تحریروں میں بھی ایک ایسی آگ ہے جو قوموں کی کایا پلٹ دیا کرتی ہے ۔ زیر تبصرہ مجموعے میں ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان ان کے لکھے ہوئے ۹۴ خط شامل ہیں ۔ ان کے مکتوب الیہ نوجوان طلبا بھی تھے اور سرکاری عہدیداران بھی ۔ یہ بہادر یار جنگ کی ذہانت او معاملہ فہمی کا کمال ہے کہ انہوں نے ہر مسئلہ پر مکتوب الیہ کے ذہنی اور علمی رجحانات کے مطـــابق مناسب اور اطمینان بخش جواب دیا ہے ۔ ان خطوط میں قومی مسائل ، سیاسی ، معاشی ، ادبی اور ثقافتی تحریکوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ بہادر یار جنگ کی بے باک شخصیت اور بے داغ سیرت کا پرتو بھی نظر آتا ہے ۔ یہ خطوط چونکہ بہادر یار جنگ کے خلوص و محبت کا عکس ہیں اس لئے ان کی زبان اور اسلوب میں سادگی اور تاثیر پائی جاتی ہے یہ مجموعہ اردو خطوط نگاری کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے ۔

اردو شاعری میں تاج محل : مرتبہ شجاع خاور ، شائع کردہ اردو پبلیکیشنز ، دہلی نمبر۶ ، ۱۹۶۸ء ، کراؤن سائز ، صفحات ۱۶۰ ، قیمت ایک روپیہ پچھتر پیسے ۔

تاج محل کا شمار دنیـــا کی ان عمارتوں میں ہوتا ہے جو اپنی عظمت اور

خوبصورتی کی بدولت قیامت تک انسانوں کی زیارت گاہ بنی رہیں گی۔ اس کا سحر انگیز حسن اور دلکشی، شاعروں کے لئے ایک تحریک ہے جس کی بدولت ان کے احساسات الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر خوبصورت اشعار کا جامہ پہن لیتے ہیں زیر تبصرہ کتاب میں اس حسین اردو موضوع پر اردو کے تقریباً تمام مشہور شاعروں کی تخلیقات کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ سر فہرست نظیر اکبرآبادی ہیں۔ جدید شعرا میں ساحر لدھیانوی، سعید عقاب وغیرہ کے نام نظر آتے ہیں۔ نظیر اور ساحر کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو سال کا فاصلہ ہے۔ شاعری کے اس طویل سفر میں جہاں تاج محل کی خوبصورتی اور شان و شوکت اُجاگر ہوتی ہے وہیں انسانی ذہن کے کئی نشیب و فراز سامنے آتے ہیں۔ ہر شاعر نے اپنے ماحول کے خول میں رہ کر اور اپنی شخصیت اور مزاج کی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے، محبت کی اس لا فانی یادگار پر اپنے تأثرات پیش کیے ہیں۔ نظیر کو تاج کی چمک کے سامنے بلور شرمندہ نظر آتا ہے تو شہریار کے خیال میں ع:

عشق کی ہے شمع روشن حُسن کی قندیل میں

اس شعری مجموعہ کے مرتب شجاع خاور نے ہر نظم سے قبل اختصار کے ساتھ شاعر کا تعارف اور اس کی نظم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مرتب کی کوشش قابل تعریف ہے۔

اصناف ادب کا ارتقاء، از سید صفی مرتضیٰ (ایم-اے)، شائع کردہ نسیم بکڈپو، لکھنؤ، کراؤن سائز، صفحات ۸۴، قیمت: ڈیڑھ روپے۔

"ہمارے نثر نگار" اور "چند ممتاز شعراء" کے بعد سید صفی مرتضیٰ کا یہ تیسرا کتابچہ ہے جو اردو ادب کے طلبا کچھ بنیادی ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ بقول مصنف اس کتابچہ میں نظم و نثر کی مشہور ترین اقسام کی تاریخی و تدریجی ترقیاں پیش کی گئی ہیں۔ ان اصناف ادب کے تعارف اور ان کی ہیت ترکیبی کے ساتھ ساتھ ان کے حسن و قبح پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ بسط و تفصیل چاہتے ہیں۔ دو صفحوں میں غزل یا ناول کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اصناف شاعری میں

غزل ، قصیدہ ، مثنوی ، مرثیہ نظم جدید اور کلاسیکل شاعری پر مختصر نوٹ ہیں ۔ اس طرح سے اصناف نثر کے حصے میں داستان ، ناول ، مختصر افسانہ ، ڈراما ، تنقید ، صحافت اور طنز و ظرافت پر اجمالی بیانات ہیں ۔ حصۂ نثر میں انشائیہ ، رپورتاژ اور پیروڈی کا تعارف بھی ضروری تھا اور جدید اصناف نثر پر ہمارے ادب میں بہت کم معلومات ملتی ہیں ۔ یہ کتاب اردو کے مبتدی طلبا کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے ۔

(ڈاکٹر) آدم شیخ

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۱	ولی گجراتی	از	ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی	قیمت ۳ روپے
۲	فہرست مخطوطات کتب خانہ ، جامع مسجد ، بمبئی	مرتبہ	مولوی حامداللہ ندوی	۴
۳	میرزا جان جاناں مظہر	از	عبدالرزاق قریشی	۶
۴	لغات گجری	مرتبہ	سید نجیب اشرف ندوی	۱۰
۵	دیوان عزلت	مرتبہ	عبدالرزاق قریشی	۱۰
۶	مبادیات تحقیق	از	عبدالرزاق قریشی	۴ روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتا : ادبی پبلشرز ، شیفرڈ روڈ ،
بمبئی ۸

ایڈیٹر : عبدالرزاق قریشی

پرنٹر پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ کے لئے شائع کیا ۔

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ جولائی ۱۹۶۹

جلد ۲۰	جولائی ۱۹۶۹	شمارہ ۳

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	عبدالرزاق قریشی	۲
۲	پھول بن	عصمت جاوید	۵
۳	اردو کے نصابی مسائل	خواجہ احمد فاروقی	۴۱
۴	مکتوب نگاری کا فن	خلیق انجم	۵۳
۵	منیر شکوہ آبادی	ذاکر حسین فاروقی	۶۶
۶	تبصرے		۷۳

شذرات

نصابی مسائل زبان کے بنیادی مسائل میں سے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ار
والوں نے ان پر بہت کم توجہ کی ہے۔ اردو زبان کی خوبیاں اور مقبولیت ا
اس کے وقیع ادبی سرمائے کی اہمیت مسلم، مگر درسی کتابوں کے جو سلس
آج تک تیار ہوئے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جو تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ؛
اچھے کہلانے کے مستحق ہوں۔ اکثر سلسلے خود غرض تاجروں نے جلب منفع
کے لئے تیار کرائے تھے، اور آج بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ ضرورت ہے
یہ کام اہل ادب اور ماہرین تعلیم کے اشتراک سے انجام دیا جائے اور جدید تر
تعلیمی نظریات کی روشنی میں کتابیں تیار کرائی جائیں۔ اچھی تعلیم کے لئے اس
کی طرح سے اچھی کتابیں بھی ضروری ہیں۔ اس لئے یہ کام ہماری بنیادی ضرور
میں سے ہے اور مزید وقت ضائع کئے بغیر اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہ
حکومت مہاراشٹر نے ابتدائی درجوں کی حد تک یہ کام اپنے ذمے لیا ہے۔ اس
پر مضمون کے لئے الگ الگ کمیٹیاں بنادی ہیں۔ تقسیم کار کی وجہ سے م
خوشگوار نتائج کی امید کرنا غلط نہ ہوگا۔ یہ کمیٹیاں ایسے اشخاص پر مشتمل
جو اپنے مضمون میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور تعلیمی نفسیات و نظریات سے
واقف ہیں۔ اصل کتاب مرہٹی میں تیار ہوتی ہے اور اس کا ترجمہ صوبے کی مختـ
زبانوں میں ہوتا ہے۔ ریڈر کے لئے ہر زبان کی الگ الگ کمیٹی ہے جو براہ را
اسباق تیار کرے گی اور اس سلسلے کے دوسرے متعلقات پوری کرے گی۔ لیـ
یہ کام مہاراشٹر میں ہو رہا ہے جہاں اردو کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو مر
اور دوسری زبانوں کو دئے گئے ہیں۔ اتر پردیش، بہار، دہلی وغیرہ میں خود ار
والوں کو اس سلسلے میں اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور کرنا ہوگا۔
مسئلہ جس قدر اہم ہے اُسی قدر اس کی طرف سے بے اعتنائی بھی برتی گئی ہ
اب مزید تاخیر کے بغیر اردو والوں کو اس کی طرف متوجہ ہوجانا چاہئے۔

نصاب کا مسئلہ مدارس تک محدود نہیں ہے ۔ دانشکدوں اور دانشگاہوں کے دائرے میں بھی یہ مسئلہ لانیحل بنا ہوا ہے ۔ ایسی ایسی کتابیں داخل نصاب رہتی ہیں جن کا بازار میں وجود تو کیا نام و نشان بھی نہیں ہوتا ۔ چند مخصوص کتابیں ہیں جو ہیر پھیر کرکے بی اے اور ایم اے کے نصاب میں رکھی جاتی ہیں ۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دانشکدوں اور دانشگاہوں کے اساتذہ تن آسان ہوگئے ہیں ۔ نئی نئی کتابوں کی تیاری سے بچنا چاہتے ہیں ۔ جامعات ہند کے اساتذۂ اردو کی انجمن نے اپنے ایک اجلاس میں یہ تجویز پاس کی تھی کہ اس کی نگرانی میں ہندوستان کی تمام دانشگاہوں کے لئے ایک مشترکہ نصاب تیار کیا جائے گا ۔ لیکن آج تک اس تجویز پر عمل نہ ہوسکا ، حالانکہ اگلے اجلاس میں اس تجویز کا اعادہ بھی کیا گیا تھا ۔ یہ کام مفید بھی ہے اور اہم بھی ۔ اس لئے اگر انجمن مذکور اس طرف جلد توجہ کرے تو اچھا ہے ۔ یہ تعلیمی خدمت بھی ہوگی اور ادبی بھی ۔

ابتدائی اور ثانوی درجوں کی درسی کتابوں کے سلسلے میں اعراب و املا کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ اعراب کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے مبتدی طلبہ کو خصوصاً اور ساتھ ہی ان کو پڑھانے والے اساتذہ کو بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اس سلسلے میں نوائے ادب میں پہلے بھی لکھا جاچکا ہے ۔ انگریزی زبان اس قدر قدیم اور ترقی یافتہ ہے ، لیکن اس کے باوجود اس کے قواعد پر نظرثانی ہوتی رہتی ہے ۔ اس کے املا کو سہل تر بنانے کی بھی کوشش ہورہی ہے ۔ فارسی کی قدامت اور پختگی و شستگی بھی ظاہر ہے ۔ پھر بھی اہل ایران اس کو مختلف حیثیتوں سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ سہل قواعد کو سہل تر بنایا جارہا ہے ۔ اردو کو ان زبانوں کی اصلاحی کوششوں کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہئے ۔ یہ کام درحقیقت انجمن ترقی اردو ، ہند ، کے کرنے کا ہے ۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اس اہم کام کے لئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی تھی ۔ اور اس نے اپنی تجویزوں کو انجمن کے سامنے پیش کیا تھا اور ان پر کسی حد تک عمل بھی ہونے لگا تھا ۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد آں دفتر را گاو خورد ۔ انجمن کے موجودہ جنرل سکریٹری کی بےحسی و بےعملی انہیں کسی مفید و اہم کام کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی ۔ انجمن کی اس بےعملی کی ذمہ داری انجمن

کی مجلس عاملہ کے ارکان پر بھی کچھ کم عاید نہیں ہوتی ۔ امید ہے کہ وہ مزید
کے بغیر اپنے احساس فرض اور اردو دوستی دونوں کا ثبوت دیں گے ۔

ساہتیہ اکیڈمی اوارڈ ہندوستان کا سب سے بڑا علمی و ادبی اوارڈ ہے
جمہوریۂ ہند کی طرف سے ہندوستان کی چودہ زبانوں کے مصنفین کو دیا جاتا
مالی عطیہ سے قطع نظر ، اس اوارڈ کے ذریعے ان زبانوں کے مصنفین کی
و ادبی عظمت و اہمیت کا اعتراف ہوتا ہے جو ایک مصنف کی کاوشوں کا
صلہ ہوسکتا ہے ۔ لیکن پچھلے چند برسوں سے شعبۂ اردو کے کنوینر نے اسے
نوازی اور غریب پروری کا ایک ذریعہ بنالیا ہے ۔ ان کا یہ طریق عمل حقدار
کی حق تلفی اور ہمت شکنی کا باعث ہوتا ہے ۔ انھیں اپنے غلط اندازِ رو
سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے ۔ حکومت کو بھی قوم کی رقم کو اس طرح سے
ہونے سے بچانا چاہیئے ۔

ملک کے ارباب علم و ادب جو بمبئی آتے ہیں ان میں سے اکثر اردو ر
انسٹی ٹیوٹ میں ضرور تشریف لاتے ہیں ۔ پچھلے دنوں مولانا ابوالحسن علی
صاحب ندوی نے اپنی تشریف آوری سے ارکانِ ادارہ کی عزت بڑھائی ۔ انھو
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں گذارے اور اپنے والد
(مولانا) سیّد عبدالحئی کے تذکرۂ گل رعنا سے متعلق مختلف تبصروں اور تح
کو دیکھا اور ان میں سے بعض کی نقل بھی لی ،

* عصمت جاوید

پھول بن

ابن نشاطی کی مایۂ ناز مثنوی پھول‌بن کے اب تک دو ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیر اہتمام ۱۳۵۷ھ میں شائع ہوا جسے پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس وقت مرتب کیا تھا جب وہ جامعۂ عثمانیہ میں اردو کے لکچرار تھے۔ اس کے تقریباً پندرہ سال بعد اس مثنوی کا ایک اور ایڈیشن شیخ چاند ابن حسین نے مرتب کیا جسے انجمن ترقی اردو، پاکستان نے مولوی عبدالحق کے زیر نگرانی ۱۹۵۵ء میں شائع کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا ترتیب دیا ہوا ایڈیشن شیخ چاند صاحب کے پیش نظر تھا۔ لیکن چند در چند وجوہ کی بنا پر وہ اس ایڈیشن سے مطمئن نہیں تھے، اس لئے اٹھارہ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد انہوں نے یہ دوسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ خود ان کے بیان کے مطابق مولوی عبدالحق نے انہیں پھول بن کی از سر نو ترتیب پر آمادہ کیا تھا۔ سروری ایڈیشن کے متعلق شیخ چاند فرماتے ہیں: «میرے دوست اور کرم فرما جناب پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے ۔۔۔ پھول بن کا ایڈیشن شائع کیا اور کتاب کے مقدمہ میں کافی محنت اور تحقیق کا ثبوت دیا۔ حقیقت میں اس ایڈیشن کے بعد اس کتاب کو پھر طبع کرانا غیر ضروری نظر آیا۔ لیکن پروفیسر سروری صاحب کے ایڈیشن میں باوجود ان کی بے انتہا کاوش اور محنت کے چند ایسی باتیں رہ گئیں (کذا) تھیں جن کی تکمیل ضروری تھی۔ چنانچہ ۔۔۔ اٹھارہ ماہ کی محنت کے بعد یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔»

اس دوسرے ایڈیشن سے ابن نشاطی کے متعلق ایک اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ اس کا مکمل نام ہے۔ سروری صاحب ابن نشاطی کے نام پر روشنی ڈالنے سے قاصر رہے تھے۔ لیکن حسن اتفاق سے پھول بن کا وہ نا مکمل نسخہ (مملوکہ مولوی محمد اکبر خاں) شیخ چاند صاحب کے ہاتھ لگا جس میں مصنف

* جناب عصمت جاوید صاحب، ایم۔ اے۔، استاد اردو، گورنمنٹ کالج آف آرٹس اینڈ سائنس، اورنگ آباد۔

اور اس کے والد کا پورا پورا نام درج تھا۔ یعنی شیخ محمد مظہر الدین شیخ فخرالدین. سروری صاحب نے «سنیہہ درپن» کی شہادت پر اس کتاب کا سن تصنیف ١٠٧٦ھ متعین کیا تھا۔ شیخ چاند صاحب کا کہنا یہ ہے کہ نسخۂ مملوکۂ محمد اکبر خاں سے اس سن کی تصدیق ہوتی ہے «کیوں کہ اس نسخے میں لفظ بیس کے بجائے بیست لکھا ہے جس سے اس لفظ کے «تیس» پڑھنے کے امکانات قطعی طور پر ختم ہوجاتے ہیں، یعنی ع اگیارہ سو سے کم تھے بیست پر چار.» اس طرح پھول‌بن کا سن تصنیف قطعی طور پر بجائے ١٠٦٦ھ کے ١٠٧٦ھ قرار پاتا ہے۔

اس ایڈیشن کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی بعض قرأتیں نسخۂ سروری کی قرأتوں سے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں. دونوں ایڈیشنوں میں جزوی اور غیر اہم اختلافات کئی ہیں. یہاں ہم چند اہم اختلافات کی مثالیں درج کرتے ہیں۔ ترجیح کے اہم اسباب تحتی حواشی میں درج کئے گئے ہیں۔

نسخۂ سروری	نسخۂ چاند
١ [1] کدھیں بے حکم نرگس آنک کھولے	١ کدھیں بےحکم نرگس آنکھ کھولے
دلاوے باد کے ہت اس جھکولے	دلاوے باؤ کے ہاتھ اوسکوں جھولے
٢ [2] وہی جانے یو دکھ جسپر کھڑیا ہوے	٢ وہی جانے یو دوکھ جسپر گھڑیا ہے
جو کئی برہا کے پھاندے میں پڑا ہوے	جکوی برہے کے پھاندے میں پڑیا ہے
٣ [3] پچھاڑیاں غم سوں کیوں کھاتا اہے دل	٣ پچھاڑیاں غم سوں کیوں کھاتا اہے دل
وہی بوجھے کھڑا ہو جس پو مشکل	وہی بوجھے گھڑیا ہے جس‌پو مشکل
٤ [4] مطبق نیلک و سقلا و مخمل	٤ مطبق نیلک و سقلات و مخمل
قلمکاریاں و چھینٹاں اور ململ	قاسم‌کاریاں و چھیٹیاں ہور ململ
٥ [5] تجارت کے بہوت سودات سوں وو	٥ تجارت کے بہوت سورت سوں وو
گیا یک مرتبہ گجرات کوں وو	گیا یک مرتبہ گجرات کوں وو
٦ نین نرگس کنے کا سو ہے زوری	٦ نین کو نرگساں کہنا ہے زوری
کہاں ہے نرگساں میں لال ڈوری	کہاں ہے نرگساں میں لال ڈوری
٧ دسن کوں کیوں کہوں انار والے	٧ دسن کوں کیوں کہوں انار دانے
اتھے اس پر دیوانے ہو کو دانے	اتھے اوس پر دیوانے ہو کو دانے

۸ [٦] کدھیں دیکھ مسکیاں میں دونو آتے
یکس کوں ایک نظروں نیں چراتے
۹ [٧] لیے دیکھ آبرو جگ میں نصیباں
اچھائے ہواری کے آگ جیباں
۱۰ کیا جوگی کہ اے شاہی کے مانے
ہمیں ہیں کون آنے ہور جانے
۱۱ [٨] ہرن مہتاب کا کھایا دیکھ رم
جو پھرتا تھا گگن صحرا میں بے غم
۱۲ بچا لے کر اپس کوں اس کھڑتے
چھپی پاتال میں جا گائے ڈرتے
۱۳ [٩] کلہ انکھیاں پوتے بجریاں کی کاڑے
کتک ہوساں جو تھے اس فن میں گاڑے
۱۴ جو طوطی قائم اس ناری میں دیکھیا
محبت کی وفا داری میں دیکھیا
۱۵ [١٠] اچاپٹا دل سو اس چوسار کاویں
چلیا ماں باپ سوں ہو پیار کاویں
۱۶ [١١] صبا اٹ سوز سوں جالے گگن کوں
اڑاوے آہ کی چٹکیاں رین کوں
۱۷ [١٢] سنی تھی ناؤں وو اول سوں ناری
سمج کر بی لگائی چھب سو نیاری
۱۸ [١٣] چمن پھرنے کوں وو آتی کہ مقبول
وو رستا مل کھڑے تھے بار بند پھول
۱۹ [١٤] مدن مد کی مستی آتی کہ لالے
کھڑے تھے ہت میں لےلئے کے پیالے
۲۰ [١٥] کسی نے باند نوریاں سب سنواریاں
عروساں کے نمن سرخاں نگاریاں
۲۱ دیکھ اس آب رواں کو شط بغداد
پڑیا غربت سوں جا دریا میں آزاد

۸ کدھیں مل مسکئیاں میں دونوں آتے
یکسکوں ایک دیکھ نظراں چراتے
۹ لیے دیکھ آبرو جگ میں نصیباں
اوچھائے آبرو کی آگ جیباں
۱۰ کیا جوگی ہمیں سایے کے مانے
ہمیں ہیں کون آنے ہور جانے
۱۱ ہرن مہتاب کا کھا تاؤ ایکدم
جو پھرتا تھا گگن صحرا میں بے غم
۱۲ بچا لے کر اپس کوں اوس خطرتے
چھپی پاتال میں جا گائے ڈرتے
۱۳ کتیک ہوساں اتھے اس فن میں کارے
کلک انکھیاں پوتے بھریانکے کاڑے
۱۴ جو طوطی قائم اوس یاری میں دیکھیا
محبت کی وفاداری میں دیکھیا
۱۵ اوچالیا دل سو اوس چو سار کاویں
چلیا ماں باپ سوں ہو پیار کاویں
۱۶ صبح اوٹھ سوز سوں جالے گگن کوں
اڑاوے آہ کیاں چنگاریاں کوں
۱۷ سنی تھی ناؤں وو اول تے ناری
سمجھ کر بھی لگائی چت سوں یاری
۱۸ چمن پھرنے کوں او آتی کہ مقبول
دو رستہ مل کھڑے تھے بار بند پھول
۱۹ مدن مت کی مستی آتی کہ لالے
کھڑے تھے ہت میں لے لئے کے پیالے
۲۰ کس نے باند نوریاں سب سنواریاں
عروساں کے نمن سرخیاں نگاریاں
۲۱ دیکھ اوس آب رواں کوں شط بغداد
پڑیا غیرت سوں جا دریا میں آزاد

۲۲ [۱۶]ع گلے میں بھا کہ سریاں کھینچ کر لائے
۳۳ [۱۷]وو ظالم تین دن لگ تعزیت کر
دکھایا غم‌زدی کا چپ کے گت کر
۲۴ [۱۸]ع ترا بچھڑا کریا سو منج پو مشکل
۲۵ [۱۹]ع پڑی جوں گائے اڑاکر ہو بےہوش
۲۶ [۲۰]سو سارا زرینا تن پو کا کاڑ
لکٹ کی لال کسوت کوں سو پھاڑ
۲۷ [۲۱]ع قرار آپس آپ یک شغل دےلے
۲۸ [۲۲]سناکر مجھ گلا دھن کر تو بات آج
۲۹ سدا بیٹے کے بن تپتا اچھے او
اسے دیکھے بدل جیتا اچھے او
۳۰ [۲]لگا یوں فکر کی تیزی کو مہمیز
وہیں جھگڑے کی آتش کوں کیا تیز
۳۱ [۲۴]کھتر ایسا ہوا ایسا کھچا کھچ
فلک کی ہیبتاں سوں گئی مکر دھچ
۳۲ پرت کی وویں سفر کی ہو اتالی
کر اپنا چیر کھنٹا گل میں گھالی
۳۳ سفر کو مستعد ہو اس روش سوں
چلی ویں ڈھونڈ لیتی اس سجن کوں
۳۴ [۲۵]ع ہوا تھا چوکدن سبزہ زمیں پر
۳۵ [۲۶]عربی صمغ سوں حل کرکو زنگار
۳۶ [۲۷]سمج کر وو پریاں کاہے ککر ٹھار
رہی کر برہنی اس ٹھار کر ٹھار
۳۷ [۸]سواری کا کری وو شہ پری موپ
بہوت کچھ عیش و عشرت کا کری موپ
۳۸ [۲۹]مندف یک باغ میانی خوب دیتی
خجل اسمان کے ڈیرے کوں کیتی

۲۲ گلے میں بھاکو رسڑیاں کھینچ کر لائے
۲۳ او ظالم تین دن لگ تعزیت کر
دکھایا غمزدیاں کا چپ کے گت کر
۲۴ تیرا بچھڑا گھڑیا سو منجھ پو مشکل
۲۵ پڑی جیوں گائے ارڑاکر ہو بے ہوش
۲۶ سو سارا زرینا تن پو کا کاڑ
تخت کی لال کسوت کوں سو پھاڑ
۲۷ قرار آپسمیں آپ یک شغل دے لے
۲۸ سناکر مجھ کلادھن کر توں بات آج
۲۹ سدا بیٹے کے بن تپتا اچھے او
اوسے دیکھیں بدل جپتا اچھے او
۳۰ لگا کر فکر نے تازی کو مہمیز
وہیں جھگڑے کی آتش کوں کیا تیز
۳۱ کھتر ایسا ہوا ایسا کھچا کھچ
فلک کی ہیبتاں سوں گئی کمر دھچ
۳۲ پرت کی وویں سفر کی ہو اوتالی
لے اپنا چیر کنٹھا گل میں گھالی
۳۳ سفر کو مستعد ہو اس روش سوں
چلی ویں ڈھونڈلینے اس سجن کوں
۳۴ ع ہوا تھا چوکدھن سبزہ زمین پر
۳۵ عنبر پر صمغ سوں حل کر کو زرگار
۳۶ سمجھکر دمن پریاں کاہے ککر ٹھار
رہی کر برہنی اس ٹھار پر ٹھار
۳۷ سواری کا کری او شہ پری چوپ
بہوت کچھ عیش و عشرت کا کری ہوپ
۳۸ منڈپ یک جا کو انکے خوب دیتے
خجل اسمان کے ڈیرے کو کیتے

۳۹ [۲۰] سو وو اوتار پدمن ذات بدلی ۳۹ سو اوس اوتارا پدمن ذات بدلے
طبیعت کی مرے سب دھات بدلی طبیعت کے مرے سب دھات بدلے

ان اختلافات قرأت کی روشنی میں ایک شخص یہ خیال کرنے میں حق بجانب ٹھہرتا ہے کہ شیخ چاند نے پھول بن کا دوسرا ایڈیشن شائع کرکے سروری صاحب کے ایڈیشن کی کوتاہیوں کو دور کیا ہے اور اس طرح انجمن ترقی اردو ، پاکستان نے یہ ایڈیشن شائع کرکے ایک اچھی ادبی خدمت انجام دی ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا ایک افسوسناک پہلو بھی ہے ، اور وہ یہ کہ شیخ چاند کے ایڈیشن میں جہاں مرجح قرأتوں کی مثالیں ملتی ہیں وہاں اس میں کئی غلط قرأتیں بھی راہ پاگئی ہیں ۔ اس بات پر حیرت اس لئے ہوتی ہے کہ شیخ چاند کے پیش نظر نسخۂ سروری موجود تھا ۔ اگر وہ زیادہ دقت نظر ، احتیاط ، محنت اور ذہانت سے کام لیتے تو سروری صاحب کے نسخے کو رہنما بناکر نقش ثانی کے طور پر ایک بہتر اور زیادہ مستند ایڈیشن پیش کرسکتے تھے ۔ لیکن افسوس ہے کہ اس ایڈیشن میں اس قدر فاحش غلطیاں راہ پاگئی ہیں کہ مجموعی طور پر اس ایڈیشن اور سروری صاحب کے ایڈیشن میں کچھ فرق نہیں رہ جاتا ۔ چونکہ سروری صاحب کا ایڈیشن نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کے پیش نظر کوئی اچھا نسخہ نہیں تھا اس لیے ان کی دقت نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند صاحب نے جس نسخے کو اپنا رہنما بنایا وہ سروری صاحب کے نسخے سے چند اشعار کے معاملے میں بہتر تو ہے لیکن اسے ٹھیک طور پر نہ پڑھ سکنے کی وجہ سے وہ جس شکل میں پیش کیا گیا ہے اسے کسی طور پر قابل اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا ۔ اب ہم معمولی اختلافات کو نظر انداز کرکے چند ایسی اہم مثالیں پیش کریں گے جن میں نسخۂ سروری کی قرأتوں کو ترجیح حاصل ہے ۔ ترجیح کے اسباب تحت حواشی میں درج کئے گئے ہیں ۔

نسخۂ سروری	نسخۂ چاند
۱ [۲۱] چرا لیوے کدھیں جودھرت میں نیر	۱ چرا لیولے کدھیں جو دھرت بھی نیر
دھرت کوں کھود کاڑے نیر کو پھیر	دھرت کوں کھود کاڑے نیر کوں بھیر
۲ بہوت راحت سوں کھا کر آج چارا	۲ بہوت چاہت سوں کھا کر آج چارا
کروں گا پھول کا بارے نظارا	کروں گا پھول کا باری نظارا

۳ [۲۲] پڑے تھے اس کنے مہراں کے انبار
ڈھگاروں سے تھے روپے ہور دینار
۴ سرو تہا کیوں کہوں میں اسکے قد کوں
انپڑنے کاں سکت اس قد کے حد کوں
۵ [۲۳] اجابت کے نشانے پر لگی سو
قبولیت کے شانے پر لگی سو
۶ [۲۴] دعا سوں ختم بلبل بات کوں کر
کہیا یوں مختصر اس دھات سوں کر
۷ [۲۵] نہ دیکھے کوئی تیوں آہستہ ڈگ ڈگ
چلوں اس کا تد تھے اس کاند کوں لگ
۸ دسے کنٹل میں یوں چنچل کے نیّن
کہ جیوں جالے منے سپڑے ہیں کھنجن
۹ [۲۶] منتر سکھلائیا یک کاڑ کر بید
اتھا جس میں جو نقل روح کا بھید
۱۰ [۲۷] قضارا اس دناں میں یک کیل کام
کھڑا سو بیگ آیا د... سر انجام
۱۱ [۲۸] ہر ایک مدرا سو جیوں سورج چندر تھا
کھلے کے ناد اس ہت کا چکر تھا
۱۲ [۲۹] کہ چھایا تھا و بن چاروں کدھیں وو
سہاوے میں دسا سب کوں گگن وو
۱۳ [۳۰] ہرن چیتل چکاریاں کوں کرن جوڑ
لگاوے ٹھوک پٹیاں وہیں ہوئی دوڑ
۱۴ [۳۱] لیویں ہاتاں میں جب غصے میں جمدھر
ہر یک یک ضرب تل دو دو گریں دھڑ
۱۵ [۳۲] اگر نیں عشق تو یوں آکو جوشاں
دریا کیا واسطے کرتا خروشاں
۱۶ [۳۳] دے رکھ، ڈال سوں مل ڈال اسدھات
لیے ہیں اچھڑیاں جوں ہات میں ہات

۳ پڑے تھے اوس کنے مہراں کے انبار
ڈھگاراسوں روپئے اور دینار
۴ سرو تہا کیوں کہوں میں اوس کے قد کوں
انپڑنے کاں سکت اوس قد کے حد کوں
۵ اجابت کے نشانے پر لگی سود
قبولیت کے شانے پر لگی سود
۶ دعا سوں ختم بلبل بات کوں کر
کیا یوں مختصر اس دھات کوں کر
۷ نہ دیکھے کوئی تیئوں آہستہ دک دک
چلوں اوس کاندتے اوس کاند کوں لک
۸ دسے کنٹل میں یوں چنچل کے درپن
کہ جیوں جالے منے سنپڑے ہیں کھنجن
۹ منستر سکھلائیا یک کاڑ کر بھید
انھا جس میں جو نقل روح کا بھید
۱۰ قضارا اس زماں میں یک کپل کام
گھڑیا سو بیگ آیا دے سر انجام
۱۱ ہر یک مدرا سو جیوں سورج چندر تھا
کھلی کے ناد اس ہت کا چکر تھا
۱۲ کہ چھایا تھا سو وہیں چاروں کدھن او
سہاوے میں دسیا سب کوں گگن او
۱۳ ہرن چتلا چکاریاں کوں کریں جوڑ
لگادے ٹھوک وہیں پٹیاں ہوئے دور
۱۴ لیویں ہاتاں ہیں جب غصے سوں جمدھر
تو یک یک ضرب میں دو دو کریں دھر
۱۵ اگر نیں عشق تو یوں اکو ہوشاں
دریا کیا واسطے ہوتا خروشاں
۱۲ دسے لگ دال سوں مل ڈال اسدھات
لیے ہیں جھریاں جیوں ہات میں ہات

۱۷ [۴۴] جو حلقه گهن پو دستا سو کهلے کا اسے تو پهانس کر اسکے گلے کا	۱۷ جو حلقه گهن پو دستا سو کهلی کا اوسے تو پاس کر اوسکے گلے کا
۱۸ [۴۵] پڑیا یکبارگی یک دشت تل پاڑ کهڑا ہے صابراں کے ناد پگ گاڑ	۱۸ پڑیا یکبارگی یکدست تل پهاڑ کهڑا ہے صابراں کے ناد پگ گاڑ
۱۹ [۴۶] سمج اس بره بهوتی ہے ککر کئی پلو لاموں کوں دک سوں ان ٹیک ٹیکر وٹی	۱۹ سمج اس بره بهوتی ہے ککر کوئی پلو لاموں کوں دو کهیں اوسکے ٹک دهوی
۲۰ [۴۷] ہو آپسمیں اپے یک جیو یک دل رہتیاں ، تهیاں کهیلتیاں ہنستیاں دونو مل	۲۰ ہو آپسمیں ، پی یک جئیو یک دل رحیاں تهیاں کهیلیاں هنستیاں دونو مل
۲۱ الگ کرکے کتک ملک و ولایت گئے سٹکر کتک بهی پاڑ پربت	۲۱ الگ کر کتی کئے ملک و ولایت کتے سنکر کیتے بهی پار و پربت
۲۲ [۴۸] کدهاں لگ میں اچهوں اس دهات روتی انجو انکهیاں کی انکهیاں میں جروتی	۲۲ کدهاں الگ میں اچهوں اس دهات روتی انجو انکهیاں کی انکهیاں میں جڑوتی
۲۳ تحیر کا دریا آیا ابل کر پڑیا حیرت کے بهنورے میں پهسل کر	۲۳ تحیر کا دریا آیا اوبل کر پڑیا حیرت کے پهنورے میں نکل کر
۲۴ [۴۹] وو حل وو تن رہے یوں ٹیک دل ہو نین دیکهن میں یک، دستے ہیں جیوں دو	۲۴ او حل دو تن رہے یوں ایک دل ہو نین دیکهنمیں یکا دکے ہیں جیوں او
۲۲ [۵۰] پڑی حوں دشت شه کے تس کے اپرال کیا غصے سے اسکول اے بد افعال	۲۵ پڑی جیوں دشت شهکی تسبیه ایرال کیا غصے سوں یوں اوس اے بد افعال
۲۵ [۵۰] سنے کی ہے کی پتلی دیکهنے گن کسوٹی پر کیا سو سچ کی پران (نہیں سمجه تهی کچ کیں ں کر ک یا سو پرت کی بجه پر خلوت میں گسیا سو)	۲۵ سنے کی ہے که پتلی دیکهنے گن کسوٹی پر کسیا سو سچ کے اون (نہیں سمجهی تهی کوئی کیونکر کسیا سو پر تمہیں اوسکے خلوت میں گهنسیا سو)
۲۶ [۵۱] گدی کوں چیر کر تیری زباں کوں بنفشے کے نمن کاڑوں قضا سوں	۲٦ گدی سوں چیر کر تیری زباں کوں بنفشه کے نمن کاڑوں قضا کوں

اس کے علاوہ شیخ چاند کے ایڈیشن میں کتابت کی کتنی غلطیاں ہیں۔ چونکه کتاب کے آخر میں اغلاط نامه منسلک نہیں کیا گیا ہے ، اس لئے یه سمجهنا دشوار ہے که نقل کرنے میں مرتب نے کہاں غلطی کی ہے اور کہاں کتابت کی غلطی

سرزد ہوئی ہے۔ بہر حال ہم نے قیاس سے کام لیتے ہوئے بعض غلطیوں کو
کے سہو قلم سے تعبیر کیا ہے اور بعض واضح صورتوں میں انہیں کتابت کو
قرار دیا ہے۔ کتابت کی غلطیاں یوں بھی خطرناک ہوتی ہیں لیکن قدیم زبا
سلسلے میں جن کے اکثر الفاظ ہمارے لئے نامانوس، ادق اور غریب ہوتے ہیں
قسم کی غلطیاں افہام و تفہیم میں بڑی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں ہم یہاں
چند غلطیوں کی نشاندہی پر اکتفـــا کریں گے۔ ہم نے صحیح الفاظ قوس
لکھ دئے ہیں۔

صفحہ نمبر

۹ فرات اپنے دو نیناں کر کو دکھلاؤں۔ لہو روکر بلاتن کر کو دکھلاؤں
ظاہر ہے کہ بلا تن کے کوئی معنی نہیں۔ مصرع ثانی یوں ہونا چاہئے:
لہو رو، کربلا، تن کرکے دکھلاؤں

۱۵ منگنے خطرہ جو اوپر چڑ کو جانے [منگے بجائے منگے]
۲۶ اتھا وہ لوی میں سب مشک کے سار۔ تھے اوسکی باس میں عنبر کے اثار
[بوی بجائے اوی اور آثار بجائے

۲۹ یہی عم ہے جو میں تجھتے پڑیا دور [غم بجائے عم]
" یتا کچھ تنگ تھا پنجرے کیر ٹھار [کیرا (بمعنی کا) بجائے کیر]
۳۰ صبح اوتھ یوں لگیا کرنے کو زاری [اوٹھ بجائے اوتھ]
۴۷ حسد اپنا کھرک سوں توڑ کر مٹ [جسد (بمعنی جسم) بجائے حسد اور
(تلوار) بجائے ک

" او مکاد اس مسند سوں سلطنت لے [مکار بجائے مکاد اور سند (بمعنی
بجائے

۴۸ اوسے دکھلائے اپسیں کو کو بیمار [دکھلائی بجائے دکھلائے اورکر کو بجائے
۵۰ دوالک بن میں نہ دے گر کم ہو بک کاس [یک بجائے بک]
۵۰ شکر کی دو چھری ہے کہ نہ حانیا [جانیا بجائے حانیا]
۵٦ مکر کیا حسن کو دیتے ہیں سر خط (مگر بجائے مکر)
٦۰ اسکیانکے تمنے او بھی یار کی ہوئی [سکیاں (سکھیاں) بجائے اسکیاں]
٦۱ دیکھے نین لک یکس کوں ایک بیتاب [نیں (نہیں) بجائے نین]

٦٦ کلیانکوں ان کھلی زلفاں سنے جوڑ [سن (سے) بجاے سنے]
" سن اوس راز پر کا کاڑ سرپوش [سٹی بجاے سن]
" که جیوں تھا تیوں کہی سب موں به موں کھوں [موبمو بجاے موں به موں]
" بچھانا گل سوں کر چندر بدں کا [بدن بجاے بدں]
۷۱ شتاتی سے نہیں ہوتا ہے کچھ کام [شتابی بجاے شتاتی]
" ہر اک دھاتانسوں اس تارے کو توڑوں [توڑوں بجاے توڑوں]
۷۳ تھے بیٹھے مطرباں کر ساز و ساماں [ساز و ساماں بجاے سازوں ساماں]
" وہ خط دلمیں کسی کے نیں سماتا [حظ بجاے خط]
۷۵ پکاریا درد لے سو رعد کے ناد [لیے بجاے ے]
" دکھایا غمزد یانکا چپ کے گت کر [غمزدیاں بجاے غمزدیاں]
۷٦ نه رک مک سوز دلکا عشکے ہاتھ [عشق کے بجاے عشکے]
۷۹ پکر کر بھونڈنے کی چال پھر او [پکڑ بجاے پکر]
۸۱ دندی ہوء دندی ساریاں سو یہی ہے [ء کو حذف کیا جاے]
" دمے صورت منے توں گرچه ادم [آدم بجاے ادم]
۸۵ گیا آوز جیوں اسمان میں لے [آواز بجاے آوز]
" چندر تاریانکے نمنے قل کئیے ٹھار [تل بجاے قل]
۸۷ عدو کے لہو کو پانی بوجتی ہیں [کھو بجائے لہو اور بوجتے بجاے بوجتی]
" شبابی سوں کیا جیلوں اور گھر سنج [یه مصرع یوں ہو : شتابی سوں گیا جیتوں اور گھر سنج]
۹۲ مو نیں ہے پریاں کے بند میں جیتا [موانیں (مرا نہیں) بجاے مونیں]
۹۳ تو ہرگز منجھ پونا آسے کسے اپیار [پیار بجاے اپیار]
" کدھیں چندن جو لاوی تنکوں اونار [لاوے (لگائے) بجاے لاوی]
" یوں کاں تے ناگ بجھڑے کا لڑیا اس [بچھڑے (مہجور) بجاے بجھڑے]
۹٦ لکھے تھے گیں روپے سوں چاند کے تئیں [کیں (کہیں) بجاے گیں اور سوں (سے) بجاے سوں]
" لکھے تھے ابر کوں دریا کے گف سوں [کف بجاے گف]
" چتاری چین کے حراں تھے سارے [چتارے (مصور) بجاے چتاری]

۹۷ ابی آدم تھے سب خدمت میں یکسر [بنی آدم بجاے ابی آدم]
۹۸ ہوئی مجلس فشیں او شاہ خوباں [نشیں بجاے فشیں]
" دیوا روشن کریں قندیل میں بیوں [قندیل بجائے قتدیل اور جیوں بجاے بیوں]
" بلدیاں سے تو عالم کے نکہ رکھ [نگہ بجاے نکہ]
" جو حلقہ گھن میں دستا سوکھلی گا [کا بجاے گا ، کھلے کو کھلی لکھنا سہوِ کاتب نہیں بلکہ سہوِ مصنف ہے]
۹۹ برہنے لہارکر جس لہار رھی تھی [برہنی (فراق زدہ) بجاے برہنے]
۱۰۵ عبت سوں لیا ہے بحر ہور بر [محبت بجاے عبت]
۱۰۸ بھلی ساعت مفے آکر ملے دو عاشق جانی [منے (میں) بجاے مفے]
۱۰۹ شہای مرتبہ سوں درج کر بات [شہانی (بمعنی شاہانہ) بجاے شہای]
" انھکی پتلی سوں جیؤں پتلی سوں پر آنک [انکھی (آنکھ) بجاے انھکی]
۱۱۰ ہے تارے جو تلک قوس و قزح کے [قوسِ قزح بجاے قوس و قزح]
۱۱۳ طبیعت کو مری ہے خط ملائم [حظ بجاے خط]
۱۱۴ بہوت خوں جگر کھا کو کھلیا گل [خون جگر بجاے خوں جگر]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ نسخۂ سروری کتابت کی غلطیوں سے یکسر پاک ہے . اس کی غلطیوں کی کچھ نمایاں مثالیں یہ ہیں :

صفحہ نمبر ۷۱ تھی آپسمیں ابی روتی و تپی [تپتی بجاے تپی]
" ۷۳ گند اپنے دل منے اس یات کا ہار [بات بجاے یات]
" ۱۲۳ زمانہ گھابرا ہوکر کیا غشق [غش بجاے غشق]
" ۱۳۷ چلی تھی یاوری ہوکر پکڑ سوز زلیخانی [باوری بجاے یاوری]
" ۱۴۱ لئے ہیں اچھڑیاں جوں ہات میں ہات [اچھریاں (اپسرائیں) بجاے اچھڑیاں ممکن ہے یہ سہو مرتب ہے]
" " ہوا تھا چوکدں سبزہ زمیں پر [چوکدن یا چوکدوں (چاروں طرف) بجاے چوکدی]
" ۱۴۲ تجھاکر دیکھتی ہے واں جو وو نار [نجھاکر بجاے تجھاکر]
" ۱۴۴ کھیں تھے صورتاں مستقبل اسمیں [کہیں بجاے کھیں]
" ۱۴۸ اسی تے ہو کہ تھا گلنار دامن [کے بجاے کہ اور گلزار بجاے گلنار]
" ۱۴۹ صبا ہو باس اس گلنار کا لیاۓ [گلزار بجاے گلنار]

اب کچھ ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن میں ہمارے خیال کے مطابق نسخۂ سروری اور نسخۂ چاند دونوں میں مشترکہ طور پر غلط قرأتیں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے پیش نظر پھول بن کا کوئی مخطوطہ نہیں ہے۔ پھر بھی سیاق و سباق کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نقل کرنے میں درایت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

نسخۂ سروری	نسخۂ چاند
(۱) ہوا ہے کے ترا سر یوں پریشاں	(۱) ہوا ہے کے تیرا خاطر پریشاں
پریشاں جیو ہو خاطر پریشاں	پریشاں جیئو اور سر پریشاں

مذکورہ بالا شعر میں شیخ چاند کی قرأت کو اس لئے ترجیح حاصل ہے کہ ان کے منقولہ شعر میں خاطر اور سر ہم قافیہ ہیں پھر بھی دونوں نے ''کی'' کے بجائے ''کے'' نقل کیا ہے۔ لفظ کے شعر کو مہمل بنا دیتا ہے۔ ''کی'' دکھنی میں کیوں کے معنوں میں آج بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح مندرجۂ ذیل شعر میں بھی ''کے'' بجائے غلط طور پر نقل ہوا ہے:

(۲) ہے تجہ میں کیا بدل بارے کی عادت	(۲) ہے تجھ میں کیا بدل باریکی عادت
توں کے پکڑا ہیں بارے کی خصالت	توں کے پکڑا ہے باریکی خصالت
(۳) کتیک دن ہو ہرن وو شاہ بھولا	(۳) کتیک دن ہرن او شاہ بھولا
رصیا تھا سب کسی سوں ہو آبھولا	رضیا تھا سب کسی سوں ہو ابھولا

یہاں ''ابولا'' صحیح قرأت ہے۔ یعنی کئی دنوں تک وہ بھولا بادشاہ ہرن بن کر سبھوں سے ابولا رہا تھا یعنی بات نہیں کرسکتا تھا۔ سروری صاحب نے حاشیہ میں ''ابولا'' میں لکھا ہے لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے ابھولا کو ترجیح دی:

(۴) دسن میں سین تھا ہور لب تتھالے	(۴) دسن میں شین تھا اوس لب میں تھا بے
علامت حسن کی تھی اس میں ست یہ	علامت حسن کے تھے اوس میں نگلے

سروری صاحب کا نقل کردہ شعر بے معنی ہے۔ لیکن چاند صاحب کے پیش کردہ شعر کے مصرع اولیٰ میں ''شین'' کے بجائے ''سین'' ہونا چاہئے۔ پتہ نہیں، شین سہو کاتب ہے، سہو مرتب۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ دسن (دانت) میں حرف سین ہے اور 'سب' میں حرف بے، جس کے لفظ 'سب' بنتا ہے۔

چونکہ سگلے کے معنی بھی ' سب ' کے ہیں اس لئے شاعر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس میں حسن کی ' سب ' علامتیں تھیں۔

۵ کری سب جوش دل میں عشق کی آگ ۵ کری سو جوش دلمیں عشقکی آگ
ہو ویتاگی لیــا سر اپنے ویتاگ ہو ویتاگی لیــا سر اپنے ویتاگ

ویتاگ کے معنی ہیں جنجال۔ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا ع ہو وو تیاگی لیا سر اپنے ویتاگ۔ تیاگی بمعنی تارک الدنیا۔

٦ خوشی سوں ملک آرا لے چلی تھی گر کر تیوں ٦ خوشی سے ملک آرا لے چلی ویں سر کر تیکوں
چڑی اک باڑ پر جا وو دسیا ود محل تابانی چڑی اک محل پر جاکر دسیا او محل نورانی

سروری صاحب کا منقولہ مصرع اولیٰ بے معنی ہے۔ البتہ چاند صاحب کے پیش کردہ مصرع اولیٰ میں بجائے سر " سیر " ہونا چاہیے۔

۷ ملیا نیں واں سے کونچے ہور گلی کوں ۷ ملیا نیں واں پہ سو کونچہ گل کوں
چلیا ویں ڈہنڈ لیتا اس ولی کوں چلیا ویں ڈھونڈ لیتا اوس ولی کوں

دونوں نے ڈھونڈ لیتا نقل کیا ہے، حالانکہ مصرع ثانی کو اس طرح لکھنا چاہیے تھا ع چلیا ویں ڈھونڈ لے تا اوس ولی کوں۔ تا بمعــنی تاکہ۔ تاکہ اس ولی کو ڈھونڈ لے۔

۸ مشیشے تن بھر اپنے لائے چندن ۸ مشیشے اپنے تن پر لیائے چندن
لگائے تھے کجــل سوکیاں کھچن لگائے تھے کجل سوکیانوں کنچن

دونوں نے کھچن اور کنچن نقل کیا ہے حالانکہ یہاں لفظ کھنجن چاہیے تھا۔ جو ایک پرندے کا نام ہے۔

۹ پتمبر باندھ پیلے پلکاں آئے ۹ پتمبر باندھ پیــلی پیلکاں آئے
کنواریاں کر منجھی کیاں اپس دکھلائے کنواریاں کر منجھی کیاں اپس دکھلائے

پلکاں کے بجائے پیلکاں مرجح ہے کیوں کہ پیلک ایک پرندہ ہے جس کا سر پیلا ہوتا ہے۔ دونوں نے مصرع ثانی میں « منجھی کیاں » اس طرح نقل کیا ہے جیسے منجھی کوئی علاحدہ لفظ ہو اور کیــاں « کی » کی جمع ہو، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ منجیکا (मंजिका) مفرد لفظ ہے جس کے معنی ہیں ویشیا، طوائف۔ اس لئے بجائے منجھی کیاں کے منجھکیاں نقل کرنا چاہیے تھا۔

۱۰ دمے سبزہ زمیں پر یوں ہر یک جا ۱۰ دسے سبزہ پر یوں ہر یک جا
بچھائے پاج کا لیا فــرش گویا بچھــائے ہیں بچھانا پاج کا لیا

دونوں نے لفظ « پاج » نقل کیا ہے۔ اصل لفظ « پساج » ہے۔ وجہی نے بھی
ب رس میں اسے چھاج کے قافیے کے طور پر استعمال کیا ہے۔
١ دسیا دل شہ کا یوں تیزی کے سنگات ١١ دسیا دل شہ کا یوں تیزیانکے سنگات
که جیوں چلتا ہے بادل باؤ کے سات که جیوں چلتا ہے بادل باؤ کے سات

یہاں دونوں نے تیزیاں نقل کیا ہے۔ حالانکہ تازیاں مناسب لفظ ہے جو تازی
ی جمع ہے۔ تازی مراد اسپ تازی ہے۔

شیخ چاند کے مرتبہ ایڈیشن کے آخر میں جو فرہنگ « متعلقہ بہ الفاظ نادرہ
ر مثنوی » منسلک ہے وہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں الفاظ نادرہ
ے معنی شاذ اور آسان الفاظ کے معنی فراخدلی سے دیے گئے ہیں۔ یہ وہ سہل
ریقہ ہے جس پر عام طور پر ہمارے مرتبین عمل کرتے ہیں۔ شیخ چاند نے ایک
دم اور آگے بڑھا کر اپنی جرأت رندانہ کا ثبوت دیا ہے یعنی ' الفاظ نادرہ ' کے
منی لغت میں تلاش کرنے کے بجائے صرف قیاس سے کام لیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ
مض مقامات پر اصل متن کو غلط پڑھ کر ان کے معنی غتر بود کردیے ہیں۔ یہاں
سرف چند مثالیں درج کی جاتی ہیں :

دکھایا رات کو جیـــوں دیس آرو سو رہے سب کوئی ملا بازو سے بازو

سروری صاحب لفظ آرو کے متعلق احتیاطاً خاموش رہے لیکن شیخ چاند نے
س کے معنی ' مانند ' بتائے ہیں۔ دیس آرو ـ دن کے مانند۔ حالانکہ مصرع اولیٰ
ئی نثر یوں ہوگی : جیوں دیس (دن نے) رات کوں آ (کر) رو دکھایا۔ آرو
فرد لفظ نہیں ہے۔ آ اور رو کے درمیان ' کر ' مقدر ہے۔

و تھے غنچے کے طفلاں نین کھولے بنـــدے پُھل ڈالکے مرغـاں ہندولے

بقول شیخ چاند « ہندولے ـ گجرے » یہ درحقیقت « ہنڈولے » ہے۔ انہوں
ے ڈالکے کو ڈالنے کا حالیہ معطوفہ سمجھا، حالانکہ نسخۂ سروری میں پھول ڈال
ے معنی پھول کی ڈالی دیے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ شیخ چاند نے مصرع
نی کو غلط پڑھ کر ہندولے کے قیاس معنی کیوں لکھ دیے۔

صفت باریکی تمنے جگمیں تھا پور اتھا سورج تے شہـــکا نام مشہور

بقول چاند « پور ـ مشہور » ہمارے خیال میں یہاں پور کے معنی بھرے ہوئے
ے ہیں یعنی وہ باری تعالیٰ کی صفت کی طرح دنیا میں بھرا ہوا تھا۔

مہربانیکے اور اسمان کا سور جہاں پرور ککر تھا جگ میں مشہور

بقول چاند « ککر تھا ۔ مشہور تھا » اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ، ککر ، ایک مفرد لفظ ہے جس کے معنی مشہور کے ہیں ۔ درآنحالیکہ ککر دراصل کہ کر ہے۔ یعنی وہ جگ میں جہاں پرور ککر (یعنی اس نام سے) مشہور تھا ۔

حصار اس کا انھا دریا کنارے اسے خندق ہو تس دریا بندھیارے

بقول مرتب « بندھیارے ۔ بند » اس لفظ کے صحیح معنی ہیں ،کنارے ، اس شعر کے معنی سروری صاحب کے الفاظ میں بجا طور پر یہ ہیں « یہ شہر ندی کنارے اس طرح آباد تھا کہ ندی کا کنارہ اس کے حصار کی خندق معلوم ہوتا تھا ۔ »

یتے اونچے تھے اس گڑھ کے دیوالاں النگے ہو رہے تھے واں ابھـــالاں

بقول مرتب « النگے ۔ الٹے » یہ معنی غلط ہیں ۔ اس کے صحیح معنی ہیں طرف ، کنارہ ، سمت ۔ اس النگ ۔ اس طرف ، اُس النگ ۔ اُس طرف ۔ شعر کے معنی ہیں اس قلعے کے پہاڑ اتنے اونچے تھے کہ بادل اُس پر پار ہی رہتے تھے ۔

کنچن کے تھے اوپر توپاں ضرب زن کچن کی لغربیاں تھے اور فلاخن

بقول مرتب « لغربیاں ۔ ہتھیار لڑائی کے » اصل لفظ لغربیاں نہیں بلکہ مغربیاں ہے ۔ نسخۂ سروری میں مغربیـاں ہی ہے ۔ سروری صاحب نے اس کے معنی نہیں لکھے ۔ یہ لفظ دراصل « سنگ مغربی » کا دکھنی روپ ہے ۔ سنگ مغربی کا ذکر تاریخ فـیروز شاہی مصنفہ ضیاء الدین برنی میں آیا ہے اور مصنف تاریخ فرشتہ نے اس کے معنی منجنیق بتائے ہیں ۔ اس کا استعمال اسپین اور شمالی افریقہ میں ہوتا تھا اور چونکہ اہل عرب ان ممالک کو « مغرب » کہتے تھے شاید اسی رعایت سے اہل ایران بھی اسے سنگ مغربی کہنے لگے ۔

کرم یوں خلق پر دھرتا ہے توں آپ کہ جیوں دھرتے پنگڑیاں پو مانباپ

قطع نظر اس کے کہ مصرع ثانی میں ' ہیں ، کے بجائے ، رہیں ' چاہئیے ، شیخ چاند نے پنگڑیـاں کے معنی « نہ چلنے والے بچے » بتائے ہیں ۔ اس کے اصل معنی میں اپاہج ۔ نہ چلنے والے شیرخوار بچے بھی ہوتے ہیں ۔

زمیں پر شہر بھی ایسا ہے کر گیں کسی کانوں کے جاسوساں سنے تئیں

بقول مرتب « کانوں کے جاسوساں ۔ سننے والے جاسوس » ۔ مذکورہ بالا شعر کے مصرع ثانی میں شاعر نے کانوں کو جاسوس قرار دیا ہے ۔ شعر ماقبل میں اس

نے آنکھوں کو مسافر قرار دیا ہے ۔ (نہیں دیکھے تھے آنکھیاں کے مسافر) تو کیا آنکھیاں کے مسافر کے معنی دیکھنے والے مسافر ہوں گے ؟

پکڑ غصے ستی دانتاں منے لب غضب سوں آپنا گردان کر ڈب

شیخ چاند نے ڈب کو ڈھب سمجھا اور اس کے معنی لکھے ہیں « ڈھب ، روش چال طریقہ » ، حالانکہ ڈب کے معنی ہیں گردن یا اس کا پچھلا حصہ ۔ ڈب گردان کے معنی ہوں گے اپنی گردن گھما کر ۔ مراد اپنی گردن کو جھٹکا دیکـــــر (وہ شکاری آگے بڑھا)

تیری ہمت کی دریا پر نوانبر دسے یک بڑبڑے تے ہو کے کمتر

مرتب نوانبر (یعنی نو آسمان) کو نوانیر پڑھا اور اس کے معنی نیا ابر اور نیا پانی لکھے ہیں جو ظاہر ہے کہ بے معنی ہے ۔ چونکہ نوانبر کا قافیہ کمتبر یا کمتھبر ہے اس کے مصرع ثانی میں بجائے کمتر کمتھبر لکھ دیا ہے ۔ ممکن ہے کہ اصل متن میں کاتب نسخہ نے کمتھبر ہی لکھا ہو ۔ لیکن نقل کرنے کے لئے مرتب کو عقل کی ضرورت تو پڑتی ہے ۔

اپس کی ذات میں ایسا توں یک ہے اگر دھری اچھے بھی دو نہیں کے

فرہنگ چاند : « دہری ۔ احول » لیکن دہری کے معنی ہیں ملحد ، دہریہ ۔

ملک تیرے کرامت کے رسالے عطارد کن سوں جاتے ہیں لکھا لے

بقول مرتب « جاتے ہیں لکھا لے ۔ لکھانے کی غرض سے جاتے ہیں » ۔ حالانکہ انہیں لکھنا چاہیے تھا « لکھا (کر) لے جاتے ہیں » ۔

جگت کوں کے سناتا نیں یو باتاں شکر پر کے تو لکھتا نیں براتاں

بقول مرتب « براتاں ۔ مضامین » ۔ برات کے معنی ہیں ہُنڈی ، تنخواہ کا کاغذ وغیرہ (برات عاشقـاں بر شاخ آہو) کے کے بجائے «کی» (بمعنی کیوں) نقل ہونا چاہیے تھا ۔ مصرع ثانی کا مطلب ہوگا تو شکر پر ایسی تحریر کیوں قلمبند نہیں کرتا جس سے جلب منفعت کی توقع ہے ۔

جب کچھ کرتا سو حق کرتا نہیں اور ہے ہات اوسکے ہمارے نات کی ڈور

بقول مرتب « نات ۔ ناک » حالانکہ نات یا ناتھ کے معنی ہیں وہ رسی جو بیل کی ناک میں سوراخ کرکے ڈالی جاتی ہے ۔ اگرچہ ابن نشاطی نے نات کے بجائے نات کی ڈور لکھا ہے لیکن اس سے نات کے معنی ناک نہیں ہو جاتے ۔

اگر اڑنے منگے تو ہووے راواں

مرتب «راواں۔ پرندہ». ابن نشاطی نے ایک اور شعر میں اس لفظ کو طور پر طوطے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہاں بھی یہی معنی ہیں۔ پرند عام لفظ ہے۔

کرم بخشش تو اپنے لیے کریا ہے منگوں کیا سب تیرا دولت بھریا ؛

بقول مرتب «لیے کریا ہے۔ بہت کیا ہے» اصل لفظ لیے نہیں «لئی : یہ مرہٹی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں بہت۔

دندی یوں گھر ڈوبانیگی کر نہ جانی دریا میں غم کے بھاینگی کر نجا

مرتب «دندی۔ فریبی لوگ»، حالانکہ دند (दंद) یا (द) کے معنی ہیں متضاد قدیم دکھنی میں یہ لفظ دشمن کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے مذکورہ بالا شعر میں «ڈوبائینگی» اور «بھائینگی» میں یای معروف کا استعمہ ہے جو غلط ہے۔ یہاں یاے مجہول ہونا چاہیے یعنی ڈوبائینگے (ڈبوئینگے) اور (ڈالینگے) کیونکہ اشارہ ان دشمنوں کی طرف ہے جنہوں نے سمن بر کے ہمایوں‌فر کو دریا میں غرق کر دیا تھا۔

مونمیں تیراں لگے تھے مو دسے یوں پتیاں کاندے لیے ہیں موں منے ۃ

بقول مرتب «کاندے۔ گنے». اصل لفظ کانڈا ہے جس کی جمع کانڈ

ہے تن پر پیرہن اجلا چھبیلا کمر باندھیا ہے ایک باریک شیلا

بقول مرتب «چھبیلا۔صاف شفاف». یہ معنی صحیح نہیں۔ چھبیلا چھ مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں خوبصورت، خوش شکل۔ یہ لفظ البیلا ا کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ مصرع ثانی میں شیلا کی جگہ سیلا چاہیے شیلا کے معنی ہیں پہاڑ اور سیلا رومال کو کہتے ہیں۔ مرتب نے اس کے معنی بھی دیے ہیں جو محل نظر ہے۔ سروری نے سیلا کے بجاے سیلے نقل کیا ہے جو غ

ابن نشاطی اور پھول بن :

اختتام قصہ پر ابن نشاطی نے چند اشعار میں اس مثنوی پر خود ہی کیا ہے اور ضمناً اپنے اور اپنے نظریۂ فن سے متعلق کچھ اہم باتیں بتائی اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک انشا پرداز تھا۔ پروفیسر عب سروری کا یہ قیاس ہے کہ شاید ابن نشاطی نے دکھنی زبان ہی میں کوئی نثری

سرانجام دیا ہو۔ بہر حال بقول خود ابن نشاطی کا میلان شعرگوئی کی طرف نہیں تھا پھر بھی اس نے فن شعرگوئی میں بھی اپنا کمال دکھانا مناسب سمجھا اور نظم میں انشا پردا ی کے تمام گر استعمال کیے :

اہے انشا پو میرا میل دائم طبیعت کوں مری ہے حظ ملائم
ہے میری نظم میں انشا کی دھاتاں اہے انشا کی دھاتاں اور باتاں

اسی لئے اس نے دعویٰ کیا ہے کہ میں نے اس نظم میں انتالیس صنائع کا استعمال کیا ہے۔

ہنر کُئی نیں دیکھیا سو میں دکھایا صنائع ایک کم چالیس لایا

اور وہی تشبیہیں استعمال کی ہیں جنہیں اساتذہ استعمال کر چکے ہیں :

ع۔ دیے استاد تو تشبیہ دیتا

اسے غالباً اس کا احساس ہے کہ وہ اچھا غزل گو شاعر نہیں ہے ، اس کا کہنا یہ ہے کہ ایک عظیم شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ غزل گو بھی ہو اور دلیل کے طور پر وہ نظامی اور فردوسی کے نام پیش کرتا ہے :

غزل گر نیں کہے تو نیں ہے خامی جو کچھ بولے سو ظاہر ہے نظامی
غزل نیں طوس کے استاد کو ایک ہنر ازما کوں شہنامے منے دیک

پھر بھی یہ احساس کہ وہ اچھا غزل گو نہیں ہے اس کے لیے پریشان کن ثابت ہوتا ہے۔ وہ غزل کی افضلیت کا قائل ہے اور یہ دعوی کرتا ہے کہ اس کا ہر شعر غزل سے کم نہیں :

غزل کا مرتبہ گرچہ اول ہے ولے ہر شعر میرا اک غزل ہے

لیکن وہ اس دعوے سے بھی مطمئن نہیں ہوتا اور پانچ شعر کی ایک غزل نمونۃً پیش کرتا ہے۔ وہ غزل یہ ہے :

اہے تازہ چمن پیوستہ میرا شگفتہ ہے سدا گلدستہ میرا
لطافت میں ہے جیوں خوباں کے ابرو ہر اک مصرع جو ہے برجستہ میرا
دیا جگ کوں رونق یک طرف تے ہے یو بازار جو دو رستہ میرا
بہوت خون جگر کھا کو کھلیا گل کلی نمنے جو تھا دل بستہ میرا
کرم سوں حق کے پایا آج راحت فلک سوں تھا جو خاطر خستہ میرا

یہ غزل جو مثنوی کی متداول بحر میں ہے صرف ہئیت کے اعتبار ہے، ورنہ معنوی اعتبار سے یہ نظم ہی کہلائیگی. اس لئے ہم پروفیسر سہ اس راے سے متفق نہیں ہو سکتے کہ « اس غزل کو پڑھ کر یہ کہنا مبالغہ اگر ابن نشاطی اس ذوق کو ترقی دیتا تو وہ اردو کے بہترین غزل گو شمار ہو سکتا تھا. »

ابن نشاطی نے اساتذۂ متقدمین، خصوصاً فیروز اور محمود سے داد طلب

نہیں او کیا کروں فیروز استاد جو دیتے شاعری کا کچھ مری د

یہ وہی قطب الدین فیروز بیدری ہیں جن کا پرت نامہ حال میں منظرعا ہے اور جس کا ذکر ابن نشاطی سے ۵۸ سال قبل وجہی اپنی وجہی اپنی مثنوی مشتری میں کرچکا تھا

که فیروز آ خواب میں رات کوں دعا دے کے چومے مرے ہات کو

کہیا ہے توں یو سفر ایسا سرس کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہو

تو ایسی طرز دل سے بچھانوی کہ دسرے کریں سب تیری پیر

ابن نشاطی سید محمود کو ان الفاظ میں یاد کرتا ہے:

اہے صد حیف جو نیں سید محمود کیتے پانی کو پانی دود کوں

سید محمود کا ذکر وجہی بھی قطب مشتری میں کرچکا ہے

که فیروز محمود اچھتے جو آج تو اس شعر کوں بھوت ہوتا ر

که نادر تھے دونوں ہی اس کام میں رکھیا نیں کنے بول اجھوں خام

یہ بات قابل غور ہے کہ ابن نشاطی اپنے ہم عصر شعرا جیسے غواصی نصرتی وغیرہ کے ذکر سے خاموش ہے. وجہی کی قطب مشتری ۱۰۱۸ پھول بن سے ۵۸ سال پہلے مکمل ہوچکی تھی. غواصی کی مشہور مثنویاں سب و بدیع الجمال اور طوطی نامہ بھی پائۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں اور وجہو دونوں ملک الشعرا کا خطاب حاصل کرچکے تھے. پھول بن کی تصنف سے پہلے جنیدی نے ایک مثنوی ماہ پیکر کے نام سے لکھی تھی. اس کے خوشنود نے عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں شاعر کی حیثیت سے کافی ش کرلی تھی. رستمی کی مثنوی « خاورنامہ » بھی پھول بن سے پہلے ہی مک تھی. اگرچہ رستمی کا تعلق عادل شاہی دربار سے تھا پھر بھی اس مثنوی

ابن نشاطی تک یقیناً پہنچی ہوگی کیونکہ یہ ترجمہ ایک انعامی مقابلے کے سلسلے میں تیار کیا گیا تھا اور بہترین قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ گمان غالب ہے کہ عادل شاہی دربار کے مشہور شاعر نصرتی کی مثنوی گلشن عشق ابن نشاطی کی نظر سے گذری ہوگی کیونکہ اس کا سن تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے یعنی یہ پھول بن کے آٹھ سال قبل مکمل ہوچکی تھی۔ گلشن عشق میں نصرتی نے التزام کیا ہے کہ عنوان سے قبل ایک شعر لکھا ہے جس میں اس عنوان کے تحت بیان کئے جانے والے قصے کا خلاصہ درج ہے۔ یہ تمام اشعار ایک ہی زمین میں کہے گئے ہیں۔ اگر ان تمام اشعار کو یکجا کیا جائے تو ایک قصیدہ بن جاتا ہے۔ ابن نشاطی نے بھی پھول بن میں اس کا تتبع کیا ہے۔ اگرچہ شیخ چاند نے یہ دعوی کیا ہے کہ "یہ مثنوی اپنے زمانے کی پہلی تصنیف ہے جس میں ایک خاص اختراع منظومہ عنوانات کی صورت میں ہے" لیکن اپنے اس دعویٰ کی تردید وہ خود ہی یہ کہہ کر کر دیتے ہیں کہ "ابن نشاطی سے قبل نصرتی نے ..... اسے استعمال کیا ہے" بہرحال یہ تو طے ہے کہ گلشن عشق پھول بن سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔ چونکہ گلشن عشق اور پھول بن دونوں کے منظومہ عنوانات ایک ہی زمین میں ہیں اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ گلشن عشق ابن نشاطی کی نظر سے گذرچکی تھی۔

بہرحال ابن نشاطی نے اپنے ہم عصر شعرا کی تعریف کی ہے اور نہ چوٹیں کی ہیں۔ اس نے اپنی تعلی میں کئی اشعار کہے ہیں لیکن انکسار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا مثلاً تعلی کے بعد ہی وہ کہتا ہے:

یو باتاں بولتے تو مست تھا میں تکلف بات کا مستاں اوپر نہیں
رکھو معذور نا کر دل کوں بھاری قلم کے ہاتھ تھی سب اختیاری
نہ کر ابن نشاطی خود نمائی سٹے ہیں بہاں ہمایاں سب ہمائی

یہ اشعار پڑھ کر حالی کی یہ منکسرانہ تعلی یاد آتی ہے:

اگلے استادوں کے آگے گو کہ حالی ہیچ ہے کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دوچار ہیچ

پھول بن کا قصہ: عام عشقیہ مثنویوں کے برخلاف پھول بن میں ایک ہی قصہ اول تا آخر نہیں ہے بلکہ اس میں کل چار حکایتیں ہیں جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ایک حکایت تو صرف داستان گو کی ہے۔ بقیہ تین کہانیاں الف لیلوی انداز میں قصہ در قصہ سنائی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی کہانی یعنی طالب و مطلوب کا بددعا سے

گل و بلبل بننا اور پھر سے انسان کی شکل اختیار کرلینا کوئی خاص اہمیت :
البتہ نقل روح کی کہانی دلچسپ ہے۔ اس میں تین اہم کردار ہیں۔ راجہ، د
وزیر۔ اس میں راجہ کی سادگی، اپنے قول کو نبھانے کا جذبہ، رانی س
فراست اور وفا شعاری وزیر کی مکاری اور اس کا کیفر کردار کو پہنچنا،
باتیں پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ قصہ رجب علی سرور بیگ نے بھی فسہ
میں قدرے اختلاف کے ساتھ پیش کیا ہے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ
رجب علی بیگ سرور کی نظر سے گذری ہوگی، یا تو انہوں نے بساتین (
احمد زبیری عہد محمد تغلق کا شاعر) کو جس کا پھول بن ترجمہ ہے، پڑھا ہ
بساتین کے مصنف اور رجب علی بیگ نے یہ قصہ کسی مشترکہ ماخذ سے
توارد کا امکان بہت کم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ زباں زد خاص
ہو۔ بہرحال قصہ دلچسپ ہے۔ چونکہ سرور نے اس قصہ کو پھیلا کر نثر
کیا ہے اس لئے جان عالم اور خصوصاً ملکہ مہرنگار کے خط و خال واضح
ابھرتے ہیں اور بے ثباتی دنیا پر بندر کی تقریر انشا پردازی کا اچھا نمونہ
پھول بن میں اس کہانی کے کردار اختصار کے باعث اتنے جاندار محسوس
پھول بن کی تیسری کہانی جو سمن بر اور ہمایوں فر کے عشق سے متع
نسبتاً طویل ہے۔ اس کہانی میں کئی کردار ہیں، مثلاً سمن بر اور ہمایو
کے علاوہ شاہ سندھ اور اس کے مکار وزیر کا کردار۔ اس کے علاوہ
کا کردار بھی ہے جو اگرچہ بے جان ہے لیکن قصہ کی گتھی سلجھانے کے
میں وسیلے کا کام دیتا ہے۔ اس قصہ میں شاہ مصر اور شاہ سندھ کی
منظر کشی بھی عمدہ ہے۔

جہاں تک پھول بن کی کہانی کا تعلق ہے ان میں وہی سحر و طلسم
فوق الفطرۃ واقعات ہیں جو قدیم داستانوں کی جان ہیں۔ چونکہ اس مثنوی
سے زائد حکایتیں بیان کی گئی ہیں اس لئے کسی ایک کو بھی ابھرنے
نہیں ملا۔ پھر ان قصوں میں کوئی ایک قصہ بنیاد کی حیثیت نہیں رکھتا
ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور غیر مربوط ہیں انفرادی طور پر بھی ہر
نہ تو زیادہ نشیب و فراز ہیں اور نہ واقعات میں پیچیدگی دکھائی گئی ہے۔
پیچیدگی پیدا بھی کی گئی ہے تو اسے فوق الفطرۃ عناصر کی مدد سے ۔

گیا ہے۔ پلاٹ اور کردارنگاری کے اعتبار سے پھول بن کے قصے سپاٹ اور بے جان ہیں۔ لیکن پھول بن کو صرف اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا ابن نشاطی کے علاوہ خود اس عہد کی ادبی تخلیقات بلکہ تمام قدیم داستانوی ادب کے ساتھ ظلم ہوگا۔ مصنف نے یہ قصہ اپنی قادرالکلامی کے اظہار کے لئے منتخب کیا تھا جس کا ذکر وہ خود اس مثنوی میں کرچکا ہے۔ اس نے اس کہانی کو دلفریب بنانے کے لئے اپنی انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ صنائع لفظی و معنوی کا التزام ہمیں گلزارنسیم کی یاد دلاتا ہے اور جب ہم یہ سوچتے ہیں اس وقت دکھنی زبان ابتدائی حالت میں تھی تو ہمیں ابن نشاطی کے شاعرانہ کمال اور زبان پر اس کی حاکمانہ قدرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

قادر الکلامی:

پھول بن میں ابن نشاطی نے موقع و محل کی مناسبت سے اپنی وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے۔ اسے پڑھ کر سحر البیان کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اگرچہ جس طرح سحر البیان میں عہد آصف الدولہ کا لکھنؤ اور جاگیردارانہ تہذیب اپنی تمام سطحی چمک دمک، خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے اس طرح پھول بن میں جاندار تہذیبی مرقعے نہیں ہیں، پھر بھی بقول سروری "ابن نشاطی جزئیات میں ایک حد تک خود اپنے ماحول کی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔ ... اس کا پس منظر اس زمانے کی عام اور درباری زندگی ہے۔ مثلاً جہاں وہ سمن کے جزیرے کے محل کا نقشہ کھینچتا ہے اس کی دیواروں پر قطب شاہی بزم کی تصویریں بھی دکھاتا ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے عہد کی ترجمانی پھول بن میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنی بھی نہیں جتنی قطب مشتری میں مل جاتی ہے۔ پھر بھی پھول بن کو پڑھ کر سحر البیان کی یاد اس لیے تازہ ہوتی ہے کہ ابن نشاطی میر حسن ہی کی طرح جزئیات پر قادر ہے، اور یہ وہ خصوصیت ہے جس کا قدیم داستان گویوں میں پایا جانا اس لیے ضروری تھا کہ داستانوں کی کامیابی کا انحصار ہی اس پر تھا۔ پھول بن میں جب تاجر زادہ اپنے والد کی تجارت کا ذکر کرتا ہے تو اس موقع پر ابن نشاطی کپڑوں کی مختلف اقسام مثلاً حریر، سالو، مشجر، سمور، سندس، خطائی سلیمی، صاحبی، کربلائی، اطلس، سقلات وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دکھانے کے لیے کہ وہ تاجر اپنی تجارت کے سلسلے میں کن کن شہروں میں جاتا تھا ابن نشاطی

مختلف شہروں کے نام بے تکان گاتا چلا جاتا ہے۔ جب راجہ کے شکار کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو وہ مختلف چرندوں اور پرندوں کی فہرست پیش کرتا ہے۔ جب شاہ سندھ مچھلیوں کے شکار کے بہانے سمن بر کو دیکھنے کے لیے کشتی میں روانہ ہوتا ہے تو اس وقت ابن نشاطی مچھلی کی مختلف قسموں، مثلاً بام، کھول، مرل، پلان، روپچال، پرکلی وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ مالن کے ذکر میں وہ مختلف گجروں اور ہاروں کے نام گنانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اور بزم عیش کے بیان میں مختلف سازوں، مثلا طنبورہ، رباب، جھلاجھل (جلاجل)، دف اور دائروں کے نام تفصیل سے گاتا ہے۔

ابن نشاطی نے یہ دعوی کیا ہے کہ اس نے اس مثنوی میں انتالیس صنعتیں استعمال کی ہیں۔ لیکن اس نے تشبیہوں کا استعمال بڑی فراخدلی سے کیا ہے۔ مثلاً کنچن پٹن کے بادشاہ کی عدل گستری کے سلسلے میں کہتا ہے:

فلک کے ظلم سوں شہ کن جو آئے   سو او جیوکے نمن جم پرورش پائے
جو کُوی آوے زمانے کے ستم سوں   سینے سوں لگائے دل کے ناد اسکوں
جو کُوی ہو خار آوے شاہ کے گھر   تو گل کے ناد دامن کر لے پر زر

جب خادم درویش کو دیکھ کر احتراماً زمین پر سر رکھتا ہے تو ابن نشاطی کہتا ہے:

رکھیا خادم اسے دیکھ سیس بُھیں پر   نقط پر جوں قلـــم رکھتا اہے سر

جب وزیر اپنی روح بادشاہ کے قالب میں داخل کرتا ہے تو ابن نشاطی وزیر کے اس فعل قبیح کو مندرجۂ ذیل تشبیہ کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔

مبارک تن میں شہ کے جیوں او آیا   سُنے کے جام میں جوں زہر بھایا
(ڈالا گیا)

سمن بر ھمایوں سے کہیں دور بھاگ چلنے کی استدعا کرتے ہوئے کہتی ہے:

رہیں تا بھاگ کر یوں اک وطن میں   رھتا ہے جوت ملکر جیوں رتن میں
اچھیں یک ٹھار پر جا کر ہمیں دو   کہ جیوں اچھتا ہے مل کر پھول میں بو
کریں یوں مل دونو یک ٹھار بسـق   رھتی ہے جس سند سوں مے میں مستی

جب مالن شاہِ سندھ سے اصل راز کہتے ہوئے ہچکچاتی ہے تو بادشاہ اسے سزا دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں شاعر مندرجۂ ذیل تشبیہیں استعمال کرتا ہے:

اگر توں راستی سوں سرو کے سار — نہ لیا سے سامنے یو راست گفتار
گری سوں چیر کر تیری زباں کوں — بنفشے کی نمن کاڑوں قفا سوں
سٹونگا کاٹ کر تجھ عمر کی بیل — کرونگا سر کا تیرے پھانک ناریل

جب سمن‌بر کو ھمایوں کے غرقاب ہونے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ بیہوش ہوکر گر پڑتی ہے۔ اس موقع پر ابن نشاطی تشبیہوں کی مدد سے جذبات کی عکاسی کرتا ہے:

سمن‌بر جیوں سنی او بس بھرا قال — اڑے تیوں سانپ کچھ کا کچھ ہوا حال لوٹے
اگن سوں درد کے ماریا جو دل جوش — پڑی جیوں گائے ار ڑا کر ہو بیہوش
پڑی بھئیں پر مونڈی کے ڈال کر یوں — ہرن جیوں تیر کھایا سو پڑی تیوں
لگی یوں تڑپھڑانے پھوڑ چھاتی — کہ مچھلی نیر بن جیوں پھڑپھڑاتی
لگی لڑنے کوں لگ غم کی چھوری یوں (چھری) — پنکھوی کاٹے سو پڑ کر تلملے جیوں

ہمایوں کے فراق میں سمن بر کا یہ حال ہوتا ہے:

پرت کے گرم بارے سے ہو مخمول — پڑی تھی بھئیں اوپر کملا کے جیوں پھول
رھیا تھا ہوکو یوں اس نار کا حال — خزاں میں جیوں سکے سو جھاڑ کی ڈال
پڑی او باغ تے بلبل نمن دور — برہ کے درد دکھ سوں ہوکو رنجور

پرستان کے باغ کی منظرنگاری میں یہ تشبیہیں صرف ہوئی ہیں:

دسے سبزہ زمیں پر یوں ہر اک جا — بچھائے ہیں بچھانا پاچ کا لیا
دسے یوں جھاڑ پانی کے ندھارے — کہ جیوں حوراں کھڑیاں کوثر کنارے
پھریں پنکھیاں وہاں سبزے اوپر یوں — ملک پھرتے زمیں پر پاچ کے جیوں

الغرض ابن نشاطی نے پھول بن میں جابجا تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ ان تشبیہات میں کوئی ندرت نہیں کیونکہ ابن نشاطی نے عمداً وہی تشبیہیں استعمال کی ہیں جنھیں اساتذۂ سلف استعمال کرچکے تھے۔ یہ تشبیہات معمولی ہیں اور ان کی کثرت کلام میں تصنع پیدا کرتی ہے بلکہ جہاں منظرنگاری کے سلسلہ میں محاکات استعمال ضروری تھا یا جذبات‌نگاری کے جہاں موقعے تھے وہاں تشبیہات کا انبار طبیعت پر گراں گذرتا ہے۔ لیکن چونکہ اس قصہ‌گوئی سے ابن نشاطی کا مقصد

اپنی قادر الکلامی اور انشا پردازی کے جوہر دکھاتا تھا اس لیے ان تشبیہوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر صنائع لفظی و معنوی کی کچھ مثالیں یہ ہیں:

تجنیس تام: ولیاں جگ کے ستارے ہیں علی یہاں ولایت کے ولایت کا ہے سلطاں
کتک لوگاں سوں شہ مل اسمیں بیٹھا برہ سوں جل نہ مک کر جل میں بیٹھا
سمجھ کر دھن پریاں کا ہے ککر ٹھار رہی کر برہنی اس ٹھار پر ٹھار

تجنیس مرکب: کنیاں کے دانت تھے بلکہ دراتیاں چرندیاں کے تھے چنگل میں دراتیاں
(در آتیاں ۔ درآتے تھے)

کدھیں نالے ، ندیاں، حوضاں اولنگتی چھلیاں سے پاؤں کے گاہے او، لنگتی
(پار کرتی) (چھالے) (لنگڑاتی)

تجنیس مرکب مفروق:

جگت قائل ہے تج اثبات پر سب ہے عالم متفق اس بات پر سب

تجنیس خطی:

تجے جیوں پوجنا ہے یوں نہ پوجے تجی جیوں بوجنا ہے یوں نہ بوجے
زبونی سے نگہ رکھ تن کوں میرے امانت رکھ خزاں سوں بن کوں میرے
رہے جس ٹھار پر تدبیر کا جل اپس سے آپ آتے تھے ملک چل

تجنیس مضاع:

مرے دے ہات میں موسیٰ کا اعجاز مری دے بات میں عیسیٰ کا اعجاز

تجنیس زاید:

سمج کر دیکھ تو دنیا کے شیوے دیوے اگ چھن میں پل میں چھین لیوے
بہرحال اس رکھیا دے کر مراتب لگیا آنے نزک شہ کے او راتب

تکرار: ع کرم کر تو کرم اے مہرباں
تری باتاں کو سننے گوش دے گوش سمجھنے راز تیرا ہوش دے ہوش

ایہام تناسب: ع دیا لب کے نصیباں میں تو نابات
ع پھراوے چرخ کو تو روز آسماں
ع زباں اس ٹھار پر ہے لال سبکی

حسن تعلیل:

بہت بد مست ہے کرفیل انبھر کا رکھیا اس سر اوپر انکس چندر کا
سرج کو چھاؤں کُٹی دیکھے نہیں گیں تو سورج تھا، اس تے چھاؤں تج نہیں

یوں آیا ہے تو ہولے پر سارے مرسل کہ بھول آنگے تو جھوں آتا ہے پھل
زمیں تے نیشکر جب بھار آیا شہادت پر تری انگلی اُچایا
نہ اس خوبی کے آئے سک برابر گگن پر جا رہیا خجلت سوں کوثر

رجوع :

بخیلیاں کے اتھا یوں گورتے تنگ کہ تھا او ملکہ چشم مورتے تنگ
بھواں کوں کیوں کہوں محراب تھے کر وہ کاں ہے نور محراباں کے اوپر
نہیں تھی مشتری، تھی نازنیں حور نہیں تھی حور سر سے پاؤں تک نور

مراعاۃ النظیر :

سر و قداں کے قد کے نونہالاں سمن رویوں کے گالوں کے گلالاں
لگایا تھا اپس دل کے چمن میں اوشہ اپنے سینے کے پھولبن میں

مبالغہ :

سُکی لکڑیاں کنُئی لا کو گاڑے اور لکڑیاں سبز ہو شاخاں کو کاڑے

اغراق :

بکھیرے تو زمیں پر واں کے کانٹے وہ پھٹتے تھے ہوکر ببول کے پھانٹے
(قطبی)

مقابلہ : (ایک کلام کے مقابل دوسرا کلام اس طرح ہو کہ دونوں میں باہم تضاد ہو)

ازل کو نیں سمج تیرا بدایت ابد کو فہم نیں تیرا نہایت
ترے جم دوستاں سے یار ہوں میں عدواں سے ترے بیزار ہوں میں

لف و نشر : مصرع اولیٰ میں چند چیزوں کا ذکر کیا جائے جو پھر سے ان کے ساتھ نسبت رکھتی ہو اس کا ذکر مصرع ثانی میں ہو۔

گگن اور دھرت کوں دیتا تو ہستی بلندی اس کو دیتا اس کوں پستی

تشبیہ موکد (جس میں ادات تشبیہ نہ ہوں) :

گگن کے بحر میں ہے بادباں نوے چند کی کیا کشتی رواں توں

تشبیہ مرسل (جس میں ادات تشبیہ نہ ہوں) :

وہ یوں چلے پنکھیاں کے دنبال رعاجیوں کاملاں کی جائے اپرال

تدمیج :

سنے کے [1] سار تھا سو رنگ پیلا ~ سنا نیلم کرے لے مار نیلا

سیاقۃ الاعداد :

تری تعریف کرنا ایک ساعت ~ اہے ہفتاد سالاں کی عبادت

اشتقاق : ع ازل کے علم کا عالم جو ہے او

مسلسل وصف کے تجھ سلسلے کوں ~ بلانے نیں سکت مج حوصلے کوں

کنایہ :

نہیں سمجھی تھی کُٹنی کیونکر کسیاسو ~ پرت میں اسکے خلوت میں گھسیاسو

کتے تھے اسکے لب پر کوئی نجھاکر ~ یو روہے جو گیا ڈھونڈنے سکندر

مشاکلت :

عناصر کے ملا کر جزو یک لہار ~ طبیعت کا بندھیا شیرازہ یک بار

جگت کوں جلد میں ہستی کو بھایا ~ شکنجے تے عدم کے بھار لایا

تضاد :

صوری ست پکڑ کر بیقراری ~ کروں بے اختیاری سات زاری

غ نہیں سورج کوں یک زرہ سے نقصان

تشابہ الاطراف :

جو کئی ہو خار آوے شاہ کے گھر ~ تو گل کے ناد دامن کرلے پر زر

جو کُٹنی پاتاں کے سیاں کو پشارے ~ کرلے مطلب کے پر موتیاں سوں سارے

استعارہ :

ہوس ہے دل میں میرے بہوت رونے ~ سیہ نامے کو تس پانی سے دھونے

نین بلبل کیے غم سوں شاہ کرنم ~ اہس کے دو کنول تے کاڑ شبنم

اوں اوس مرد کوں توں کاڑ ستا ~ محلوں اوس گرد کوں تو جھاڑ ستا

ارسال المثل :

کسے کوں درد یو دل میں جو ہےپور ~ زمیں ہے سخت ہور اسمان ہے دور

(کہوں)

---

۱ نسخہ چھاند، لہار، جو غلط ہے۔

ع شکر بن کھائے ہوتا نیں میٹھا کام
ع نہیں قطرے سے ہوتا ہے دریا کم

تلمیح :

ملیا یوں اس چندر سوں کو ہمدم سلیماں کوں ملیا جیوں پھر کو خاتم
ملیا اوس خوب سوں اس دھات یوخوب کہ جوں بینائی پائے پھر کو یعقوب

براعة الاستہلال :

کوے تے شوق کے جیوں سور کا باگ جو نکلیا موں سوں اپنے کاڑتا آگ

ابن نشاطی کی قوت بیانیہ غضب کی ہے ۔ پھول بن میں اس کی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں ۔ مثلاً کردار نگاری میں بھی ابن نشاطی نے صرف بیانیہ انداز پر اکتفا کیا ہے ۔ اگرچہ کردار کے نقوش کو واقعات کی حد سے ابھارنا فنکاری کی اعلیٰ مثال ہے مگر ابن نشاطی اس موقع پر بیانیہ طریقہ میں استعمال کرتا ہے ۔ اس نے رانی ستونتی کی فطری شرم و حیا کو اس طرح بیان کیا ہے :

تھی رانی شاہ کوں یک ستونتی ناؤں چندر سورج نہیں دیکھے کدھیں چھاؤں
کدھیں درپن میں‌جو مکھ دیکھنے جائے دیکھ اپنی نین کی پتلیاں کو شرمائے
کدھیں لیوے کنگھی جو کھونے بال نمونہ ہے پنجے کا کر دیوے ڈال
سدا شاکر تھیں اسکی گت پو بیبیاں سنواں کھاتیاں تھیاں تسکے ست پو بیبیاں
(قسم)
او ست کی ستونتی اوتار ناری ستیاں کا مان مت سوں رکھنے ہاری

جب ستونتی بھانپ لیتی ہے کہ وزیر اصلی راجہ نہیں تو وہ مختلف حیلوں سے اسے دور رکھتی ہے ۔ اُن واقعات کو ابن نشاطی نے نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں پیش کیا ہے اور بیان میں اختصار کے باوجود تسلسل کو قائم رکھا ہے ۔ اس طرح سے راجہ کا طوطے کے قالب میں رہ کر ستونتی کو پورا قصہ سنانا ، نقلی راجہ کو قمری کے قالب میں آنے کے لئے کہنا ، یہ تمام واقعات نہایت اختصار اور تسلسل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں ۔ تسلسل بیان کی ایک اور عمدہ مثال وہ ہے جب شاہ ہند کا مکار وزیر برہ کی ماری سمن برکو شاہ سندھ سے شادی کرنے پر آمادہ کرنا چاہتا ہے ۔ وزیر ابتدا میں مختلف مثالیں دے کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے ۔ یہ زنـــدگی دوپہر کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے ۔ یہاں

کوئی ہمیشہ جینے کے لیے نہیں آیا وغیرہ۔ ان باتــوں سے جب وہ سمن بر
ہمدردی حاصل کرلیتا ہے تو پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ قانون قد
ہے کہ دنیا میں ایک کی جگہ دوسرا لیتا ہے۔ اگر سورج مغرب میں ڈوبتا ہے
اس وقت چاند طلوع ہوتا ہے اگر دارا کے ہاتھ سے راج چھنتا ہے تو سکند
تاج ملتا ہے مجھے تو یہ اچھا لگتا ہے کہ بادشاہ سلامت طالب ہوں اور تو مطلوب و

ہوا ہے چیز جو دنیا میں موجود — سو آخر ہونہارا ہے او نابود
جو دستے ہیں چمن کے پھول سارے — خزاں کے ہات سوں ہیں جھڑنے ہارے
یو جینا ہے سو جیون دوپار کی چھاؤں — دنیا میں کچھ رہیا نہیں ہے بجز ناؤں
یونا ہوکر روشن سب ہو یہ بات — خدا کے ہے جو قدرت کا قوی ہات
اگر مغرب میں دیوے سور کو لھار — اوسی ساعت میں لیاوے چاند کو بھار
اگر دارا نے لیتا چھین کر راج — سکندر کوں اوسی دن پھر دیا تاج
منجھے پوچھے تو یوں لگتا اہے خوب — کہ شر طالب اچھے ہور توں تو مطلوب
سمجھ لیکر توں اوس یوسف کوں ماضی — ہے بہتر اس سلیماں سوں ہوں راضی

جب شاہ مصر جنگ کے ارادے سے نکلتا ہے تو اسکے لشکر کی رو
کی تصویر کشی کس قدر جاندار ہے:

دسیا دَل شہ کا یوں تازیاں کے سنگات — کہ جیوں چلتا ہے بادل باؤ کے سات
لگے قرنے بھی پھوں بھوں پھیر بجنے — لگے دھم دھم دمامے پھر گرجنے
گیا اس دل کرا بادل تلک غل کا — پڑیا غوغے سے تس جگ میں تزلزل
اوٹھیا اتا زمیں پر شور ہو رشر — پھدنے کوں لگے تھے سات انبر
گیا آواز جیوں اسمان میں لے — رکھے انگلیاں ملائک کان میں لے
جدھر چلتے اتھے او شہسواراں — سنے میں دہر کے پڑتے تھے غاراں
ہنسیاں کے پاؤں سوں سب بھر کو اوغار — اوں کے ناد بھیس ہوتی تھی ہموار
دھولدرے تل چھپے او سات اسماں دھول — نظر میں سوں گئے سورو چندر ماں

جب شاہ سندھ کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع ملتی ہے تو وہ دریافد
کے لئے ایک قاصد بھیجتا ہے۔ یہ قاصد ہندوستانی فوج کی خوبیاں ان الفاظ
بیان کرتا ہے:

ہمیں ہندی اگر جھگڑے پو آویں گھڑی میں فار مصریا کو بھگاویں ہم

ہمارا فن ہے کرنا ترکتازی ہمارا کام ہے شمشیر بازی

ہمارے راوتاں ایسے ہیں جنگی پلنگاں ان کنے سکتے پلنگی

نہیں چکمک سوں کس کوں کلم اس ٹھار اونوں کی بات سے جھڑتی ہے انگار

اگر نکلیں تو لے ہاتاں میں بھالے وہی بانچے خدا جس کوں سنبھالے

سراں کوں او صراحی بوجتے ہیں عدو کے لھو کوں پانی بوجتے ہیں

پیالے سر کے کانسے کر کوں جائیں کباب اعدا کے دل کوں کر پچھانیں

مذکورہ بالا اشعار میں رجز کا انداز ہے۔ اب ابن نشاطی کے الفاظ میں جنگ کا سماں دیکھئے:

نکل آ یکہ تازاں دو طرف سوں ہوئے آ نگے پیچھے کر اپنی صف کوں

دلیری سوں دلیراں ہات میں ہات ملائے گرز اور شمشیر کے سات

لھنا لھن دیکھ ہور سنکر گھنا گھن لیے داتاں میں انگلیاں دھرت اور گھن

ہوا اتا شفا شف اور فشا فش زمانہ گھابرا ہو کر کیا غش

پتے تیراں سے سینے کے سپراں جھجر ہو کر رہے سینے کے سپراں

مندرجہ ذیل شعر میں یہ نادر تشبیہہ استعمال ہوئی ہے

موں میں تیراں لگے تھے سو دسے یوں ھتھیاں گانڈے لیے ہیں موں منے جیوں

کھتر ایسا ہوا ایسا کھچا کھچ فلک کی چھیتاں سوں گئی کمر دھج

ابن نشاطی مخصوص فضا پیدا کرنے کے لئے صوتی الفاظ کا استعمال کامیابی کے ساتھ کرتا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں اس کی کچھ مثالیں مل جائینگی، مثلاً لھنا لھن، گھنا گھن، شفا شف اور فشا فش وغیرہ۔ بزم کے بیان میں کبھی وہ ایسے ہی صوتی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جیسے:

بھنورے بولتے تن تن تنا تن اباباں باجتے چھن چھن چھنا چھن

دفاں اور دائراں یوں مل جھلا جھل کتے تھے جھل جھلا جھل جھل جھلا جھل

پرت تے تھے حقیقت کھولتے یوں[1] کہے توں توں تونہی توں توں ہی توں توں

جب سمن بر اپنے محبوب کی تلاش میں دیوانہ وار نکلتی ہے تو اس کی تصویر

ابن نشاطی کے الفاظ میں دیکھئے :

کدھیں پاڑاں اترتی ہور چڑتی کدھیں ماندی ہو گرتی ہور پڑتی
کدھیں نالے، ندیاں ، حوضاں اولنگتی چھلیاں سوں پاؤں کے کاہے اولگی

میر نے اپنی مثنوی شعلۂ عشق کی ابتدا میں محبت پر کچھ اشعار کہے ہیں

محبت نے ظلمت سے کاڑیا ہے نور نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب محبت سے آتے ہیں کار عجب
محبت ہی اس کارخانے میں ہے محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

ابن نشاطی نے بھی عشق کی صفات ان الفاظ میں بیان کی ہے :

عجب کچھ عشق ہے، ہے کچھ عجب عشق جدھر دیکھئے ادھر ہے عشق سب عشق
اگر نیں عشق تو عالم ہوا کیوں موٹھی بھر خاک سوں آدم ہوا کیوں
اگر نیں عشق تو یوں عمر سارا پریشاں ہو کو کی پھرتا ہے باراں[۲]
اگر نیں عشق تو اس دھات تلمل ہر اک جا کیا روتا ہے بادل
اگر نیں عشق تو کی[۲] سبز ہیں جھاڑ کھروے[۲] کی پاؤں اپنے گاڑ یوں پہاڑ
پہاڑ

الغرض پھولبن میں ابن نشاطی نے قدم قدم پر اپنی حیرت انگیز قوت بیاین وسعت معلومات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ بلا شبہ پلاٹ اور کردار نگاری کے ، سے یہ مثنوی اعلیٰ پایے کی نہیں ہے اس میں جذبات نگاری کی عمدہ مثالیں ملتیں اور نہ ہمیں ابن نشاطی جیسے قدیم شاعر سے اس کی توقع ہی ہے ؛ پھول بن کو اس معیار سے جانچنا جدید معیار سے جانچنا ہوگا ۔ اس لئے ہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی اپنے دور کے نظریۂ فن کی رو سے کامیاب ہے۔ ہ مثنوی کی لسانی خصوصیات سے اس لئے صرف نظر کرتے ہیں کہ اس "دکن بات میں (جیسا کہ ابن نشاطی نے پھول بن کی زبان کو موسوم کیا ہے) وہ خصوصیات ہیں جو آج سے تین سو سال پہلے کی دکھنی زبان کی تھیں اور مثالیں وجہی ، غواصی ، شاہی اور نصرتی وغیرہ کے کلام میں بھی ملتی ہیں ۔

تحتی حواشی

ہم نے ان تحتی حواشی میں اختصار کے پیش نظر سروری صاحب کے منقولہ مصرع کو س کا مصرع اور شیخ چاند کے منقولہ مصرع کو چ کا مصرع لکھا ہے ۔

۱ س کے مصرع میں جھکولے غلط ہے۔ کیونکہ اگر نرگس بادشاہ کے حکم کے بغیر آنکھ کھولے تو اسے جھکولے دینا کوئی مناسب سزا نہیں ہے۔ ج کے مصرع میں جھولے صحیح قرأت ہے۔ جھولا (بواو مجہول) وہ سرد ہوا ہے جس سے پھول پتے مرجھا جاتے ہیں۔ شیخ چاند نے اپنی فرہنگ میں نسبتاً آسان لفظ باؤ کے معنی تو دئیے ہیں لیکن جھولے کے متعلق وہ خاموش ہیں۔

۲ گھڑنا بمعنی واقع ہونا اسلیے س کے مصرع میں دُکھ گھڑیا غلط ہے۔

۳ یہاں بھی س کے مصرع میں مشکل کا کھڑا ہونا غلط ہے۔

۴ س کے مصرع میں سقلا کوئی لفظ نہیں سقلات ایک قسم کا کپڑا ہے۔ غالباً نسخۂ سروری میں سہو کتابت ہے۔

۵ اغلب ہے کہ سروری صاحب نے سودا کی جمع سودات سمجھا ہو جو غلط ہے۔ سورات (स्वार्थ) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ سورات بمعنی غرض۔

٦ مسکیاں کوئی لفظ نہیں البتہ مسکان ہے لیکن اس لفظ کی وجہ سے مصرع خارج از وزن ہوجاتا ہے۔ البتہ ایک لفظ مُسکُکی ہے جس کے معنی مسکراہٹ ہیں (فرہنگ چاند میں اس لفظ کے معنی ندارد) اور اسکی دکنی جمع مسکیاں ہے اس لیے اسے ترجیح حاصل ہے۔ اسی طرح ج کا مصرع ثانی واضح ہے۔

۷ جب تک سواری یا سو اری کے معنی متعین نہ ہوں ج کے مصرع میں آبرو مرجح۔

۸ س کا مصرع اولی بے معنی ہونے کے علاوہ خارج از وزن ہے۔

۹ بحریاں کی جگہ بہریاں صحیح ہے کیونکہ بہری مادہ باز کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ کارے گاڑے سے بہتر ہے۔ راہ ہندی اور راہ کو حرف روی مع حرف وصل قرار دینا قدماء کے یہاں جائز تھا۔

۱۰ س کے مصرع ثانی میں پار کو غالباً پیار کا بدل سمجھا گیا ہے۔ یہاں یار زیادہ واضح اور زیادہ مناسب ہے۔

۱۱ س کے مصرع میں چٹکیاں، چنگیاں کی جگہ غلطی سے نقل ہوا ہے۔ ج کے مصرع میں چنگاریاں واضح ہے۔

۱۲ س کے مصرع ثانی میں «چھب سوں نیاری» شعر کو بے معنی بنا دیتا ہے۔ ج کے مصرع میں چت (بمعنی دل) سوں یاری واضح ہے۔

۱۳ دو رستا بے معنی۔ پھول کی رعایت سے دو رستہ ہی ہونا چاہیے جیسا
کے مصرع میں ہے۔

۱۴ س کا مصرع اولی مہمل اور بے وزن ہے۔ مستی کی جگہ متی (بمعنی بدم
اور گہ کی جگہ کہ صحیح قرأت ہے۔

۱۵ کسینے غلط۔ کسنبے صحیح جس کے معنی ہیں کسم کے رنگ میں رنگا ہوا

۱٦ سریاں بے معنی۔ رسڑیاں بمعنی رسیاں صحیح یعنی (پچھلیوں کے) گلے میں ر
ڈال کر کھینچ لائے۔

۱۷ غمزدیاں کا بمعنی غمزدوں کا صحیح قرأت ہے۔ غمزدی سے شعر کا مطلب
ہو جاتا ہے۔ مطلب ہوگا "اس ظالم نے جھوٹ موٹ (چپ کے) غمزدوں کی
(گت) بنا لی۔

۱۸ دیکھیے ۲ اور ۳۔

۱۹ ارڑنا مرہٹی لفظ جس کے معنی چیخنے چلانے کے ہیں۔ اڑڑنا غالباً سہو کتا

۲۰ لکٹ کی جگہ تخت (بہ تحریک اوسط) ہی صحیح ہے۔ تخت کی لال کسوت
عروسی کا لال جوڑا۔

۲۱ س کے مصرع میں شغل کوئی لفظ نہیں۔

۲۲ کلادھن یعنی محبوب۔

۲۳ تیزی بے محل۔ تازی صحیح، تازی بمعنی اسپ تازی۔

۲۴ س کے مصرع ثانی میں "مکر دھچ" بے معنی۔ چ کے مصرع میں "کمر د
صحیح۔ دھجنا بمعنی لرزنا اگرچہ بہ ضم اول ہے لیکن ابن نشاطی نے بہ فت
استعمال کیا ہے۔ جیم فارسی اور جیم تازی کو حرف روی بنانا قدماء کے
جائز تھا۔ شاید دھجنا، بہ فتح اول، دھنسنا کا بدل ہو۔

۲۵ س کے مصرع اول میں چوکند میں اعلان نون ضروری ہے۔ چوکندھن۔
طرف۔

۲٦ س کا مصرع خارج از وزن۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے غیر مناسب۔

۲۷ س کے مصرع ثانی میں کر (ٹھاو) غلط۔ چ کے مصرع ثانی میں پر (
صحیح۔ اس مصرع میں ٹھار دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پہلے ٹھا
معنی ہیں جگہ اور دوسرا ٹھار ٹھہر کا بدل ہے۔ مصرع کے معنی ہونگے

اس مقام (لھار) پر ٹھہر (ٹھار) رہی۔

۲۸ س کے مصرع اولی میں موپ کی چوپ ہونا چاہیے تھا جیسا کہ چ کے مصرع اولی میں ہے۔ لیکن چ کے مصرع ثانی میں ہوپ کے بجائے موپ ہونا چاہیے تھا جیسا کہ س کے مصرع میں ہے۔ چوپ بمعنی خواهش اور موپ بمعنی سامان۔ شیخ چاند نے اپنی فرہنگ میں چوپ کے معنی قیاس سے بند و بست لکھے ہیں جو صحیح نہیں۔ اس معنی کا حامل لفظ موپ ہے۔ شیخ چاند نے مصرع ثانی میں موپ کی جگہ ہوپ تو نقل کیا لیکن اپنی فرہنگ میں اس لفظ کے معنی نہیں دئے۔

۲۹ مندف بے معنی لفظ ہے یا شاید منڈپ کا معرب ہو۔ آسمان کے ڈیرے کی رعایت سے منڈپ ہی صحیح ہے جیسا کہ چ کے مصرع میں ہے۔

۳۰ س کے شعر میں بدلی بطور ردیف ہے لیکن ہمارے خیال اس سے مطلب خبط ہوجاتا ہے۔ بدلے صحیح ہے کیونکہ بدلے کے معنی ہیں کے لئے، کی خاطر، دکھنی میں اکثر الفاظ کی تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہوتی ہے اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر ابن نشاطی نے مصرع ثانی میں دھات کو مذکر لکھا ہو۔

۳۱ س کے مصرع ثانی میں پھیر بمعنی پھر زیادہ موزوں ہے۔ شیخ چاند نے فرہنگ میں بھیر کے معنی باہر لکھے ہیں۔ بھار (باہر) میں جب تک ہمیں کسی اور مستند دکھنی شاعر کے ہاں املے کی مثال نہ ملے اس پر پھر کے اشباع پھیر کو ترجیح دینا مناسب ہے۔

۳۲ چ کا مصرع خارج از وزن۔ البتہ س کے مصرع میں ڈھگاروں کی جگہ ڈھگاراں چاہیے تھا۔

۳۳ چ کے مصرع میں « سود » بے معنی ہے۔

۳۴ چ کے مصرع ثانی میں اکوں بے محل ہے۔ س کے مصرع میں لفظ « سوں » مناسب۔ مصرع ثانی کا مطلب ہے «اس نے اس طرح سے مختصر کر(کے) کہا»

۳۵ چ کے مصرع اولی میں « دک دک » مہمل ہے۔ ڈگ ڈگ ہی صحیح قرأت ہے۔ شہزادہ کہتا ہے « کوئی نہ دیکھے اسلیے میں آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے اس دیوار سے اُس دیوار کو لگ کر چلتا تھا »۔

۳۶ س کے مصرع اولی میں بید صحیح ہے۔ بید ـ وید، ہندوؤں کی مقدس کتاب

۳۷ س کے مصرع میں کٹُبل « بمعنی سخت، مشکل » صحیح. چ کے مصرع
کپل بے محل.

۳۸ چ کے مصرع میں «کھلی» بے محل کیونکہ کھلی بیلوں کی غذا ہے. س
مصرع میں کھلے صحیح. کھلا - بالہ

۳۹ سیاق و سباق کے اعتبار سے س کے مصرع میں « بن » صحیح اور چ کے
میں وہی غلط، البتہ س کے مصرع اولی کدھیں کی جگہ کدھن چاہیے
گگن کا ہم قافیہ ہے.

۴۰ س کا مصرع نسبتاً واضح ہے. یعنی « ہرن » چیتل چکاروں کو پکڑنے کے
(شکاری جانوروں کی) جیسے پیٹھ ٹھونکی جاتی وہ دوڑ پڑتے.

۴۱ س کے مصرغ ثانی میں دھڑ زیادہ مناسب ہے.

۴۲ چ کے مصرع اولی میں اکو ہوشاں غالباً آکو ہوشاں ہے. لیکن س کے
اولی میں جوشاں ہی مناسب ہے، البتہ کھو کو ہوشاں ہو سکتا ہے.

۴۳ س کے مصرع میں رُکھ (روکھ) بمعنی درخت ہے. چ کے مصرع میں
لفظ کی جگہ لگ ہے لیکن اسی مصرع میں لفظ « مل » بھی ہے اسلیے
حشو ہوجاتا ہے. البتہ س کے مصرع میں اچھڑیاں کی جگہ اچھریاں (اپسر
زیادہ مناسب ہوتا.

۴۴ چ کے مصرع اولی میں کا (بجائے کا) سہوِ کتابت معلوم ہرتا ہے لیکن
مصرع میں کھلی غیرمناسب لفظ ہے اسکی جکہ کھلے ہونا چاہیے. کھلا -
یوں بھی گلے کا قافیہ کھلے زیادہ مناسب ہے.

۴۵ س کے مصرع اولی میں دشت (درشٹی) نظر کے معنوں میں استعمال ہے
یعنی یکبارگی ایک پہاڑ (پاڑ) پر نظر پڑی جو صابروں کی طرح پاؤں
کھڑا تھا. چ کے مصرع اولی میں « یکدمت تل » بے معنی ہے.

۴۶ مصرع اولی میں بھوتی (ما فوق الفطرت قوت جو ریاضت کے بعد حاصل ہو
بھوتی دونوں مناسب. البتہ یہاں رونے کا محل ہے دھونے کا نہیں اسلیے
مصرع ثانی میں « دھوتی » غلط ہے.

۴۷ ہنستیاں کی مناسبت سے کھیلتیاں ہی چاہیے نہ کہ کھیلیاں جیسا کہ
مصرع ثانی میں ہے.

۴۸ یہاں لفظ جروتی ہی مناسب ہے۔ یہ لفظ سب رس میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اسکے معنی ہیں پچانا ، یہاں مراد ہے آنسو تی جانا ، ضبط کرنا۔
۴۹ چ کے مصرع میں یکا اور س کے مصرع مین یک ہے۔ یک بہتر قرأت ہے۔
۵۰ س کے مصرع میں دشٹ (दृष्टि) نظر صحیح ہے۔ یعنی جب بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔
۵۱ چ کے مصرع ثانی میں «سچ» کے بعد لفظ «پر» ضروری ہے۔ اول تو اس لیے کہ اس کے بغیر یہ مصرع خارج از وزن ہو جاتا ہے پھر یہ مصرع شعرمابعد سے مربوط ہے۔ وہ شعر نسخہ چاند کے مطابق یہ ہے:

نہیں سمجھی تھی کوئی کیونکر کسیا ہو پرت میں اوسکے خلوت میں گھسیا ہو

۵۲ چ کے مصرع میں قضاکوں شعرکو مہمل بنا دیتا ہے۔ س کے مصرع ثانی میں قفا - پیچھے

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کی مطبوعات

			قیمت
ولی گجراتی	از	ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی	۳
اردو مخطوطات مسجد جامع، بمبئی	مرتبہ	حامداللہ ندوی	۴
میرزا مظہر جان جاناں رح	از	عبدالرزاق قریشی	٦
لغات گجری	مرتبہ	سید نجیب اشرف ندوی	۱۰
دیوان عزلت	"	عبدالرزاق قریشی	۱۰
مبادیات تحقیق	از	"	۴ـ

* خواجه احمد فاروقی

اردو کے نصابی مسائل

میں اس مقالہ کے ذریعے آپ کی خدمت میں کوئی Package Plan یا کوئی جامع اور مانع نصاب پیش کرنا نہیں چاہتا۔ صرف چند اشارے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے سامنے چند اشارے ہی کافی ہیں۔ اس مقالے میں تاریخی تمہید کے بعد اس کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ کی توجه بعض بنیادی امور کی طرف مبذول کرائی جائے جو یونیورسٹی کی سطح پر اردو کے نصاب کی ضرورتوں اور اصلاحوں پر غور کرنے اور تعلیمی معیاروں کے بلند کرنے میں مددگار ہوسکیں۔

سب سے پہلے اُن تاریخی حالات کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے جن میں اُردو کے اُستادوں نے پیروں کے ذریعے نہیں بلکہ سینے کے بل چل کر یہ بائیس برس طے کئے ہیں اور کسی نہ کسی طرح جسم و جان کے رشتے کو باقی رکھا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کو آزادی تو مل گئی جو اس کی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے، لیکن ساقی نے اس جام میں زہر کی ایک بوند بھی ملادی اور سامراجی مصلحتوں نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ یہ گوشت کا ناخن سے جدا ہونا تھا۔ موج خون سر سے گذر گئی اور تبادلۂ آبادی کی وجہ سے لاکھوں، کروڑوں آدمی گھر سے بےگھر ہوگئے۔ دست و بازو کو نظر نہ لگے لیکن تقسیم کی یہ لکیر اس خوبی سے کھینچی گئی ہے کہ اُردو کا سارا علاقہ، اُس کا مولد و مصدر، دنیا میں اس کے بولنے والوں کی سب سے بڑی تعداد ہمارے پاس ہے، لیکن سرکاری طور پر ہمارے پاس وہ دو گز زمین بھی نہیں جس کی بہادرشاہ ظفر نے آرزو کی تھی۔ غالب کو «ہونے نے» ڈبویا تھا اور اُردو کو تقسیم نے۔

ہندوستان کی تقسیم در اصل ہر لسانی واحدہ کے لئے علاحدگی پسندی کی ایک دعوت تھی کہ وہ اپنی «خودی» کو پہچانے اور ذیلی گروہ بندیوں کو مقامی عصبیت

---

* ڈاکٹر خواجه احمد فاروقی، ام۔ اے؛ پی ایچ ڈی؛ پروفسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی؛ سکریٹری، انجمن اساتذۂ اردو، جامعات ہند، دہلی؛ رکن ترقی اردو بورڈ، دہلی؛ مصنف میر تقی میر، ذوق و جستجو وغیرہ۔

کے ذریعے مضبوط کرے۔ اسی لئے یہ لسانی واحدے آگے چل کر طبقاتی وا
بن گئے جو آج زیادہ سے زیادہ سیاسی اور سماجی حقوق کے لئے کوشاں ہیں

ہماری دستورساز اسمبلی کو ان علاحدگی‌پسند رجحانات کا ڈر لگا ہوا
چنانچہ اس نے بڑی بحث و تمحیص کے بعد ہندوستان کی یک‌جہتی کی۔
ہندی کو ایک ووٹ کی اکثریت سے سرکاری زبان قرار دیا جس کے بولنے
کی تعداد اگرچہ صرف ۲۸ فیصدی تھی، لیکن جس کا آسان روپ پورے ملک
پھیل‌سکتا تھا۔ اس کے ساتھ مجلس آئین ساز نے ایک چھوڑ کئی دفعات میں ہند
کی دوسری زبانوں کی ترقی اور ان کے رسوم خط کی پوری پوری ضمانت کی
نے ایسی ہندی پر زور دیا تھا جس میں سب ہی زبانوں کا حسن اور توانائی
ہو۔ لیکن عملاً وہ سنسکرت‌آمیز ہندی پھیلائی گئی جو پاکستان سے آئ
پناہ‌گزینوں اور ہندوستان کے دیہی عوام دونوں کے لئے اجنبی تھی اور جو
مشہور مؤرخ آرنلڈ ٹوئنبی انیسویں صدی میں برطانوی پروٹسٹنٹ مشنریوں نے اس
گھڑی تھی کہ وہ عوام کو مغلوں سے منحرف کرکے اور ان کے جذبات
کھیل‌کر ان کو عیسائیت کی طرف راغب کرسکیں۔

زبان کے مؤرخین جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سب سے اہم وہ
میلان رہا ہے جو برج بھاشا، کھڑی، اودھی، میتھلی سب کو ساتھ لےکر اور
خودمختاری کو تسلیم کرکے آگے بڑھتا ہے۔ گاندھی جی اس کے حامی تھے
قومی امتیاز اور تہذیبی کفالت کے جذبے نے نہ صرف زبان کی پرکار کو
کی طرف لوٹا دیا بلکہ ملک کی سالمیت کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔

اردو جو دراصل ایک لسانی آمیزہ اور ملک کے سیکولر کردار کی
علامت ہے، چکّی کے ان دو پاٹوں میں دب گئی اور اس کو دہلی، یوپی،
پنجاب، راجستھان اور آندھرا ہر ہر جگہ سے دیس نکالا مل گیا۔ وہ اجنبی سمجھ
لگی اور اس کا کوئی علاقہ باقی نہیں رہا۔ معاشی بدحالی نے اردو داں ط
بالکل ہی کمر توڑ دی اور قومی معشیت میں اُردو پڑھنے والوں کو ایک م
سمجھا جانے لگا۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ لسانی، تہذیبی حلقوں میں ترقی ا
نئے آثار پیدا ہورہے تھے، اردو کے بولنے والے، اُس کے استاد اور ادیب،
حال اور دل گرفتہ تھے۔ وہ اس تہذیبی ترقی کے کارواں میں شریک نہیں

اردو والوں کو جو دولت ارثاً ملی تھی وہ مشترکہ تہذیب کی دولت تھی. اب وحدانی تہذیب کا چلن ہو رہا تھا اور اُس میں وہ نقش و نگار جن کو ہندوستانی۔ایرانی اختلاط اور اتحاد پسندی کے رجحان نے پروان چڑھایا تھا، ماند پڑتے جا رہے تھے. ہمارے طالب‌علم حُزن و یاس کے مارے ہوئے، اُستاد حق بخشوائے ہوئے، کتابیں ذوق کے بجائے قینچی اور لئی کی مدد سے تیار کی ہوئی — نتیجہ یہ کہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد، زبان و ادب کی تعلیم زندہ روایت اور تہذیبی قدر کے طور پر نہیں، بلکہ ایک مردہ و بےجان رسم کے طور پر ہونے لگی.

اِس صورت حال کا سب سے بڑا اثر لڑکوں کی تعداد پر ہوا. وہ روز بروز گرنے لگی. ۴۸ء میں دہلی یونیورسٹی میں اُردو کا صرف ایک لڑکا تھا. وہ بھی فاتر العقل. یہی شوریدگی اُسے اُردو کی جماعت میں کھینچ لائی تھی. ورنہ عقلمندوں کے نزدیک اُردو پڑھنا دیوانگی سے کم نہیں تھا. زیادہ تر طالب علم ایسے علاقوں سے آتے تھے جہاں اُردو کے اثرات کم ہو رہے تھے. خود ان کے ذہن میں بھی ایک کشمکش تھی. گھر کی زبان اُردو اور باہر کی سنسکرت آمیز ہندی. جس طرح پودے کو جڑ سے اُکھاڑدیاجائے اور وہ مرجھانے لگے یہی حال اِن طالب علموں کا تھا. نہ ان کا ش ق درست تھا، نہ انشا، نہ املا. نہ اُن کو اُردو آتی تھی، نہ ہندی، نہ انگریزی. رجعت پسند طاقتوں نے سب سے پہلا وار ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر کیا تھا. یہ اسکول یونیورسٹی کو غذا بہم پہنچاتے تھے. ان کے غیر متحرک یا مُردہ ہوجانے سے یونیورسٹی کے شعبوں کو ناقابل بیان دقّتوں کا سامنا کرنا پڑا. آج بھی اگر ہمیں اپنے نصاب کو درست کرنا ہے تو سب سے پہلے اسکول کے نصاب کو درست کرنا چاہئے. لارڈ رابنس نے آکسفورڈ یونیورسٹی رپورٹ میں اس بات پر زور دیا ہے. کیمبرج میں بھی ۱۹ فی صدی تک صرف ایٹن (Eton) سے طلبا آتے تھے جن کی تعلیم و تربیت پر غیر معمولی محنت کی جاتی تھی. جاپان کی ایک پرانی مثل ہے: «اگر قوم پیدا کرنا ہے تو ہمیں بچے بونا چاہئیں.» اس کی صداقت میں آج بھی شبہ نہیں. شاید سرسید اور ان کے رفیقوں نے بھی اسی کے پیش نظر یونیورسٹی اسکول کو خاص اہمیت دی تھی.

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آزادی کے بعد اُردو کی جو ترقی ہوئی ہے وہ پرائمری اسکول کی سطح پر نہیں ہوئی، یونیورسٹی کی سطح پر ہوئی ہے. اس کی

مثال اُس مثلث کی سی ہے جس کو اُلٹا کردیا جائے یا باس کے اُس پیڑ ہے جس کے تنے پر گانٹھیں ہی گانٹھیں ہوں اور اوپر جا کر کہیں چند نظر آجائیں۔

تعلیم کا تعلق اقدار سے ہے، اور وہ نصاب بیکارِ محض ہے جس اقدار کی جھلک نہ ہو۔ یونی ورسٹی کا مقصد تلاش حق ہے۔ لیکن وہ «انالحق کہتی بلکہ بحث کے ذریعے تخلیقی فکر کے لئے راہیں کھولتی ہے اور سماج کو بہتر پر استوار کرتی ہے۔ گوئٹے نے مرتے وقت کہا تھا، «روشنی، مزید روشنی— اس میں میری موت ہی کیوں نہ واقع ہو۔» یہی «روشنی، مزید روشنی» یو کا وظیفۂ زندگی ہونا چاہئیے۔ گلے لیو کی دریافت پر بڑی گرفت ہوئی او مخالفت نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خیالات کی ترویج سے بازآ لیکن اس محضر پر دستخط کرتے وقت بھی اُس نے یہی کہا کہ «یہ زمین رہی ہے۔» مجھے بڑی خوشی ہے کہ اُردو کے استاد ناسازگار حالات ، اقدار کی تخلیق اور اشاعت سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔

تقسیم کے بعد جو سیلابِ بلا آیا اُس میں تہذیبی قدریں خس و کی طرح بہہ رہی تھیں اور اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن اُ استادوں کی شفاعت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کا حق نہ کر دیا۔ انہوں نے اُردو کے نامذہبی کردار پر آنچ نہیں آنے دی۔ تیز و تن میں چراغ روشن کیے، دل میں ٹھنڈک اور نظر میں وسعت پیدا کی، ا دُور سے نظر آنے والی روشنی کی طرف قدم بڑھایا۔ جس وقت انسانی اقدار تھیں، انہوں نے تہذیب کی قدروں کی پرورش کی۔ جس وقت چھوٹی و کے آگے بڑی وفاداریاں بے معنی ہوکر رہ گئی تھیں، اُنہوں نے اپنے ۔ ایک ُکل کی حیثیت سے دیکھا اور اُس کی سالمیت کو کلیجے سے لگائ ہندوستان کی کسی زبان میں تہذیبی یک جہتی اور ملکی سالمیت پر اتنا زور جتنا اُردو میں۔ یہاں ملتیں اہم نہیں، اُن کے ملنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ ا اسی لئے اُردو اتحاد اور شیرازہ بندی کی زندہ علامت ہے اور اُس کے نق دراصل پورے ملک کا نقصان پوشیدہ ہے۔ ع:

گلستان میرد اگر میریم ما

اردو کے اِستادوں کا ان اقدار عالیہ پر اِتنا گہرا یقین تھا کہ اس کا اثر اس کے مخالفوں پر بھی ہوا ، اور وہ ہزار خرابی سے ہی ، لیکن اردو کی تہذیبی اور ادبی اہمیت کو پہچاننے لگے ۔ ۱۹۵۹ء میں ایک بڑے ذمہ دار شخص مجھ سے کہنے لگے :

" Faruqi Sahab, now I feell Urdu should not be allowed to die."

اس کے پیچھے کتنا غرور تھا ، عرض نہیں کرسکتا ۔ آج تک وہ چینِ قبـــا اور طرفِ کلاہ یاد ہے ۔ لیکن اس میں مجرم ضمیر کی آواز بھی پوشیدہ تھی ۔

جم گیا خون کفِ قاتل پہ ترا میر زبس
اُن نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

مشکلات ذوق فزا بھی ہوتی ہیں اور عزم اور حوصلے کی زادِ راہ بھی ۔ آج اردو کے اخبارات ، اردو کے اسکولوں اور اداروں کی تعداد اتنی ہے جو اس کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی نہیں تھی ۔ آزادی نے ہمارے سامنے اِتنے وسیع اور مثبت امکانات پیدا کردیئے ہیں کہ ان کی سرحدیں ابھی متعین نہیں ہوسکیں ۔ آج اردو کی تعلیم اٹھارہ یونیورسٹیوں میں ، سری نگر سے ونکٹیشور تک ، اور کلکتے سے احمدآباد تک ہو رہی ہے اور اسی لئے آج اس کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنے نصابی رجحانات کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا نصاب تعلیمی اقدار کا محرم ہے یا نہیں ۔ یہ کام اتنا بڑا اور اہم ہے کہ بغیر ایک نصابی ریسرچ سینٹر کے جیسا کہ امریکہ میں ہے ، دشوار ہوگا ۔

کوئی تعلیم ہنگامی مصلحتوں کی دراندازی کو برداشت نہیں کرسکتی ۔ یہی حال نصاب کا ہے ۔ اس میں گھٹیا قسم کے فائدوں کے لئے جگہ نہیں ہے ۔ آج اردو کے سلسلے میں یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ اس کے پڑھنے سے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ۔ لیکن یہ بڑی دردناک بات ہے کہ ہم ہر چیز کو بنیئے کی ترازو میں تولنے لگے ہیں اور جدھر پلہ جھکتا ہے خود بھی ادھر جھک جاتے ہیں ۔ یہ نقد سودے کا اصول اگر زندگی پر حاوی ہوگیا تو پھر ہم سارے تہذیبی کام بند کردیں گے اور خود فریبی کے نئے نئے ڈھنگ نکال لیں گے ۔ یہ رونا اردو ہی کا نہیں بلکہ قومی زندگی کا رونا ہے ۔ اس کے پیچھے جو ذہنیت کار فرما ہے وہ حد درجہ پست ، انتشار انگیز اور نقصان دہ ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے

کہ ہمارے سامنے زندگی کے وہ اعلیٰ مقاصد نہیں ہیں جو اسے بامعنی اور با
بنادیتے ہیں، ہم زبان و ادب کی تنویری قوت سے بےخبر ہیں اور کل زند
میں اس کا جو مقام ہے اس کے شناسا نہیں ہیں۔ میں بڑے ادب سے پوچھتا
کہ کیا انجینیری کے پڑھنے سے بےروزگاری کا مسئلہ طے ہوجاتا ہے؟ کیا تارا
اور کھورانا کے سامنے یہ دقتیں نہیں تھیں؟ بےروزگاری کا مسئلہ اتنا آسان
ہے جتنا ہم نے سمجھلیا ہے۔ یہ کسی مضمون کے پڑھنے یا نہ پڑھنے سے
نہیں ہوسکتا۔ یہ اس سے کہیں زیادہ بڑا معاملہ ہے۔ یہ سارے ملک کی معا
تنظیم کا مسئلہ ہے، پیداوار اور دولت کی مناسب تنظیم اور بہتر تقسیم کا مسئلہ

اِس وقت انسانی علوم اور ادبیات کے استادوں کے سامنے جو دشواریاں
وہ اُردو ہی تک محدود نہیں۔ تمام عالم میں یہی صورت ہے کہ سائنس میں بہترین
داخلہ لیتے ہیں۔ اس کے بعد سماجی علوم میں۔ چھٹور ادب میں پہنچتی ہے۔
اس کے ساتھ اس کا بھی عرفان بڑھتا جارہا ہے کہ اِس برق و بخارات کی دنیا
مرحلے بغیر ادب‌شناسی کے طے نہیں ہوسکتے۔ سائنس میں ہزار خوبیاں سہی،
وہ اقدار کی محرم نہیں ہے۔ اگر ہمیں اچھا آدمی بننا ہے، زندگی کا گہرا
اور اُس کے پیچ و خم کی بصیرت حاصل کرنا ہے تو ادب کی مدد لینا ہو
شیکسپیر نے کنگس لیر میں لکھا ہے کہ «جو محسوس نہیں کرسکتا وہ دیکھ
نہیں سکتا۔» ادب ہمارے جذبات کی تہذیب کرتا اور تخلیقی فکر کو ابھارتا
اِس لئے نصاب تیار کرتے وقت یہ ضرور غور کرنا چاہئیے کہ وہ اِس معیار و
پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔

اُردو میں چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑکر نصاب‌سازی کی طرف بالکل
نہیں کی گئی۔ نصاب کی ریسرچ سے قطع نظر، یہ بھی نہیں سوچا گیا کہ کون
اسباق کس عمر کے طالب‌علموں کے لئے مناسب ہوں‌گے۔ میں نے سودا کا
«اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل» ہائی اسکول میں پڑھا ہے۔ پھر
بی۔ اے۔ میں پڑھایا ہے۔ اب وہ ترقی کرکے ایم۔ اے۔ میں داخل نصاب ہے
لطیفہ نہ صرف ہمارے علمی معیار کے زوال کا اشاریہ ہے بلکہ اس سے و
رحمانہ بےتوجہی بھی ظاہر ہوتی ہے جو ہم نصاب کے ساتھ اکثر برتتے ہیں۔
نے الہ‌آباد کے ایک پروفیسر کے یہاں یہ کارخانہ دیکھا ہے۔ آٹھ دس طالب

پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ہر ایک کے سامنے قینچی اور لئی رکھی تھی۔ وہ تاریخ سے متعلق اجمیر بورڈ کا سٹ تیار کررہے تھے۔ پھر ذرا سی الٹ پھیر سے یوپی کا سٹ تیار ہوگیا۔ اگر ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ بی۔اے۔ کی سطح پر طالب علم زبان و بیان میں مہارت حاصل کریں اور اُن کو ادب کی زندہ روایات سے سچ مچ کی دلچسپی پیدا ہوجائے تو ہمیں خشک اور بےروح نصاب کے بجائے ایسا نصاب تیار کرنا ہوگا جو فکر انگیز اور روح افزا ہو، اور طالب علموں میں دید و دریافت اور ذوق و جستجو پیدا کردے۔ جو نصاب طالب علموں کی تخلیقی اور جمالیاتی آسودگی کا سامان بہم نہیں پہنچاتا یا جو طالب علموں میں تہِ جہانِ معنی تلاش کرنے کی تشویق اور تحریص نہیں پیدا کرتا یا اُن کو ایک میکانکی عمل کا حصہ بنادیتا ہے یا جو خود اُن کو اس تلاش کے عمل کا شریکِ غالب نہیں بناتا، وہ ناقص ہے اور اُس سے اُردو کے رہے سہے معیار بھی فنا ہو جائیں گے۔

ہندوستان قدیم روایات کا ملک ہے۔ یہاں تبدیلیاں کم آتی ہیں اور جو کبھی کبھار آتی ہیں وہ دبے پاؤں۔ اورنگ زیب (متوفی ۱۷۰۷ء) کے زمانے میں مدرسۂ فرنگی محل کے ایک عالم ملا نظام الدین سُہالوی (متوفی ۱۷۴۸ء) نے اسلامی مدارس کا ایک نصاب مرتب کیا تھا۔ وہ درس نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ آج تک اُسی طرح رائج ہے۔ اُردو کے نصاب کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے کہ جو حد بندیاں ایک دفعہ قائم ہوگئی تھیں اُن میں کوئی فرق نہیں آیا، حالانکہ زمین اور آسمان سب ہی بدل چکے ہیں۔ ہمارا حال الف لیلہ کے اُس قصے کا سا ہے کہ ایک لکیر پر چل رہے ہیں اور یہ ڈر ہے کہ اگر اِدھر اُدھر دیکھا تو پتھر کے ہوجائیں گے۔ ڈاکٹر اظہر علی مرحوم ہمارے شعبۂ اُردو، فارسی و عربی کے صدر تھے۔ ان کو مولانا امام بخش صہبائی کی کتاب بلاغت پر بہت پسند تھی۔ وہ درس میں شامل تھی۔ میں نے بارہا عرض کیا کہ کتاب لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بڑی گنجلک عبارت ہے۔ دوسرے اب جنسِ نایاب ہے، کہیں ملتی نہیں۔ بدل دیجئے۔ وہ کسی طرح اس کے نکالنے یا بدلنے پر راضی نہیں ہوئے۔ حد یہ ہے کہ پاکستان سے مجھے لکھ کر بھیجتے رہے کہ اس کے نسخے لائبریری میں ہیں۔ لڑکے کتب خانے سے استفادہ کرلیں گے۔ لیکن اس کتاب کو نکالنا نہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کی درسی کتابیں نایاب تھیں۔ ہمارے ایک بزرگ نے یہ

مشورہ دیا کہ ایک نصاب کسی طرح مرتب کرلو اور اسے تمام یونیورسٹیوں میں جہاں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے رائج کردو۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں چلائے۔ لیکن ایک پیش نہ گئی۔ اُنھوں نے اونچی سطح پر کوشش بھی کرلی تھی۔ لیکن خدا بھلا کرے یو۔ جی۔ سی کا کہ اُس نے اس بے رحم یکسانیت سے نجات دلائی۔

یہی حال نئے تجربات کا ہے۔ جب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے آنرز میں ایک Creative work shop قائم کی اور رپور تاژ، ریڈیو فیچر اور عملی تنقید کو ایک پرچے میں مناسب جگہ دی، یا ایم۔ اے میں سماجی اور تہذیبی پس منظر (Social and Cultural Background) کا پرچہ شروع کیا۔ یا مخطوطات شناسی یا ایم۔ لٹ کی ابتدا کی، یا ایک ایسے کورس کا آغاز کیا جو عصر حاضر کے ادب سے قدیم ادب کی طرف لے جاتا تھا، یا ایم۔ اے۔ اردو کی اختیاری زبانوں میں فرنچ اور بنگالی کو شامل کیا اور اس طریقے سے تقابلی مطالعے کی طرح ڈالی تو بڑی بڑی مخالفتیں ہوئیں۔ لیکن میرا منہ نہیں کہ خدا کی ان نعمتوں کا پوری طرح شکر ادا کرسکوں کہ اب یہ نئے رجحانات جڑ پکڑ چکے ہیں اور ان سے ہمیں اور ہمارے طالب علموں کو فائدہ پہنچا ہے۔

اُردو کے اُستادوں سے زیادہ اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ نصاب ایک قفس نہیں ہے جس میں استاد اور شاگرد دونوں کو اسیر کردیا گیا ہے، اور نہ اس کی حیثیت مولانا روم کی اُس بکری کی سی ہے جو رسی کے حدود سے باہر نہیں جاسکتی۔ ہر نصاب کو فلسفہ کی اصطلاح میں ماورائی ہونا چاہیے اور اچھا استاد وہی ہے جو ان پابندیوں میں سے گذر کر آزادی حاصل کرلے اور اپنے طالبعلموں کے ذہن کے دریچوں کو اس طرح کھول دے کہ تازہ ہوا کے جھونکے اندر آسکیں۔

ایک بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارا نصاب ، دنیا جہان سے الگ تھلگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ معلوم ہو اور نہ ہماری ادبی تاریخ، مُردہ مصنفوں کی داستان بن کر رہ جائے کہ اس پر مصر کے عجائب خانہ کا شبہ ہونے لگے۔ اُس کا رشتہ زندہ تہذیب سے، زندہ روایتوں سے اور روزمرہ کی زبان سے کیا ہے اور کس طرح اس کی صحت مند اقدار تنقید اور تجزیہ کے ذریعے ہماری رگ و پے کا حصہ بن سکتی ہیں، ہمیں ان تمام امور کو سامنے رکھنا ہوگا ، اس لئے کہ ہندوستان ایک بڑے تہذیبی دھارے کا حصہ ہے۔ اس کا حال امریکہ کا سا نہیں ہے جو دنیا میں

حال اور مستقبل کے زاویۂ قائمہ سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوستان کی پیچیدہ انفرادیت ہے جو ہزاروں سال میں جاکر بنی ہے۔ یہاں بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ بہت سے سیاسی انقلاب رونما ہوئے۔ لیکن ان موجوں نے تہذیب و تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز بنادیا اور اس ملک کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے معمور کردیا۔ اتحاد و امتزاج کا یہ سرچشمہ جو موہنجدارو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے میدانوں سے گذرتا ہوا برابر رواں دواں ہے۔ اس تہذیبی دھارے میں اردو زبان کی اتحادپسندی، سادگی اور شیرینی اور اردو کے ادیبوں کے امتزاجی اور تخلیقی کارنامے بھی شامل ہیں۔

ہمیں اپنے ملک کے تہذیبی مزاج کو سمجھنا اور اُسے دوسروں کو سمجھانا ہے۔ مانا کہ سب انسان اولادِ آدم اور اعضائے یک دگر ہیں، لیکن اس کے باوجود بقول جارج آرول افراد و اقوام کے ردِّ عمل، طریق فکر اور انداز و اسلوب مختلف ہیں۔ بالکل یہی حال زبان و ادب کا بھی ہے۔ ایک یوروپین پروفیسر مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے یہاں Thanks کے لئے بھی کوئی لفظ ہے؟ نیپالی زبان میں تو بالیقین نہیں۔ میں نے کہا، اردو میں شکریہ کا لفظ رائج ہے۔ کہنے لگے، اتنی میں عربی جانتا ہوں۔ آپ نے عربی کے لفظ کو بگاڑا ہے۔ میں نے عرض کیا، آپ کی یہ لڑکی مارگریٹ اگر ٹھنڈا پانی پلاتی ہے تو آپ Thanks کہیں گے۔ میں کہوں گا، جیتی رہو بیٹی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے۔ اللہ تمھارے کلیجے کو ٹھنڈا رکھے۔ یا مارگریٹ اس الماری میں سے وہ بڑی کتاب لاکر دے تو آپ لے دے کے وہی Thanks کہیں گے۔ میں کہوں گا، شاباش۔ کیسی سمجھدار اور پیاری بچی ہے۔ ہم مخاطب کی عمر اور اس کے مرتبے کو دیکھ کر خوشنودی یا تشکر کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی تو شکریہ کا لفظ مطلق درمیان میں نہیں لاتے کہ یہ ایک رسمی لفظ ہے۔ لیکن دوسرے فقروں سے اِسی بات کو ادا کرتے ہیں۔ میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا تھا۔ چھٹیوں میں مکان آیا۔ وہاں پیر میں ایک پھوڑا نکل آیا۔ بڑی سخت تکلیف تھی۔ پھوپھا صاحب کو اطلاع ہوئی۔ ان کی ۸۰ برس کی عمر۔ گھٹنے پکڑ پکڑ کے مکان کے بالائی حصے پر پہنچے۔ میرے زخم کو دھویا اور مرہم لگاکر پٹی باندھ دی۔ میں نے عرض کیا، بڑی زحمت فرمائی آپ نے۔ شکریہ۔ یہ کہنا تھا کہ وہ برہم ہوگئے۔ کہنے لگے، «میں دیکھتا ہوں کہ تم کالج میں جاکر

بالکل بینڈ گئے ۔ یہ شکریہ وکریہ کیا چیز ہوتی ہے ۔ میاں، تم حسن کی اولاد ہو ۔ میرے جی جگر ہو ۔ کیا اب ہم اس لائق بھی نہیں رہے؟"

یہی حال ادبی تاریخ کا ہے ایک زمانے میں ہمارے نقادوں کو یہ بڑی بیکلی رہی کہ ہمارے یہاں ورڈز ورتھ کیوں نہیں پیدا ہوا ۔ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا دوں کہ انگلستان میں غالب کیوں نہیں پیدا ہوا؟ دونوں ہم عصر ہیں ۔ لیکن دونوں کے تہذیبی عوامل مختلف ہیں ۔ اس لئے ان کے تخلیقی کمالات بھی منفرد ہیں ۔ امیر خسرو کا ایک مصرع ہے :

همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده برسنگ

یا اقبال کا مصرع ہے :

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

کیا کسی Nordic شاعر کے یہاں یہ نقش و نگار مل سکتے ہیں؟ ان کی شاعری کا حُسن الگ ہے اور اس کو الگ ہونا بھی چاہئے ۔ اسی طرح میر کا شعر ہے :

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو و گل کے سایے تھے

یہ شعر صرف ہندوستان کا شاعر کہہ سکتا ہے جس نے نادر شاہ اور ابدالی کی تباہ کاریوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہو اسی طرح ہر قوم کا ذہن بھی الگ ہوتا ہے ۔ ہمارا ذہن ریزہ کار ہے اور ایسا ہی ذہن امتزاجی بصیرت کے ساتھ مل کر غزل میں کمالات دکھلا سکتا ہے ۔

اسی نصاب کے سلسلے میں ایک گزارش اور ہے ۔ ہمارے اُردو کے شعبے اُردو ادب کے شعبے ہیں ۔ یہ زبان و ادب کے شعبے نہیں ہیں ۔ اسی وجہ سے زبان اور اس کے اصولوں سے بڑی بیگانگی برتی جا رہی ہے ۔ اگر ہر یونیورسٹی میں زبان کی تعلیم کا خاطرخواہ انتظام ممکن نہیں ہے تو کم سے کم ایک مرکزی ادارہ ایسا ہو جو اُردو زبان کی قواعد، اس کی Dialectology، اس کے تلفظ، اس کے رسم خط اور اس کے اٹلس وغیرہ کو مرتب کرے اور ان امور میں پورے ملک کی رہنمائی کرے ۔ آج تک ہم یہ نہیں طے کرسکے کہ دہی اور برف مؤنث ہیں یا مذکر ۔ فرانس کی اکادمی نے ۸۰ برس کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے کہ آٹوموبیل مذکر ہے ۔ لیکن اُن کے یہاں کم سے کم اس قسم کا ایک مرکزی اور

تحقیقی ادارہ تو ہے جو ان تمام امور کا جائزہ لے سکتا ہے اور جس کی رائے کو وقیع سمجھا جاتا ہے ۔ اُردو میں اس ادارے کے نہ ہونے سے جو نراج کی کیفیت یا بےمائیگی کا عالم ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل گلی ور کے قصے کا سا حال ہے۔ وہ چلتے چلتے ایک اکادمی میں پہنچا جہاں اہل علم الفاظ کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ الفاظ تو اشیا، ان کی کیفیت اور عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ الفاظ کے بجائے ان اشیا ہی کو استعمال کیا جائے۔ اسی ادارے کے دو بڑے عـــالم ان چیزوں کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے اور پسینے میں شرابور تھے۔ انھوں نے اپنے گٹھر زمین پر رکھے تب کہیں جا کر اس نئی زبان میں گفتگو کی۔

ایک امریکی دوست مجھ سے کہتے تھے کہ آپ تسلیم کریں یا نہ کریں، لیکن آپ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک متوازی اُردو پیدا ہو رہی ہے جس میں جملے کے جملے اور فقرے کے فقرے انگریزی کے ہیں۔ الفـاظ کا تو شمار ہی نہیں۔

اُردو کے سامنے جو خطرات ہیں وہ اندرونی زیادہ ہیں اور بیرونی کم۔ بے یقینی اور احساسِ کمتری کے ساتھ ہم زبان اور محاورے سے بھی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اور ایسی اُردو استعمال کرتے ہیں جو کتابی زیادہ ہے۔ یہی حال فارسی کے درس کا ہے جو آج پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ یہ کلاسیکی زبانیں مردہ نہیں ہیں۔ ہمارا نصاب مردہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اُردو کے روز مرہ اور محاورے کو، اس کی زبان و قواعد کو نصاب میں اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ معاشرے کا ورثہ اور فیضِ جاری معلوم ہو معاشرے سے الگ کوئی چیز نہ ہو۔ رابنسن کروسے کے افسانے کی دلکشی اس میں مضمر ہے کہ وہ انسان کو سماج سے الگ کر کے دیکھنے کی ناکام کوشش ہے۔ زبان لفظوں کا ایک متحرک جلوس ہے۔ لیکن بولنے والے کی حیثیت اُس عقاب کی سی نہیں ہے جس نے انسانوں سے الگ آشیانہ بنا لیا ہو۔ اُس بادشاہ کی سی نہیں ہے جو ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر فوج کا سلام لے رہا ہو۔ بولنے والا خود اس جلوس کا حصہ ہے اور اس کے ذہن کے سارے نقش و نگار اسی معاشرے نے تعمیر کئے ہیں۔ اسی لئے وہ زبان زنــــدہ رہے گی جس میں ہمارا سماجی ورثہ، نئے الفاظ کا خون اور تازہ خیالات کی توانائی شامل ہو گی۔

یہ سارے کام اردو کے استادوں کو کرنا ہیں۔ ان کے ملتوی کرنے یا ماتم کرنے سے وہ حل نہیں ہوجائیں گے۔ ہمیں اپنے پورے نصاب پر درجہ بدرجہ نظر ثانی کرنا ہے۔ اُسے اعلیٰ تعلیمی مقاصد سے ہم آہنگ بناتا ہے، اور اس کے معیاروں کو اونچا کرنا ہے۔ ہمیں شمس الامرا، کبیر ثانی۔ قدیم دلی کالج، سرسید اور عثمانیہ یونیورسٹی کی صحت مند روایات کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔ لیکن ان سب کاموں کو اس یقین کے ساتھ شروع کرنا ہے کہ اردو لازوال ہے۔ اس آسمان پر جلی اور سنہرے حروف میں لکھا ہوا ہے کہ اُردو صرف ایک یونیورسٹی میں نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم ہوگی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے رزولیوشن، جون ۱۹٦۵ ع، وزارت تعلیم کے بیانات اور کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ سے جو فال نیک نکلتی ہے وہ تو یہی ہے۔

ہمیں ابھی سے اُردو یونیورسٹی کی تیاری کرنی ہے اور ایک بڑے نقشہ کو سامنے رکھ کر اپنے نصاب کی توسیع و اصلاح اِن ہی تعلیمی مقاصد کی روشنی میں کرنا ہے جو اس سے پہلے عرض کئے جا چکے ہیں۔ اِن مقاصد کے پورا ہونے میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں، اس لئے کہ اُن سے ملک کی تقدیر، یک جہتی کی روایت اور تعلیم کے سارے اچھے اصول وابستہ ہیں۔

اُردو کے ش

ی وجہ سے

* خلیق انجم

مکتوب نگاری کا فن

مکتوب نگاری فنونِ لطیفہ کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ بلکہ اور فنون کے مقابلے میں زیادہ نازک اور زیادہ شائستہ فن ہے۔ اسی لئے بعض اہلِ قلم نے اسے لطیف ترین فن کہا ہے۔ اور فنون کی طرح اس میں بھی بہترین نقوش وہی ہیں جو خونِ جگر سے ابھارے گئے ہیں۔ مکتوب نگاری کا شمار ان فنون میں ہے جن میں فنکار اکتسابی فن سے کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ مصوری اور شاعری کی طرح اس میں بھی خامۂ خوں‌چکاں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بہترین مکتوب نگار عام طور سے وہی لوگ ہوئے ہیں جو زندگی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں پر سینے کے بل چلے ہیں۔ ان کے خطوط اس سفر کی روداد ہیں۔ ان خطوط میں فنکار کے جادو جگانے والے قلم نے ذاتی و شخصی غم و الم کی داستانوں کو کبھی درد انگیز لب و لہجہ میں بیان کیا ہے اور کبھی طنز و مزاح کا سہارا انہیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ غم و الم کی ان داستانوں اور طنز و مزاح کی شگفتگی کی حدیں اتنی وسیع ہوگئی ہیں کہ وہ آفاقی بن گئے ہیں۔

اگر کوئی ہمارے ہمسایہ کی زندگی کے تمام واقعات من و عن سنائے تو ہمیں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی، بلکہ شاید ہم بور ہوجائیں۔ لیکن اگر ہم کسی ایسے روزن سے جھانکیں جس کا رخ ہمسایہ کے گھر کی طرف ہو اور جس سے ہم اپنے ہمسایہ کی نجی زندگی دیکھ سکیں اور اسے زندگی کے معمولی مشاغل میں مصروف دیکھیں تو دلچسپی ہمیں اس روزن سے ہٹنے نہیں دیگی۔ کھڑکیوں، پردوں اور چلمنوں کے پیچھے سے گھنٹوں جھانکتی رہنے والی آنکھیں انسان کی اس فطرت سے مجبور ہے جو دوسرے لوگوں کے خطوط پڑھنے پر ہمیں اکساتی ہے۔ خود نوشت حالات اور روزنامچے بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ لیکن خطوط کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، خاص طور پر دوسرے کے خطوط کا۔ خود نوشت حالات اور

---

* ڈاکٹر خلیق انجم ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی صدر شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی مصنف محمد رفیع سودا متنی تنقید وغیرہ

وزنامے لکھتے ہوئے لکھنے والے کو ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک سے ہیں، ہزاروں افراد سے مخاطب ہے، اس لئے اپنی شخصیت، کردار اور خیالات اور ظریات پر کچھ نہ کچھ پردے ضرور ڈالے رہتا ہے. نجی خط صرف دو آدمیوں ا معاملہ ہے. عام طور پر مکتوب نگار کو یقین ہوتا ہے کہ خط مکتوب الیہ تک ہنچ کر عدم کی پراسرار وادیوں میں گم ہوجائیگا اور اس کا راز ہمیشہ راز رہے ۔. اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے بیشتر خطوط اور خاص طور پر محبت نامے جس یں عاشق کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے، وجود میں نہ آتے. یہ خطوط عام طور سے عاشق اور محبوب میں سے کسی ایک کے یا دونوں کے مرنے کے بعد شائع ہوتے یں. نپولین جس کی ساری زندگی قتل و غارت گری میں گزری اور انسانی تاریخ میں جس کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف زبانوں میں س پر تیس ہزار سے زیادہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جب اپنی محبوبہ جوزفین (Josephine) کو خط لکھتا ہے تو اس کا جسم اور روح دونوں دو زانو ہوجاتے ہیں اور وہ ایک عام انسان نظر آنے لگتا ہے. نپولین کے وہ خطوط خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو س نے اٹلی سے جوزفین کو لکھے تھے. اس وقت وہ کمانڈر کی حیثیت سے انسانی خون کی ہولی کھیل رہا تھا. اگر یہ خط گم ہوجاتے تو شاید ہمیں یہ اندازہ کبھی ، ہوتا کہ نپولین جیسے ظالم اور جابر کے سینے میں بھی انسان کا دل تھا. وہ بھی کسی انسان کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے پورے سماجی کردار کی نفی کر سکتا ۱. اور جنس لطیف کے لئے اس کے احساسات اور جذبات بھی ایسے ہی نازک ور لطیف تھے جیسے محبت کرنے والے سر پھرے دیوانوں کے ہوتے ہیں. اردو میں س کی مثال علامہ شبلی ہیں. اگر عطیہ کے نام ان کے خطوط ضائع ہوگئے ہوتے و ہمیں یہ کبھی نہ معلوم ہوتا کہ شبلی جیسے عالم، الفاروق اور سیرت النبی کے مصنف کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھتے تھے. ان کا ایک ایسا کردار بھی ۱ جو اس تمام سماجی کردار کے متضاد تھا. عطیہ یورپ سے واپس آتی ہیں تو شبلی انہیں لکھتے ہیں:

«ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے مراجعت مبارکباد قبول ہو. میری زندگی کا یہ سخت المناک واقعہ ہے کہ مبارکباد میرے لب کے بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے ... تہنیت کی غزل الگ

مرسل ہے جس کے ساتھ ایک مختصر ہدیہ ہے۔ کیا تم ان دونوں حقیر چیزوں کو قبول کرسکتی ہو؟ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریزیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے اتر نہیں سکتا، ہاں یہ صحیح ہے۔ لیکن یاد رکھو، آفتاب ذرہ پر بھی چمکتا ہے۔ میں خود نہ آسکا لیکن عن قریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آ گئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔»

عطیہ کو آفتاب اور خود کو ذرہ کہنے والا، یہ وہ شخص ہے جو اپنے عہد کی بعض اہم‌ترین ہستیوں کی عظمت سے منکر ہے۔

نپولین، ہنری ہشتم، مادام دوبیری، ایلزبیتھ بیرٹ، رابرٹ براؤننگ، کیٹس، شیلی، بائرن، وکٹر ہیوگو، گائی ڈی موپاساں، والٹیئر، جارج برنارڈ شا یورپین ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے بعض خطوط اور شبلی، صفیہ اختر، اور سجاد کے محبت نامے قابلِ ذکر ہیں۔

خط شخصی چیز ہے۔ اس میں صرف ایک آواز ابھرتی ہے اور وہ ہے مکتوب نگار کی آواز جو سو فی صدی ذاتی ہوتی ہے۔ یہ آواز مکتوب‌نگار کی دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے، اس آواز سے بھی جو مکتوب نگار کی سماجی آواز ہوتی ہے اور اس آواز سے بھی جو اس کے تخلیقی فن میں گونجتی ہے۔ یہ آواز ایک ایسے انسان کی ہوتی ہے جو عظیم فنکار ہوتے ہوئے بھی ایک عام انسان ہے، اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا، جاگتا اور سوتا ہے، جو خلوت کدے میں اپنے چہرے اور تہ‌در‌تہ شخصیت پر سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ آواز صرف ایک انسان تک محدود ہوتی ہے۔ اگر مکتوب نگار کو زندگی کا فہم و ادراک ہے، اگر نبض کائنات پر اس کی انگلیاں ہیں، اگر اس کی ژرف نگاہی انسانی نفسیات کے تمام پیچ و خم سے واقف ہے تو یہی ایک عام آدمی کی آواز آفاقی اور غیر فانی بن جاتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال صرف غالب ہیں۔

زندگی کی طرح خطوں کا دامن بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ ان میں وہ تمام رنگ ہوتے ہیں جو زندگی کی قوس قزح کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان میں ہجر کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، وصل کے مژدے سنائے جاتے ہیں، مصائب و آلام کا

ذکر کیا جاتا ہے ، ناکامیوں پر اظہار غم ہوتا ہے ، کامیابیوں پر اظہار مسرت ہوتا ہے ، مبارکباد دی جاتی ہے ، تعزیت کی جاتی ہے ، نفرت و محبت ، خلوص و ریا اور مہر و وفا غرض ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے . خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو مکتوب نگار اپنی ذاتی غرض سے لکھتا ہے اور ایسے بھی جن سے دوسروں کی بھلائی مقصود ہوتی ہے . خطوط میں انسان غیظ و غضب میں بھرا ہوا شیر نظر آتا ہے ، اور انہیں اس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے . خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں اور ایسے بھی جن میں غور وفکر کیں سو سو بناؤ ہوتے ہیں . خطوط وہ ہیں جو صرف شائع کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں . اور وہ بھی خطوط ہیں جنہیں شائع کرنے کی مکتوب نگار کبھی اجازت نہیں دیتا . خطوط کئی کئی صفحے کے بھی ہوتے ہیں اور ایک لفظ کا بھی ہوتا ہے . غرض انسانی ذہن و قلب کا کوئی احساس اور کوئی جذبہ ایسا نہیں جس کی عکاسی خطوط میں نہ ہو سکتی ہو .

خط کاغذ کے ٹکڑوں پر بکھرے ہوئے محض بےجان الفاظ نہیں ، بلکہ زندہ شے ہیں یہ بولتے ہیں . ایک دھڑکتے دل کی صدائیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں . مکتوب نگار کا مخاطب کوئی ہو اور وہ کسی بھی عہد کا انسان ہو ، وہ اگر اس فن میں کامیاب ہے تو یہ خط کرۂ ارض پر رہنے والے ہر عہد کے انسان کی ملکیت ہے ، اور جب بھی یہ خط کوئی پڑھے گا اُسے محسوس ہوگا کہ وہ اسی زمانے میں پہنچ گیا ہے ، اور مکتوب نگار کا مخاطب وہی ہے . ١٨٥٧ عیسوی میں دلی اجڑنے کے واقعات تاریخی کتابوں میں بھی درج ہیں اور غالب نے اپنے خطوں میں بھی لکھے ہیں . لیکن خطوط غالب پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دلی سو سال قبل نہیں آج اجڑ رہی ہے ، اور غالب کے مخاطب میر مہدی مجروح نہیں . ہم ہیں .

غالب نے کئی بار مکتوب نگاری کو بات چیت کہا ہے . بالکل یہی بات غالب سے تقریباً دو ہزار سال قبل سسرو نے کہی تھی . ولیم کوپر نے یہی بات ذرا گھما کر کہی ہے . وہ لکھتا ہے کہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے میں انسان کو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے . ترسیل کا ذریعہ زبان ہو یا خط ان دونوں کی جگہ کوئی اور شہ نہیں لے سکتی . اس کا مطلب ہے جو شخص بھی اس فن کے رموز سے واقف ہوتا ہے وہ اس راز کو سمجھ لیتا ہے کہ مکتوب نگاری گفتگو کا نعم البدل

ہے جو کاغذ اور سیاہی کی ایجاد نے ہم کو دیا ہے. لیکن خط اور گفتگو ایک دوسرے کا سو فیصدی بدل نہیں. خط گفتگو سے زیادہ مدلل ہوتا ہے، زیادہ واضح اور زیادہ بلیغ ہوتا ہے. اس میں بات کو زیادہ سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے. بہت سے لوگوں کے ملفوظات مرتب ہوکر شائع ہوچکے ہیں. وہ ادبی یا سیاسی تاریخ کا حصہ ہوں تو ہوں لیکن ادب کا حصہ کبھی نہ بن سکے.

ممکن ہے مکتوب نگار کے پاس ایسی کوئی خبر یا بات نہ ہو جو وہ مکتوب الیہ تک پہچانا چاہتا ہو ، اور اس کا واسطہ ایسے شخص سے ہے جس سے کچھ نہ کچھ باتیں ضرور کرنی ہوں. یا بقول شاعر

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

ایسی صورت میں خبروں اور اہم باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کہنے کی ہوتی ہیں. غالب کا ایک خط ملاحظہ ہو. اس میں انھیں صرف یہ کہنا ہے « یہ کیسے ممکن ھے تمہارا خط آئے اور میں جواب نہ دوں. » اب اتنی سی بات غالب کی کی زبانی سنئے. وہ منشی سخاوت حسین کو لکھتے ہیں:

> سبحان اللہ ! آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں اپنے کو نفرین کروں اگر شتاب نہ لکھوں. اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے تمہارا خط دیا. ادھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے کا قصد کیا. میں ایک شخص گوشہ نشین، فلک زدہ ، اندوہ گین ، نہ اہلِ دنیا نہ اہلِ دین . مجھ سے نکمے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو اس کے خط کا جواب لکھنا کیوں مجھ پر شاق ہو. ظاہر اتم خود مجمع حسن اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو میرا اس قدر اشتیاق ہو. ہاں ایک بری بھلی شاعری، اس کا حال یہ ہے آگے جو کچھ کہا سو کہا. اب شاعر بھی نہیں رہا. بہرحال تمہاری فقیر نوازی کا شکر گزار اور طالب دیدار ہوں

دیکھا آپ نے؟ کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ دیا. غالب کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا. لیکن انداز بیان سے بات کو اس طرح ماشبہ لگا کر کہا کہ ممکن نہیں مکتوب الیہ خوش نہ ہوا ہو. اچھے مکتوب نگار کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی حسن اور خوبصورتی تلاش کر سکتا

ہو، اور جو زندگی میں ہونے والے معمولی اور بظاہر ناقابل توجہ واقعات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو۔

اعلیٰ درجہ کے خطوط کی ادبی اہمیت یہ ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی نجی کیوں نہ ہوں وہ موضوع کے اعتبار سے کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں، ایک اچھے مکتوب نگار کا قلم ایسی گل افشانیاں کرتا ہے کہ مکاتیب میں ایسا تنوع، رنگارنگی و بوقلمی اور دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے کہ مکتوب نگار کی داستان ہر پڑھنے والے کی داستان بن جاتی ہے۔ جو خصوصیات کسی فن پارے کو ادب عالیہ میں جگہ دیتی ہیں ٹھیک وہی خصوصیات مکاتیب کے لئے بھی ضروری ہیں، یعنی ہر عہد اور کرۂ ارض کے ہر حصے کے لوگوں کے ذوق کی تشفی کا سامان ان میں موجود ہے۔ ادب عالیہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہو کر ہر عہد کے انسان کا تعلق اپنے تخلیقی دور سے قائم کرتا ہے۔ یونان کے عہد قدیم سے ہمارا تعلق ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کے واسطے سے ہے۔ قدیم ہندوستان سے ہماری جذباتی وابستگی رامائن اور مہا بھارت کی وجہ سے ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تصویر ہمارے ذہنوں میں وہ ہے جو غالب نے پیش کی تھی۔

خطوں کی اہمیت صرف ان کے موضوعات ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ ان کے اسلوب کی بھی اہمیت ہے۔ رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث خاں بے خبر کے خطوط میں بھی تنوع مضامین ہے۔ ان میں بھی اپنے عہد کی تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن یہی تصویریں جو سرور اور بے خبر کے مکاتیب میں مدھم اور غیردلکش ہیں، غالب کے ہاں جیتی جاگتی اور دلاویز نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے کمال فن نے ان میں زندگی ڈالی ہے۔ خطوط غالب کی زبان اور اسلوب نہ صرف اردو کے اعلیٰ ترین مکتوباتی ادب کا نمونہ ہیں بلکہ پوری اردو نثر کا قابل فخر سرمایہ ہیں۔ ممکن نہیں کہ اردو نثر کی کوئی تاریخ لکھی جائے اور اس میں خطوط غالب کا ذکر نہ ہو۔

سوانح نگاری کے بہترین مآخذ خطوط ہوتے ہیں فنکار کے خاندانی حالات اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اس کے عقائد و نظریات، اس کی سیرت و شخصیت کا پورا علم ان ہی خطوط سے ہوتا ہے۔ اپنے پیش رو فنکاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، اپنے ہم عصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اپنے فن اور

خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے ، یہ سب بہت واضح انداز میں تو فنکار کے خطوط میں ، اور اکثر زور مبہم آپ بیتیوں اور روز ناچوں میں ملے گا ۔

خطوط کی ادبی اہمیت کسی طرح بھی تخلیقی کارناموں سے کم نہیں ۔ جس طرح ادب کی مختلف اصناف سخن کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے ۔ اس طرح خطوط بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں ، بلکہ بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ اختصار کی وجہ سے اس صنف کو نثر کی دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے اور لوگ ناول اور افسانے کے مقابلے میں خطوط کا مقابلہ زیادہ پسند کرتے ہیں ۔

بعض لوگ محض اپنے خطوط کی وجہ سے زندہ ہیں ۔ بیگمات اودھ کے خطوط اگرچہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے ہیں اور اکثر خطوط دوسرے لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں ، لیکن ان بیگمات کا نام اردو ادب میں صرف ان خطوط کی وجہ سے زندہ رہے گا ۔ اگر غلام غوث خاں بے خبر اردو میں خط لکھتے تو تاریخ ادب اردو میں ان کا نام صرف غالب کے مکتوب الیہ کی حیثیت سے آتا ۔ غالب کی مقبولیت کا راز ان کے اردو خطوط میں ہے ۔ حالی نے ذرا مبالغے سے کام لیتے ہوئے یادگار غالب میں لکھا ہے :

> جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی ۔ » [۱]

میتھیو آرنلڈ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ کارلائیل ان مضمونوں اور تاریخوں کے بل پر انگریزی ادب میں زندہ نہیں رہے گا جن سے پوری الماری بھری ہوتی ہے ، بلکہ وہ بیش قیمت مراسلت جو اس کے اور ایمرسن کے درمیان ہوتی تھی ، اس کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھے گی ۔

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اگر کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہو یا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا بہت مشکل ہے ۔ پر اس تحریر کو جو خط کی فارم میں لکھی گئی ہو مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں ، کیونکہ بعض

---

۱ الطاف حسین حالی ، یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۳۱ ، ص ۱۸۸

اوقات اس فارم میں انشا پردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں ، یا ان کی تحریر کا محرک کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ اردو میں ابوالکلام آزاد کے خطوط ، قاضی عبدالغفار کے « لیلی کے خطوط » کا محرک وہی نہیں تھا جو خط لکھنے کا ہوتا ہے۔ آزاد کے خطوط اچھے انشائیے ہیں ، اسی طرح لیلیٰ کے خطوط دلچسپ ناول کی تکمیل کرتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی (Discovery of India) تاریخ کی الماری میں رکھی جائے گی۔ جانسن کے بعض خطوط جو اس نے چیسٹر فیلڈ کے نام لکھے ہیں ، مولانا آزاد کے خطوط کے ساتھ رکھے جائیں گے۔

مکاتیب کا ادبی مرتبہ کچھ بھی ہو ، وہ برے ہوں یا اچھے ، عظیم آدمی کے ہوں یا معمولی انسان کے ، ادیب اور شاعر کے ہوں یا سیاست داں کے ، ان میں ادبی خوبیاں ہوں یا نہیں ، لیکن فن تاریخ نویسی کے نقطہ نظر سے ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کوئی مورخ اس عہد میں لکھے گئے خط کو نظرانداز نہیں کرسکتا جس عہد کی وہ سیاسی اور سماجی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ ذاتی خطوط اور اہل اقتدار کے کاروباری خطوط سے انتہائی اہم مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ اسکے علاوہ خطوں کے ذریعے ہی ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعات جو تاریخی کتابوں کی زینت ہیں کبھی زندہ حقیقت بھی تھے۔ تاریخی واقعات معلوم کرنے کے ماخذ اور بھی ہیں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے کہ ان لوگوں کا ردعمل کیا تھا جو ان واقعات کے ذمہ دار تھے اور وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا ، ہمیں ذاتی خطوں ، روزناچوں اور آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ایک حساس ذہن پر کیا اثر ہوا ، دلی کی تباہی اور بربادی نے ایک شاعر کے قلب و ذہن کو کس طرح متاثر کیا ، اگر یہ معلوم کرنا ہے تو کوئی تاریخی کتاب آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔

البتہ میر تقی میر کی ذکر میر میں یہ تاثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ملیں گے۔ مرزا مظہر اور شاہ ولی اللہ کے خطوط میں بادشاہوں امیروں اور رئیسوں کی بالتفصیل داستانیں تو نہیں ملیں گی ، لیکن ان کے پیدا کئے ہوئے حالات پر اس عہد کے ذہین انسان کے تأثرات ضرور ملیں گے۔ خطوں اور روزناچوں میں فنکار جس طرح چاہے حکایت خونچکاں لکھے۔ اس میں ہاتھ قلم ہونے کا خطرہ نہیں۔

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ کسب فن کی ضرورت نہیں۔ کسی استاد سے صلاح مشورہ بھی ممکن نہیں۔ موٹی موٹی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ سے پہلے اساتذہ اس فن میں کیا کیا کمالات دکھا گئے ہیں۔ پھر خط کے لئے قلم اور دوات سے زیادہ اور کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے تمام خطوط اس کے درجہ کے ہوں۔ آج ہر روز ڈاک سے کروڑوں بلکہ اربوں خط ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ ان میں کتنے خط ہیں جو مکاتیبی ادب میں جگہ پا سکیں گے۔ شاید مہینوں بلکہ برسوں میں دو یا تین۔ اس بات کو ایچ۔ڈی۔ تھورو نے زرا مختلف انداز میں یوں کہا ہے: جہاں تک تعلق ہے پوسٹ آفس کے بغیر بھی میرا کام چل سکتا ہے، کیونکہ ساری زندگی میں مجھے صرف ایک یا دو خط ایسے ملے ہیں جنھیں پڑھ کر محسوس ہوا کہ ڈاک کے پیسے وصول ہو گئے۔

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنی فن تحریر کی۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں، دھات کی پلیٹوں، چمڑوں اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا تب بھی خط لکھے جاتے تھے۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مغربی ایشیا کے حکمرانوں کی خط و کتابت مصر کے فراعین سے تھی۔ ۱۸۸۷ء میں مصر میں عمرنا کے مقام پر کھدائی کے دوران تین سو مٹی کی لوحیں نکلی تھیں جن پر فراعین کے نام خطوط کنندہ تھے۔ یونان کے زرمیہ نگار ہومر اور مؤرخ ہیروڈوٹس کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہل روم کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنائیں ادبی مورخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل اور پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اپنے صوبے کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے لئے خط و کتابت ناگزیر تھی۔ سسرو اسی عہد کا مکتوب نگار ہے۔ سرور اور روم کے دوسرے مکتوب نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشیدالاسلام لکھتے ہیں:

«روم کی زندگی کی جھلکیاں اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنی ہوں تو سسرو کے مکاتیب میں دیکھئیے۔ آپ ان میں سادگی کی تلاش کریں گے تو خالی ہاتھ واپس آئیں گے رومیوں کے مکاتیب کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال کے بین بین ہے اس دور میں فن کتابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے۔ زندگی بندھے تکے قوانین کی پابند تھی۔ اس لئے مکتوب نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا تھا۔ خطوط کی قسمیں تھیں۔ مبارکباد کے خطوط، تنبیہی خطوط، تعزیت کے خطوط ناصحانہ خطوط، جن میں کسی پر ملامت کی جائے اور وہ خطوط، جن میں دوسروں کو تشفی دی جائے ان کے علاوہ سرکاری فرمان اور رقعات بھی تھے اور ان سب کے آداب و القاب، مضامین کی ابتدا اور انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ القاب و آداب کے بعد غرض دیکھئیے اب یہ پیمانے چلا کیے انداز پر گفتگو شروع ہوتی تھی۔ جس مین بلاغت کے سارے زیور صرف کر دئے جاتے تھے۔»[1]

جب اسلام وجود میں آیا تو عرب میں فن غیر ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ خط لکھنا ایک پیشہ تھا۔ اس پیشہ کے اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ آنحضرت کے عہد میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی کی۔ خود آنحضرت کے خطوط موجود ہیں۔ مسلمانوں میں خط و کتابت کی ترقی کے تقریباً وہی اسباب ہیں جو روم میں تھے، یعنی سیاسی ضرورت . . . حضرت عمر کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے خط و کتابت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار دار الانشا قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا۔ باقی تمام صوبوں میں سرکاری سطح پر ایسے محکمے قائم کئے گئے۔ دار الانشا صرف لائق اور قابل لوگوں کے سپرد ہوتا۔ حضرت عمر کا اصرار ہوتا تھا کہ صوبہ دار اپنے اپنے صوبوں کے حالات اس طرح بیان کریں کہ پوری تصویر سامنے آجائے۔ چنانچہ صوبہ دار ہمیشہ اس کا خیال رکھتے۔ ابن عاص نے مصر کی فتح پر حضرت عمر کو جو خط لکھا تھا وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اس عہد میں خط و کتابت صرف کاروبار تک ہی محدود نہیں تھی،

۱۔ خورشید الاسلام، تنقیدیں، علی گڑھ، ۱۹۶۳، صفحہ ۱۵۔

بلکہ بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے انہیں دنیا کے مکاتیب ادب میں عالی مقام حاصل ہے۔ اس خط کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

امیر المومنین کا مکتوب گرامی، خدا انہیں تادیر سلامت رکھے، ورود فرما ہوا جس میں مجھ سے مصر کے متعلق تفصیلات طلب کی گئی ہیں۔ امیر المومنین، مصر ایک نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب جگہ ہے۔ اس کا طول ایک مہینے اور عرض دس مہینے کی مسافت ہے۔ اسے ایک خاکی رنگ کے پہاڑ اور ایک خاکستری رنگ کے ایک ریگ زار نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل بہتا ہے۔ جس کا خرام سحری مبارک ہے اور روانی شب مسعود۔ اس کا بہاؤ کبھی تیز ہوتا ہے اور کبھی سست، جیسے آفتاب و ماہتاب کی رفتار۔ مخصوص اوقات میں اس کی لہریں اتنی سفید اور شیریں ہوجاتی ہیں کہ دودھ کی دھاریں معلوم ہوتی لگتی ہیں اور مکھیاں ان پر بھنبھناتی ہیں۔ زمین کے چشمے اور تیز رو نالے جب اس میں طغیانی پیدا کردیتے ہیں تو وہ چنگھاڑنے لگتا ہے۔ اور جب اس کی موجیں بلند ہوکر کناروں کو پھاند جاتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ہلکی ہلکی ڈونگیوں کے سوا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا غیرممکن ہوجاتا ہے۔ اور وہ کشتیاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادلوں میں — جنہیں ڈھلتے دن کی چاندنی کھینچے — تیر رہی ہیں۔ جب اس کی طغیانی شباب کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جس شان سے چڑھا تھا اُسی شان سے الٹے پاؤں اترجاتا ہے۔ اس وقت لوگ نکلتے ہیں زمین گودکر اس میں دانہ ڈالتے ہیں اور پروردگار سے اس کے پھلنے پھولنے کی امیدوار ہوتے ہیں۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ بھی بغیر کسی جد و جہد کے اس سے پھل پاتے ہیں۔ جب دانہ پھوٹتا ہے تو نمی اسے پانی پلاتی ہے اور زمین اسے غذا بہم پہنچاتی ہے۔ اور اس وقت یا امیرالمومنین، مصر کی زمین رنگ برنگ کے چولے بدلتی ہے۔ ابھی چمکتا موتی ہے تو ابھی عنبر اشہب۔ ابھی زمرد سبز ہے تو ابھی گندمی چہرہ۔ پاک ہے وہ خالق کائنات جس نے مصر کو ان نعمتوں سے نوازا اور رونق و آبادی سے امتیاز بخشا۔

البتہ یہاں کسی بڑے آدمی کے متعلق معمولی آدمی کی بات نہیں مانی جاتی ، اور یہاں کا خراج وقت معینہ سے پہلے وصول نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں کی آمدنی کا تہائی حصہ نہروں اور پلوں کے کام میں صرف ہوتا رہے۔ جب یہاں کے حالات استحکام پذیر ہو جائیں گے تو آمدنی بڑھ جائے گی۔ آغاز و انجام میں خدائے بزرگ و برتر ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔[1]

حضرت عمر سے پہلے حضرت ابوبکر کے زمانے میں حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت کاتب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمر کے کاتب حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن خلف تھے۔ حضرت عثمان یہ کام مردان بن حکم سے لیتے تھے۔ حضرت علی کے عہد میں حضرت عبد بن ابی رفع اور حضرت سعید بن نجران الہمدانی یہ کام کرتے تھے۔

اسلامی حکومتوں میں بنو امیہ اور بنی عباس کے عہد میں اس فن نے خوب ترقی کی اور اس محکمہ کا نام دیوان الانشا پڑ گیا۔ مامون الرشید کے زمانے سے ہی فارسی زباں کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عجمیوں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں سے عربی کو نکال دیا گیا جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر بھی پڑا۔ یہاں سے فارسی انشـــا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جب ہلاکوخان نے دولت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا تو عربی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہوگیا اور فارسی انشا کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔

خط لکھنے والوں کو پہلے کاتب کہا جاتا تھا۔ لیکن اب فارسی زبان کے زیراثر انہیں دوات دار ، دبیر اور منشی کہا جانے لگا۔ مسلمانوں میں وزارت کا مستقل عہدہ قائم ہونے تک منشیوں کو بادشاہ سے سب سے زیادہ تقرب حاصل تھا۔ فن مکتوب نگاری پر فارسی میں بہت کتابیں لکھی گئیں۔ خطوط کے مجموعے مرتب ہوئے رشیدالدین فضل اللہ کے مکاتیب کا مجموعہ منشات رشیدی کے نام سے مرتب ہوا۔ مولانا عبدالرحمن جامی کے خطوط «رقعات جامی» مکاتیبی ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔

---

١ محمد حسین ہیکل عمر فاروق اعظم ; مترجمہ حبیب اشعر ، لاہور ، ١٩٥٨ء ، ص ص ٥٥٠ - ٥٥١ - بعض مورخین نے اس خط کو جعلی بتایا ہے ممکن ہے ایسا ہو - لیکن یہ حقیقت ہے کہ آغاز اسلام کے عہد کی مکتوب نگاری کا یہ نمونہ ہے۔

انگریزی کے مکتوب نگاروں میں سب سے پہلے ولیم کوپر اور چارلس لیمب کے نام آتے ہیں۔ یہ دونوں زندگی کے ہنگاموں سے دور تھے۔ لیکن ان دونوں کو خط لکھنے کا شوق تھا۔ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے انھوں نے اپنے خطوط کا مواد حاصل کیا ہے۔ عورتوں میں تھومس کارلائل کی بیوی جین کارلائل اور فرانس کی مادام ڈی سوین (Madame de Sevigne) نے غیرفانی خطوط لکھے ہیں۔ انگریزی مکتوب نگاری میں گرے، باولر، ولیم جیمز اور وُڈرو ولسن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز فارسی کے زیراثر ہوا اور مکتوب نگاری کی ذہنی ساخت و پرداخت میں مناظر الانشا، منشات برہمن، انشات مادھورام اور منشآت طیوری جیسی کتابوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کے سامنے رقعات ابوالفضل، رقعات ظہوری، پنج رقعات ظہوری، رقعات نعمت خان عالی، رقعات بیدل اور رقعات قتیل جیسی کتابیں تھیں۔ اردو مکتوب نگاری کے ابتدائی دور میں غلام غوث خاں بے خبر، رجب علی بیگ سرور، غلام امام شہید اور اس فن کے ناخدا اسد اللہ خاں غالب کے نام ملتے ہیں۔ غالب سے لے کر ہمارے عہد تک بے شمار مکتوب نگار ہوئے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگ اس قابل ہیں کہ وہ مکتوب نگاری کی تاریخ میں جگہ پاسکیں۔ داغ، امیرمینائی، سرسید، حالی، شبلی، مہدی الافادی، نیاز فتحپوری، اور چودھری محمد علی وغیرہ قابل ذکر حضرات ہیں۔

* ذاکر حسین فاروقی

منیر شکوہ آبادی

(۲)

سو سال پہلے کا انڈمان آج سے بہت مختلف تھا۔ نہ کھانے کا انتظام، نہ رہنے کا بندوبست، نہ شہر و بازار، نہ کوچہ و دیار۔ چیزیں ملتی نہیں اور ملیں بھی تو خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے لائے جائیں۔ نتیجے میں منیر کو بڑے مصائب سے گذرنا پڑا۔ لیکن جیسا کہ غالب نے کہا ہے:

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

یہی کیفیت منیر کی تھی۔ ہر مصیبت پر ہنستے تھے اور ہر تکلیف پر قہقہے لگاتے تھے۔ ان میں یہ بے پناہ ہمت محض اس لئے پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ۱۸۵۷ کی تحریک انقلاب کو ایک ایسا جہاد فی سبیل اللہ تصور کرتے تھے جس میں ہر سختی کو برداشت کرنا ثواب اور ہر مصیبت سے گذرنا خوشنودیٔ باری تعالیٰ کا سبب تھا یہ ان کے عقیدہ کی پختگی تھی جس نے ان کو انڈمان کی آگ کو ان کے لئے گلزار اور کالے پانی کے آب شور کو ان کے لئے شہد ناب بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مصائب کا ذکر کرتے ہیں تو منہ نہیں بسورتے۔ قہقہے لگاتے ہیں۔ نالۂ پرسوز سناتے ہیں لیکن تبسم کا ساز بجاتے ہیں۔ دل کے داغ دکھاتے ہیں لیکن انہیں گل خنداں بنا دیتے ہیں۔ ان کے عقیدہ کی پختگی اس اور ان کے باغیانہ تیوروں کی اس کے کجکلاہی کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

انڈومان کے حالات انہوں نے ایک قصیدہ میں بڑے شاعرانہ انداز میں بیان کئے ہیں۔ لیکن حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے۔ بیان کا خلوص، الفاظ کا تاثر اور طنز کی نشتریت قابل توجہ ہے:

---

* ڈاکٹر ذاکرحسین فاروقی لکھنوی، بی اے، پی ایچ ڈی، استاد اردو، مہاراشٹر کالج، بمبئی، مصنف دبستان دہلی و دبستان آرزو۔

نکل کر ہند سے آنا ہوا جب اس جزیرے میں
اسیروں کی سیہ بختی سے کالا ہو گیا پانی
نکلوا کر وطن سے بھردیا جنگل میں لاکھوں کو
جگہ رہنے کی اب پاتے نہیں غول بیابانی
ہوئے ہیں جمع تحت و فوق عالم اس جزیرہ میں
بلندی اور پستی کی یہاں دیکھی فراوانی
بلندی پر چڑھے تو دار پر گویا چڑھے ناحق
جو اترے تو کنویں میں لے گرے گویا گراں جانی
اگر اشیا میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی
بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بہ آسانی
ابالی دال کو کتے کی قے فاقہ سمجھتا ہے
نکمے چاولوں کو جانتا ہے بھینس کی سانی
میسر لحم مرغ دل ہے لیکن گوشت عنقا ہے
چبائیں کیوں نہ پشت دست اس ٹاپو کے زندانی
سوائے لخت دل ممکن نہیں ہے عید اضحیٰ کو
اگر گاو زمیں ثور فلک کی بھی ہو قربانی
اگرچہ گندمی رنگوں کو پیا اس جزیرے نے
نہ پائی ایک دن بھی آرد گندم کی ارزانی
کرو اَرہ کشی یا مٹی کھودو چکیاں پیسو
اگر ہو جاں بلب منھ میں نہ ٹپکائے کوئی پانی
شکر کے بدلے ریگ ساحل دریا ہزاروں من
کرے کیا خاک کوئی دعوت مور سلیمانی
سمجھ کر شور عشر اس کو مردے چونک پڑتے ہیں
یہ دریا شور کرتا ہے کہ ہوتا ہے جگر پانی
ثقالت آب دریا میں ہے نرمی سنگ ساحل میں
کلیجہ پانی کا پتھر ہے، پتھر کا جگر پانی
برستا ہے برابر ابر دریا بار روز و شب

بھرا جاتا ہے سب کے مزرعِ امید پر پانی
ہوائے تند سے نخلِ فلک فرسا اکھڑتے ہیں
بہی جاتی ہے بارش کے سبب بنیادِ انسانی
عذاب قوم نوح و قوم عاد آپس میں توام ہیں
نشی آب و ہوا ہے دعوت اصحاب زندانی
وہ گرمی ہے یہاں جو ہند میں موسم ہے سردی کا
حرارت دھوپ کی ہے دوزخِ اجسام انسانی
گئی گرمی تو پھر برسات ٹھہری نہ مہینے تک
اسی برسات سے ہے ہم بغل فصلِ زمستانی
یہاں، اربابِ لندن کی بھی رنگت زرد ہوتی ہے
بنے مشکی اگر نقرہ دکھائے اپنی جولانی
سحر کی بھیرویں کہ شام کلیاں اس جگہ سمجھو
کدارا چاندنی میں ہے اندھیری رات کا بانی
وطن سکھیوں کا، جاگیر ہے یہ مار و کژدم کی
کھلانا زہر قاتل ہے یہاں کی عین مہمانی
جہاں دیکھو ہے اکلِ میتّت و خنزیر کی کثرت
حریص اسکے ہیں از بس چینی و برہما و نصرانی
یہاں بیماریاں دیکھیں زیادہ ساری دنیا سے
بنا ہے کیسۂ امراض گویا جسمِ انسانی
دوا کا قحط ہے، امراض بےمانگے میسر ہیں
گرانی ہوشیاری کی ہے، بے ہوشی کی ارزانی
خبر بھی آ نہیں سکتی شفا کی اس جزیرہ میں
کیا ہے امتِ عیسیٰ نے کیا اسکو بھی زندانی؟

قید میں کپڑے بوسیدہ ہوکر ختم ہو گئے تو ہندوستان سے ایک دوست نے کچھ کپڑے بھجوا دئے۔ لیکن شومیٔ تقدیر ساتھ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ یہ کپڑے چوری ہوگئے، بیچارہ مجبور اور آوارۂ وطن شاعر اور کیا کرتا۔ چوروں کی مذمت میں ایک قطعہ کہہ دیا۔ مضمون آفرینی کا کمال ملاحظہ ہو:

یہاں کے چور وہ شاطر ہیں فنِ دزدی میں
چرا لیں آنکھ نہ سمجھے نگاہِ انسانی
جو دستبرد دکھائیں وہ اپنی عید کے دن
اجل نہ پائے کبھی نقد جان قربانی
کمند و جست کی ہو احتیاج اگر ان کو
اڑا ہی لائیں رمِ آہوئے بیابانی
تونگری جو وہ پائیں کسی کی قسمت میں
چرا لیں غیب سے مضمونِ خط پیشانی
تراش لائیں نقاطِ نجوم دم بھر میں
نہ رہنے پائے بیاض سپہر افشانی
گہر سے آنسوؤں کو اب نہ دے کوئی تشبیہ
یہ لوگ آنکھ چرا لینے میں ہیں لا ثانی
سحاب تیرہ بنیں یا کسوف بن جائیں
جو جام مہر میں سن پائیں سونے کا پانی
برہنہ مثلِ بہائم بنا دیا سب کو
اتار لے گئے بالکل لباس انسانی

یہ ۱۲۷۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد دو سال تک کپڑے نصیب نہیں ہوئے۔ لیکن ۱۲۸۱ھ میں جہانگیر نامی ایک پارسی قید ہوکر انڈمان پہنچا۔ یہ شخص انگریزی، ہندی اور فارسی زبانوں کا ماہر اور بڑا علم دوست تھا۔ منیر کا شہرۂ سخن سن‌کر حاضرِ خدمت ہوا اور ان کی شاگردی اختیار کی۔ اس نے استاد کے لئے کپڑے بنوا دئیے۔ جس کا ذکر ان کے ایک فارسی قطعہ میں موجود ہے۔

منیر انڈمان ہی میں تھے کہ وطن سے اہلیہ اور بہن کے مرنے کی خبر آئی۔ کوئی کمزور دل کا آدمی ہوتا تو اس جلا وطنی اور بے سروسامانی کے عالم میں یہ صدمات اس کے دل کو چورچور اور اس کے کلیجہ کو شق کر دیتے۔ لیکن منیر کے دل میں اپنی قوم کا غم اور اپنے وطن کی بربادی کا الم اس درجہ گھر کئے ہوئے تھا کہ اس غمِ دوراں نے غمِ جاناں کے لئے کوئی گنجایش ہی باقی نہیں رکھی تھی۔ انہوں نے وفادار بیوی یا چاہنے والی بہن کا کوئی مرثیہ نہیں کہا بلکہ ہندوستان کی غلامی اور پامالی کا ان الفاظ میں ماتم کرتے رہے:

مٹا ہے نام شاہی ہند سے اس درجہ ان روزوں
نہیں ممکن کہ اب باِنات بھی کہلائے سلطانی
جو کل مزدور تھے وہ آج ٹھہرے راج کے مالک
جو شب کو مہترانی تھی ہوئی دن کو مہا رانی
عدالت ان دنوں ایسی بڑھائی ہے زمانہ نے
کہ شمشیر و گلو پیتے ہیں اک ہی گھاٹ کا پانی
زمانہ کا پتہ ملتا نہیں معدوم ہونے سے
مسافر ڈھونڈھتے ہیں اب سرائے عالمِ فانی
ہوا چترِ ہما عنقا سے بھی معدوم ان روزوں
پڑے ہیں دھوپ میں محتاجِ سایہ ظلِ سبحانی
پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے
الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کے تاجِ سلطانی
کسی نے کوڑیوں کے مول بھی پوچھا نہ ان روزوں
چڑھی نیلام پر سلطانی و نوابی و خانی
کیا زاغ و زغن نے آشیانہ چتر منزل پر
سرِ تختِ ہما ہیں بوم صرفِ بال افشانی
پڑے ہیں خاک پر شاہانِ عالم واہ ری قسمت !
کمینے ٹھوکروں سے توڑتے ہیں تختِ سلطانی
محل سونے کے لوٹے ، کھد گئے ایوان مینائی
بنا ہے کہنہ گورستاں کی صورت قصرِ سلطانی
عدالت سے ملی ہے چغد و بوم و زاغ کو ڈگری
ہوئی ہے ضبط ملک بلبل و طاؤس بستانی
گلستانِ ارم میں دھوم ہے مرگھٹ کی دعوت کی
تکلف سے ہے قیصر باغ میں گھورے کی مہمانی
سیہ کاروں کے سر پر افسرِ عزت نظر آئے
بنے ہیں مرغِ عیسیٰ ان دنوں مرغِ سلیمانی
پھنسا ہے موذیوں کے قبضہ میں حسنِ جہاں آرا

قمر در عقرب ان روزوں بنا ہے ماہ کنعانی
غنی ہیں اژدہا و چغد و سیل و بوم ان روزوں
کسے دیں گے سلاطین جہاں جاگیر ویرانی
چنے کھانے کو ترسیں صاحبان گوہر عالی
صدف کو دے نوالہ موتیوں کا ابر نیسانی

انگریزوں کے عدالتی نظام اور غدر کے بعد انصاف کے نام پر ظلم کی تصویر ان الفاظ میں کی ہے :

ہوئے فرماں روا خود مدعی ماخوذ فرماں بر
تأمل کی نظر سے اس کو دیکھیں انسی وجانی
کہ جو ہے مدعی قاضی وہی مفق وہی شاہد
اگر ہو غیر ثالث تو عدالت کی ہو آسانی
کرے جو استغاثہ خدمت حکام اعلیٰ میں
بحالی حکم اول کی سنائیں قاضی و دانی
مثال اس کی یہ ہے جیسے بہت بیمار ہو کوئی
گھٹے طاقت مدام اس کی بڑھیں امراض جسمانی
نہایت منت و زاری کرے حاذق طبیبوں کی
نہ سنتے ہوں وہ اس کا شکوۂ آلام روحانی
سنیں بھی تو کہیں بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے
وہی کافی ہے پہلا نسخہ اے بیمار نادانی

انگریزوں نے ہندوستانیوں سے اسلحہ جات چھین لئے تھے۔ اس کا تذکرہ انہوں بڑے درد سے کیا ہے :

ہوا ہتھیار چھن جانے کی عالم میں چلی جب سے
چلیں گھر چھوڑ کر جنگل کو گجراتی الیمانی
بنائیں بیڑیاں تلواروں کو تڑوا کے گردوں نے
کیا ارباب جوہر کو ہر اک حیلہ سے زندانی
بہادر نوحہ گر ہیں ماتم مرگ شجاعت میں
بھائے نعرۂ شیرانہ سیکھے مرثیہ خوانی

رؤسائے فرخ آباد میں سے بعض مارے جا چکے تھے اور جو بچ رہے تھے وہ خود پریشان حال تھے ۔ امرائے لکھنؤ سے بھی کسی دستگیری کی توقع نہیں تھی، اس لئے کہ اول تو لکھنؤ خود ہی اجڑ چکا تھا ، اور دوسرے ایسا کون تھا جو انگریزوں کے ایک معتوب کو پناہ دینے کی جرأت کرتا۔ ایسی حالت میں لے دے کے ایک نواب صاحب رام پور ہی تھے جو اس آوارہ وطن انقلابی شاعر کا ملجا و ماوی بن سکتے تھے۔ چنانچہ منیر ارمانوں کی ایک دنیا دل میں بسائے، آرزوؤں کا ایک شہر سینے میں سمیٹے انڈمان سے ہندوستان کو روانہ ہوئے ۔ ایک طرف رہائی کی خوشی ، دوسری طرف دربار رام پور میں رسائی کا مژدہ ، شاعر کا دل ہجوم مسرت سے ناچ اٹھا اور جذبات نے الفاظ کی شکل اختیار کر لی :

بارے آئی نجات کی باری ۔۔۔ کھل گیا عقدۂ گرفتاری
ہم کو منصب ملا رہائی کا ۔۔۔ قید کو جائیداد بیکاری
پاؤں کو چھوڑ بھاگے مارِ دوسر ۔۔۔ سر کو پشتارۂ گرانباری
کوچ ٹھہرا مقامِ غربت سے ۔۔۔ اب وطن چلنے کی ہے تیاری

رفقائے انڈمان کو بڑے انداز سے رخصت کر رہے ہیں:

رخصت اے دوستان زندانی ۔۔۔ الوداع اے غم گرفتاری
الرحیل اے مشقتِ ہر روز ۔۔۔ الفراق اے ہجوم ناچاری
دال فے عین اے کتابتِ قید ۔۔۔ گاف میم اے حسابِ سرکاری
دال چاول سے کہہ دو رخصت ہوں ۔۔۔ پانی میں ڈوبے یہ نمک کھاری
مچھلیوں سے کہو کہ ہٹ کے سڑیں ۔۔۔ گھاس کھودے یہاں کی ترکاری
چینی ، برہما ، ملائی ، مدراسی ۔۔۔ اہلِ آسام ، جنگلی ، تاتاری
اپنے دیدار سے معاف کریں ۔۔۔ اپنی باتوں سے دیں سبکساری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت ۔۔۔ اشکِ شادی ہیں آنکھوں سے جاری

اب بحری سفر کی کیفیت ملاحظہ ہو ۔ منظر نگاری ، معنی آفرینی اور خیال بندی کو آپس میں ملا کر ایک نظر افروز چمن آراستہ کر دیا ہے :

کرم اے خضر ، المدد اے نوح ۔۔۔ رحم اے فضلِ حضرتِ باری
السلام اے خروشِ بحر محیط ۔۔۔ السفر اے سفینۂ جاری
زادِ راہِ سفر توکل ہے ۔۔۔ رہنمائی کو اس کی غفاری

سامنے ہر طرف سمندر ہے — سایۂ آسمان زنگاری
ہم سفر قافلے ہیں موجوں کے — خضر و نوح کو ہے سالاری
جامِ بلور ہر حباب میں ہے — عکس خورشید کی طلاکاری
دن کو خورشید کی زر افشانی — رات کو اوس کی گہر باری
بحر اخضر کی پستی رنگت — فلکِ سبز کی ضیا باری
اس طرف فرشِ اطلسِ آبی — اس طرف سائبانِ زنگاری
پانی کے اٹھتے ہیں بلند پہاڑ — اس پر آتی ہے موج کی باری
پانی پر چڑھ کے پانی بہتا ہے — قدرتِ حق کی ہے نموداری
بل بے شور آتشیں سفینہ کے — اف رے پہیوں کی گرم رفتاری
ناخدا و معلم و ملاح — چست و چالاک محو ہشیاری
ابر و باراں و موسمِ طوفاں — یا علی ہر زباں پر جاری
شوق بادِ مراد کا ہر دم — خوفِ طوفاں سے دل کو بیزاری
نکلے دریائے شور سے صد شکر — بحرِ شیریں کی آ گئی باری
نظر آیا سوادِ کلکتہ — شکر ہے شکرِ حضرت باری

کلکتہ سے منیر الہ آباد آئے ، ارادہ یہ تھا کہ دوستوں سے ملنے کے بعد رام پور جائیں گے۔ لیکن شومیٔ تقدیر ا خبر ملی کہ نواب یوسف علی خاں جنت آرام گاہ ہو گئے۔ منیر کو پھر ایک تاریک مستقبل کا سامنا ہو گیا۔ وہ دو سال تک الہ آباد میں بے روزگاری کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن آلام و مصائب کے اس درجہ عادی ہوچکے تھے کہ افلاس اور ذہنی پراگندگی کے اس عالم میں بھی اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں سے غافل نہیں رہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی « معراج المضامین » نظم کر ڈالی جو حسن بیان ، معنی آفرینی ، شکوہ الفاظ اور جدت تخئیل کا ایک عظیم شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اردو کی کسی مثنوی کو ایران کے نازک خیالوں یا عجم کے سخن آفرینوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ نہ سحر البیان ہے نہ گلزار نسیم ، بلکہ صرف معراج المضامین ہے۔

(باقی)

تبصرے

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

نوائے عصر از یحییٰ اعظمی، ملنے کا پتا: مصنف، شبلی منزل، اعظم گڑھ۔ (یو۔ پی)، ۱۹۶۹ء، صفحات ۱۰۷ قیمت: تین روپے۔

بعض اوقات کسی شاعر کے افکار و رجحانات کا پتا چلانے کے لئے اس کے اشعار کی تہوں کو کھولنا پڑتا ہے۔ لیکن نوائے عصر کا شاعر خود ہی اپنا اور اپنے میلانات کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان الفاظ کی روشنی میں یحی اعظمی کے کلام کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

« میں مشاعرہ کا شاعر نہیں۔ کم آمیزی میری طینت اور گوشہ گیری میری فطرت ہے۔ طبیعت کا مذاق عام نمود و نمائش سے نفور اور ناموری و شہرت طلبی کی دنیا سے دور ہے۔ با ایں ہمہ مجھے شعر و ادب سے کسی قدر ذوق ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنے احساس کی تسکین، روح کی تشفی اور قلب کے انشراح و انبساط کے لئے کہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے آہنگ قلم اور میری نوائے فطرت میں کوئی تضاد نہیں۔ دوسرے الفاظ میں، جو میرا ادب ہے وہی میری زندگی ہے اور جو میری زندگی ہے وہی میرا ادب ہے۔ »

، نوائے عصر، کی نظموں میں ادب اور زندگی کی ہم آہنگی اورحقیقت بیانی نے اردوشاعری کی اس روایت کو زندہ رکھا ہے جسے شبلی نعمانیؔ اور اقبال سہیل نے اپنی بلیغ اور پر مغز شاعری سے مروج کیا تھا۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں جو نظمیں ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعر اپنے جذبے میں کس قدر مخلص، اپنے احساسات میں کتنا ہمہ گیر اور موضوعات کے انتخاب میں کس قدر تنوع پسند ہے۔ اس لحاظ سے اگر انہیں نظم کا شاعر کہا جاتا ہے تو کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں ہے۔ « مستقبل کا ہندوستان »، « اے جنت کشمیر »، اور « لعل و جواہر کے وطن » وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں وہ حب وطن کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے۔ « جواہر لال نہرو » اور « وطن کے دو مایہ ناز فرزند » میں اس نے جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی قدآور شخصیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

« دور نو »، « دور تجلی » اور « ۵ اگست کا تاریخی دن » اس کے جذبۂ حریت کی عکاسی کرتا ہے ۔

موضوعات کے تنوع کے با وجود یحیی کا قلم روانی اور برجستگی کے ساتھ خیالات اور تصورات کے انمول موتی بکھیرتا ہے ۔ ان کے ذہن و مزاج کی پاکیزگی ، خیالات اور اسلوب میں جدت پیدا کرتی ہے اور کسی حصے میں بھی شاعر کے ذہنی اضمحلال اور درماندگی کا احساس نہیں ہوتا ۔

تمثیلاً چند اشعار ملاحظہ کیجئے :

ہر سبزۂ پامال بن جائے گا فردوس نظر آب رواں سے لہلہااٹھے گا ہر ایک دشت و در
برگ وثمر کے بار سے جھک جائیگا ہر نخل تر نشو و نمو کے کیف سے جھومے گی ہر شاخ شجر
گائیں گی رنگیں زمزمے موج رواں جوئے رواں
اک روز ہوجائے گا یہ ہندوستان جنت نشاں

خاک وطن کا کوکب تقدیر ہے پھر اوج پر قصر ترقی کی نئی تعمیر ہے پیش نظر
مٹ جائیں گے ماضی کے پارینہ نشاں پھر سربسر ہوگا بساط دھر میں اک نقش تا زہ جلوہ گر
ہر گاؤں میں تعمیر ہوگا اک نیا ہندوستان
اک روز ہوجائے گا یہ ہندوستاں جنت نشاں

(مستقبل کا ہندوستان)

اک زندگی نو کا ہے پیغام وطن کو جو بھی ہے تری فطرت بیتاب کا اقدام
ہے ذوق ترا شورش طوفاں سے ہم آغوش ہے جوش ترا بے خبر گردش ایام

(جواہر لال نہرو)

یحییٰ اعظمی کی فکری دنیا کسی ایک موضوع کے لئے مخصوص نہیں ہے ۔ اُن کی ہر تخلیق سے اس حرارت کا احساس ہوتا ہے جو ایک دردمند دل اور ایک حساس شاعر کے وجود کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے ۔ « بد نصیب ماں سے خطاب » اور « بیٹی کی رخصتی پر باپ کے تأثرات » میں یحییٰ اعظمی نے خصوصاً بڑی خوبصورتی سے اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے ۔ بیٹی کی رخصتی کا یہ منظر دیکھئے :

ابھی کل تک تھیں جن ماں باپ کی لخت جگر بیٹی
وہی کرتے ہیں اب رخصت تمہیں با چشم تر بیٹی
نظر کا نور تھیں ، آنکھوں کی ٹھنڈک، چاندنی گھر کی
تمہیں کہتے تھے جان مادر و جان پدر بیٹی
بڑھی تھیں جس کے سایہ میں ، پلی تھیں جسکی گودوں میں
ستم ہے چھوٹتا ہے اب وہی میکہ کا گھر بیٹی
وطن میں جس کی عزت کا ہمیشہ پاس رہتا تھا
نہ آئے حرف کوئی باپ کے اس نام پر بیٹی

«یاد رفتگان» کے عنوان سے مجموعہ میں کئی مرثیے شامل ہیں۔ یہ مرثیے شاعر نے اُن احباب اور شخصیتوں کی وفات پر لکھے ہیں جن میں سے بیشتر کے ساتھ وہ زندگی کے کئی مرحلوں میں ہم سفر تھے ۔ مولانا حفظ الرحمٰن ، جگر مراد آبادی ، اقبال سہیل اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال پر یحییٰ اعظمی کے تأثرات اردو مرثیے کے اسلوب میں ایک نئی چیز ہیں ۔

نوائے عصر لطیف ، مؤثر اور حوصلہ افزا نظموں کا مجموعہ ہے ۔ اس کی اشاعت سے ہمارے شعری سرمایہ میں ایک خوشگوار اضافہ ہوتا ہے ۔ امید ہے کہ شاعر کے پہلے مجموعۂ کلام نوائے حیات کی طرح سے یہ مجموعہ بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اسے قبول عام حاصل ہوگا ۔

کہرے کا چاند از ڈاکٹر محمد حسن ، شعبۂ اردو ، دہلی یونی ورسٹی ، دہلی، ۱۹۶۹ع ، صفحات ۶۹ ، قیمت تین رُپے ۔

غالب کو شکایت تھی کہ عشق کی بے سرو سامانی کی وجہ سے قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نظر آتا تھا ۔ لیکن اس عریانیت کے بغیر قیس کی تصویر کے خط و خال واضح بھی نہیں ہوسکتے تھے یہی بات غالب سے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے ۔ وہ اگر دلی کے منتشر ، پراگندہ اور زوال پذیر ماحول میں زندگی نہ گذارتے تو ان کی شخصیت کے خطوط اتنے واضح نہ ہوتے جتنے کہ اب ہیں۔ «کہرے کا چاند» کے پس منظر میں ہمیں یہی حقیقت نظر آتی ہے ۔

تین ایکٹ کے اس مختصر سے ڈرامے میں ڈاکٹر محمد حسن نے ان واقعات کی عکاسی کی ہے جن کی آنچ میں تپ کر غالب کی شخصیت اور نکھر گئی تھی۔

پہلا ایکٹ آگرہ کی اس دنیا کو پیش کرتا ہے جس میں دس گیارہ سال کا غالب پیغمبری وقت کے باوجود اپنا چھوٹا سا فرغل اور کلاہ فقیر کو بخش دیتا ہے۔ اسی ایکٹ میں وہ ایک ایسے نوخیز جوان کے روپ میں ابھرتا ہے جو فریب آرزو میں مبتلا ہے۔ شطرنج اور پتنگ بازی سے اپنے درد کا مداوا کرنا چاہتا ہے۔ اسی ایکٹ کے تیسرے منظر میں اس ڈومنی کا المیہ ہے جو اپنی خواہش کے باوجود، درد سے چور شاعر کے دل کو اپنی محبت سے نہ بھر سکی اور موت کی گہرائیوں میں کھو گئی۔

دوسرے ایکٹ میں غالب کی «شکست آرزو» کا ذکر ہے۔ یہاں وہ خود اپنے وجود پر ہنستا نظر آتا ہے۔ «اقبال بلند! دولت زیادہ!! خوب!!! اقبال اتنا بلند کہ بھکاری غزلیں گائیں اور علما، فضلا اور بادشاہ قدر افزائی سے باز رہیں»۔ غالب کے یہی خیالات اُسے زندگی کی اس موڑ پر لے آتے ہیں جہاں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ «شعروں میں جی کا دکھڑا رو لینے اور اپنے آپ کو سعدی و حافظ جان لینے سے کیا ہوگا»۔ اور پھر وہ اپنے مکان کو جوئے خانے میں تبدیل کرکے خود کو قید و بند کی رسوائی مول لیتا ہے۔

تیسرے ایکٹ میں غالب کو حالات کی سنگدلی اور اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کی دردناک موت، مولانا صہبائی کی شہادت، مصطفےٰ خاں شیفتہ کی بے بسی اور بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی، اب اُس پر اس قدر بے حسی طاری کرچکی تھی کہ وہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی خوشی میں اپنے ملبوسات بیچ کر چراغاں کرتا ہے۔

ڈرامے میں چھوٹے بڑے تقریباً بیس کردار ہیں اور سب غالب کی شخصیت کو ابھارنے میں ممدو معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے غالب کی زندگی کے مستند اور غیر مستند واقعات کو بڑی عمدگی سے ایک خوبصورت پلاٹ میں ڈھالا ہے۔ واقعات کے انتخاب میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ ان کے پس منظر میں غالب کی شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی پڑے۔ ڈرامے میں غالب ایک شطرنج باز، نو مشق شاعر، لطیفہ گو، دل شکستہ عاشق، قمار باز اور شکست خوردہ انسان کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ ڈرامہ کی ایک امتیازی خوبی، اس کے چبھتے ہوئے مکالمے ہیں جن میں ادبیت اور شستگی پائی جاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ ڈرامہ غالب کی سیرت و شخصیت کا ایک اچھا ترجمان ہے۔

گلزار خلیل از خلیل صمدانی، مرتبہ طفیل احمد تابش بیکانیری ، ملنے کا
پتا : آزاد منزل ، نزد مدینہ مسجد، بیکانیر ، راجستھان

گلزار خلیل ، شہر بیکانیر کے ایک مشہور وکیل خلیل صمدانی کے شاعرانہ ر کا مجموعہ ہے۔ وکالت اور شاعری ، دونوں کے دائرۂ عمل میں کافی بعد محسوس ا جاتا ہے لیکن «گلزار خلیل» کے مطالعے سے اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ ر نے اپنے مذاق اور مزاج کو قانونی موشگافیوں سے محفوظ رکھا ہے۔

ابتدا میں اردو کالج کراچی کے شعبہ انگریزی کے استاد محمد حسین صاحب مانی نے خلیل صمدانی کی زندگی کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جنھوں نے ان شاعرانہ مذاق کی تہذیب و تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ پھر انصار عشر امروہی کا لہ «حضرت خلیل صمدانی بیکانیری اور ان کی شاعری» شامل ہے۔ مقالہ نگار خلیل صمدانی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

«گلزار خلیل» میں قدیم و جدید کا ایک اچھا امتزاج ملتا ہے۔ خلیل کے ار میں مذہبی ، اخلاقی اور تہذیبی روایتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ جدت اور ت کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ شاعر نے مجموعہ کے خاصے حصے میں اسلام کے دار اصولوں کی ترجمانی اور ہادی اسلام کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ مجموعہ ، غزلیات بھی شامل ہیں۔ ان میں روایتی موضوعات کی موجودگی کے باوجود نے بیان کی ندرت اور روانی و سلاست کی وجہ سے ایک نیا پن محسوس ا ہے۔

(ڈاکٹر) آدم شیخ

ایڈیٹر : عبدالرزاق قریشی
ڑ پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے ادبی پرنٹنگ پریس، ۸، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر
کان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ، ۹۲ ، دادا بھائی نوروجی وڈ کے لئے شائع کیا۔

نوائے ادب بمبئی

تاریخ اشاعت ۱۵ اکتوبر ۱۹٦۹ء

جلد ۲۰ اکتوبر ۱۹٦۹ شمارہ ۴

شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	عبدالرزاق قریشی	۲
۲	افضل اور ان کا وطن	تنویر احمد علوی	۵
۳	گلزار چشت	حسیف شاہد	۴۱
۴	حسرت موہانی بحیثیت تذکرہ نگار	احمر لاری	۵۳
۵	منیر شکوہ آبادی	ذاکر حسین فاروقی	٦٦
٦	ضمیمۂ قطب مشتری	م . ن . سعید	۵۹
۷	دکھنی اردو کی لغت	دیوی سنگھ چوہان	۷۱
۸	تبصرے	قاضی اطہر مبارکپوری، آدم شیخ	۷٦
۹	مقالہ نما	عبدالحلیم ساحل و دیگر مرتبین	۱—۵۴

شذرات

حکومت ہند ہر سال عربی، فارسی اور سنسکرت کے محققین و مصنفین کی علمی خدمات کا اعتراف "سند اعزاز" کی شکل میں کرتی ہے۔ اس سال عربی علوم و ادب کی سند دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے ناظم جناب مولانا معین الدین احمد صاحب ندوی کو ملی ہے جو ہر لحاظ سے اس کے مستحق ہیں۔ شاہ صاحب کی پوری زندگی دارالمصنفین میں رہ کر علوم اسلامیہ کی خدمت میں گذری ہے۔ ان کا خاص موضوع تاریخ اسلام ہے اور اس پر ان کی تصنیف کی ہوئی کئی جلدیں دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں ان کی جدید ترین کتاب "دین رحمت" اسلامی حلقوں میں کافی مقبول ہوئی اور اسے اہل علم نے بہت سراہا۔ اپنے خاص موضوع کے علاوہ شاہ صاحب نے اردو زبان و ادب سے متعلق بھی متعدد وقیع مضامین لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ "ادبی نقوش" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (مولانا) سید سلیمان ندوی کے پاکستان چلے جانے کے بعد دارالمصنفین کی علمی نظامت شاہ صاحب ہی کے سپرد ہوئی اور انہوں نے اس ذمہ داری کو عمدگی سے سنبھالا اور اب تک سنبھال رہے ہیں۔ خود سید صاحب نے ان کی اس کامیابی پر اپنی خوشنودی اور اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ دارالمصنفین ابتدا ہی سے قناعت پسند اور ایثار پیشہ علمی خدمتگذاروں کا مسکن رہا ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اپنی پوری زندگی ایک معمولی مشاہرے پر اس علمی خانقاہ میں گزار دی۔ حکومت کے ان کی علمی خدمات کے اعتراف اور قدردانی سے ان کے نیاز مندوں اور دوستوں کو خصوصاً بڑی مسرت ہوئی۔ شاہ صاحب کی قدردانی کے ساتھ ساتھ یہ دارالمصنفین کی بھی عزت افزائی ہے اور اس کا ہر فرد اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

انجمن ترقیء اردو، ہند کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس کا دفتر اکثر و بیشتر کرائے کے مکان میں رہا ہے۔ اس کمی کو ایک عرصے سے محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن طرح طرح کی مشکلات کی وجہ سے عمارت کی تعمیر کا سامان نہ ہو سکا تھا۔ انجمن نے سرمائے کے لئے عام چندے کی اپیل کی جس پر اردو والوں نے کچھ گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اب حکومت ہند کے محکمۂ تعلیم نے اس مقصد کے لئے انجمن کو چار لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ خود انجمن کے پاس اس مد کے ڈیڑھ لاکھ روپے ہیں۔ اس طرح کل ساڑھے پانچ لاکھ ہوئے۔

انجمن کے آرکیٹکٹ (Architect) نے تعمیر کا تخمینہ سوا آٹھ لاکھ کیا ہے۔ اب بہر حال امید ہو چلی ہے کہ یہ اہم کام انجام پا جائے گا۔ انجمن کو چندہ جمع کرنے کی مہم کو تیز تر کر دینی چاہئیے اور ہر اردو دوست کو اس میں شریک ہونا چاہئیے۔ عمارت دہلی میں بنے گی اور انجمن کا دفتر علی گڈھ سے وہاں منتقل ہو جائے گا۔ امید ہے کہ اس کے بعد انجمن کا دائرہ عمل اور وسیع ہو جائے گا اور علمی و تنظیمی دونوں حیثیتوں سے بہتر کام ہو سکے گا۔

دکھنی یا قدیم اردو سے اہل اردو کی دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ انجمن ترقیء اردو، ہند، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، سالار جنگ ٹرسٹ، حیدرآباد، کی کوششوں سے دکھنی مخطوطات ایک خاصی تعداد کی شکل میں ملنے لگے ہیں۔ ہندوستان کی اکثر یونیورسٹیوں میں ایم ۔ اے کے طلبہ کے لئے قدیم اردو کے لئے چند کتابیں ضرور شامل نصاب ہوتی ہیں۔ اردو کے محققین کے لئے بھی اور ام ۔ کے طلبہ اور اساتذہ لئے بھی یہ زبان اپنی قدامت کی وجہ سے مشکل کا باعث ہوتی ہے۔ اس سے بڑھتی ہوئی دلچسپی اور ساتھ ہی اس کے مطالعہ کی دقت کو دیکھ کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس وقت جب وہ جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد، میں شعبۂ اردو کے صدر تھے، ایک دکھنی اردو لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کام میں انھوں نے اپنے شعبے کے ایک اور استاد ڈاکٹر غلام عمر خاں کو اپنے ساتھ لیا۔ دونوں اساتذہ کی برسوں کی عرق ریزی، کے بعد لغت تیار ہو کر شائع ہوگیا ہے۔ جسے ایک مفید اور اہم علمی کارنامہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ مرتبین اہل اردو اور خصوصاً محققین کے شکرئے کے مستحق ہیں۔ کتاب پر مفصل تبصرہ اسی شمارے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شذرات کے ذریعے محققین اردو سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ نوائے ادب کے مقاصد کو پورا کرنے میں مرتب کی مدد فرمائیں۔ نوائے ادب کا ایک خاص اور اہم مقصد دکن و گجرات کے قدیم کارناموں کو روشنی میں لانا اور ان کے مصنفوں سے موجودہ اہل ادب کو روشناس کرانا ہے۔ دکنیات پر پہلے بھی اس میں اکثر مضامین شائع ہوتے رہتے تھے لیکن گجراتیات سے متعلق بہت کم مضامین شائع ہو سکے ہیں۔ محققین سے ایک بار پھر درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے اس نظرانداز کئے ہوئے گوشے کی طرف ضرور توجہ فرمائیں۔ یہ گوشہ اردو زبان کی تاریخ کے اہم ترین گوشوں میں سے ہے، اس لئے اس کی طرف سے بے توجہی برتنا اپنی زبان کی تاریخ کو ادھورا یا ناقص رکھنے کے مترادف ہوگا۔

بعض اور علاقے ہیں جہاں اردو کا کچھ نہ کچھ قابل توجہ کام ہوا ہے ا
اب بھی وہاں اردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ مثلاً مدھیہ پردیس کے متع
خطے۔ راجستھان کے مختلف مقامات وغیرہ۔ ان صوبوں اور علاقوں کے ادبی کارنا
کو بھی روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام مقامی اہل قلم بہتر طریقے پر انج
دے سکتے ہیں۔

ان صفحات میں اس سے پہلے دو بار لکھا جا چکا ہے کہ (پروفیسر
سید نجیب اشرف ندوی کی وفات پر جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا اس میں ایک تجویز پا
ہوئی تھی کہ ایک "پروفیسر ندوی میمورل فنڈ" قائم کیا جائے اور اس کی آمدنی سے
ایک ایسے طالب علم کو جو بمبئی یونیورسٹی سے پی، ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے ل
مقالہ تیار کرے، ماہانہ اسکالرشپ دی جائے۔ مرحوم کے احباب اور تلامذہ سے
خصوصاً اس میں حصہ لینے کی اپیل کی گئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں
بہت کم توجہ کی۔ بیرونی احباب اور وہ تلامذہ جو اس وقت بمبئی سے باہر مق
ہیں، بالکل اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، حالانکہ ان کی تعداد خاصی ہے ا
ہے کہ استاد فقیہ کے جملہ احباب اور تلامذہ مزید تاخیر کے بغیر اس اچھے ا
مفید کام کی طرف توجہ کریں گے۔ رقم جنرل سکریٹری، انجمن اسلام، ۹۲، د
بھائی نوروجی روڈ، فورٹ، بمبئی، کے نام نقد یا چیک کی صورت میں یا منی آر
کے ذریعے بھیجی جائے۔

(پروفیسر) سید نجیب اشرف ندوی کے انتقال سے انجمن اسلام اردو ریسر
انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی جو جگہ خالی ہوئی تھی اس پر اب تک مستقلاً کس
کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ اب انجمن اسلام کی مجلس انتظامیہ نے اس کے لئے ڈا
سید ظہیرالدین مدنی (ام۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی۔) کا انتخاب کیا ہے اور وہ یکم جنو
۱۹۷۱ء سے اس ذمے داری کو سنبھالیں گے۔ ڈاکٹر مدنی ایک عرصے تک اسما
یوسف کالج (بمبئی) میں اردو کے استاد رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں انجمن اس
نے دو سال کے لئے ان کی خدمات حکومت بمبئی سے عاریۃً حاصل کی تھیں
انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اس ط
سے انسٹی ٹیوٹ سے ان کا تعلق پرانا ہے۔ نوائے ادب انہیں کی تجویز پر اور ا
کی کوششوں سے جاری ہوا تھا اور وہی اس کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ ان کی
تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی مجلس علمی کی ایک تجویز کے مط
نوائے ادب کے اگلے شمارے (جنوری ۱۹۷۰) سے شذارت کا سلسلہ ختم کیا جاتا ہ

* تنویر احمد علوی

افضل اور ان کا وطن

شمالی ہند کے ریختہ کے اس پہلے شاعر کا نام محمد افضل اور تخلص افضل تھا۔ اپنی مشہور شعری تخلیق بکٹ کہانی کے آخری شعر میں انہوں نے افضل کے ساتھ خود کو گوپال بھی کہا ہے:

بیادِ دل ربا خوش حال می‌باش
کہے افضل کہے گوپال می‌باش

شاید اسی شعر کو ذہن میں رکھتے ہوئے فہرست ہندوستانی مخطوطات مخزونہ انڈیا آفس لائبریری کے فہرست نگار نے بکٹ کہانی کے مصنف کی حیثیت سے ان کا نام گوپال لکھا ہے:

Bekat Kahani: a Bara masa poem describing the grief of a woman separated from her lover at each month of the year by Gopal.[1]

اس شعر کے انداز بیان سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ افضل نے یہ نام اپنی حیات معاشقہ کے دوران اختیار کیا تھا۔ ممکن ہے ان کی محبوبہ کا نام گوپال وتی یا ایسا ہی کوئی دوسرا نام رہا ہو جس میں گوپال شامل ہو، اگرچہ اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

اس شعر میں یاد محبوب کی دل‌آسائی اور اس کے تصور کی انبساط‌آفرینی کا ذکر جس والہانہ احساس مسرت کے ساتھ کیاگیا ہے اس سے ذہن اس طرف منتقل ضرور ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ اسی کی وجہ سے بعض اہل تذکرہ کو یہ غلط فہمی ہوئی ہو کہ افضل گوپال نامی کسی «ہندو بچہ» پر عاشق تھے، چنانچہ صاحب تذکرۂ گلزار ابراہیم نے لکھا ہے کہ

«بر گوپال نامی عشق ورزیدہ حسب حال خود بارہ ماسہ مشہور بہ بیکٹھ کہانی منظوم نمودہ۔»[۲]

A Catalogue of Hindustani manuscripts in the India Office Library, London, B. Hardt, P. 113.

۲ گلزار ابراہیم، ص ۲۸

* ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ایم۔ اے؛ پی‌ایچ۔ ڈی؛ استاد شعبۂ اردو، دلی کالج، دہلی؛ رکن نصابی کمیٹی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی؛ مصنف ذوق، مرتب کلیات ذوق، کلیات شاہ نصیر وغیرہ۔

اس گوپال نامی سے اہل تذکرہ کی کیا مراد ہے اس پر میر حسن کے مندرجۂ ذیل بیان سے کچھ روشنی پڑتی ہے:

«. . . . کدام ہندو بچہ گوپال نامی کہ برو عاشق شدہ حسب‌حال خود بارہ ماسہ عرف بیکٹھ کہانی گفتہ.»[1]

ان بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اہل تذکرہ بکٹ کہانی کو افضل کی داستان معاشقہ تصور کرتے تھے. مگر یہ کہانی اپنی ادبی روایت اور موجودہ صورت میں افضل کے امرد پرستانہ عشق کی داستان ہو ہی نہیں سکتی. یوں بھی افضل کے زمانہ تک ریختہ گوئی امرد پرستانہ جذبۂ عشق کی روایت سے نا آشنا تھی.

یہی خیال دوسری شکل میں بکٹ کہانی کے فاضل مرتب ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کہانی کے سلسلے میں اپنے تحسینی جذبات کے ساتھ پیش کیا ہے:

«افضل بھی صوفی تھے. لیکن انہوں نے پریم کا کھیل مجاز کی سطح پر اس انداز سے کھیلا تھا کہ اردو شعر کی تاریخ میں اس سے زیادہ رنگین داستان کوئی نہیں ملتی.

«بارہ ماسہ کے آخری شعر سے یہ صاف ظاہر ہے کہ افضل نے بارہ ماسہ عشق کا یہ رنگین ناٹک کھیلنے کے بعد ہی لکھا ہے جس کی یاد ان کی زندگی کا عزیزترین سرمایہ بن چکی ہے. بارہ ماسہ میں در حقیقت وہ اپنی محبوبہ کا کردار ادا کر رہے ہیں.»[2]

اس ضمن میں آگے چل‌کر موصوف نے افضل کے ایک معنوی شاگرد عبداللہ انصاری کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہ «بکٹ کہانی معرفت کا ایک انداز ہے» لکھا ہے:

«یہ آپ بیتی. جگ بیتی ہے. اسے کسی استعارہ یا تمثیلی حجاب کی ضرورت نہیں. یہ افضل کی داستان عشق ہے. یہ گوپال کی پریم کہانی ہے.»[3]

افضل کی اپنی داستان معاشقہ کے مجازی رنگ سے انکار کی گنجایش نہیں. لیکن جہاں تک اس پریم‌کہانی کا تعلق ہے اسے ان کا «قصۂ عشق» نہیں کہا جاسکتا جسے کسی استعارہ یا تمثیلی حجاب کی ضرورت نہیں. جبکہ خود ڈاکٹر صاحب اسے «آپ‌بیتی» کے ساتھ «جگ‌بیتی» بھی کہتے ہیں اور اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:

---

۱ تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۴

۲ بکٹ کہانی، ص ۲۹

۳ ایضاً، ص ۲۹

« افضل نے اپنی واردات کو حدیث دیگراں بلکہ سر دلبراں میں پیش کیا ہے ۔ »[۱]

اس میں افضل نے اپنی محبوبہ کا رول ادا کیا ہو ایسا بھی نہیں ۔ اُن کی پریم کہانی میں اُن کی محبوبہ کا جو رول رہا ہے وہ اس کی تفصیلات میں موجود ہے ۔

افضل اپنی حیات معاشقہ کی حسین روداد اگر نظم کردیتے تو ریختہ کی منظوم عشقیہ داستانوں میں حقیقت نگاری کا ایک نہایت دلکش نمونہ سامنے آتا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا ۔ اس میں قصہ سرے سے ہے ہی نہیں ۔ صرف غم جدائی کا ذکر ہے جو ایک فراق آشنا عورت کی زبان اور انداز بیان کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ خود افضل نے اسے اپنی کہانی نہیں کہا بلکہ ایک حسین اور دل ربا یاد سے تعبیر کیا جو در اصل اس شعری تخلیق کے جذباتی پہلو کی عکاسی کرتی ہے اور اس کے محرکات میں سے ہے ۔

علاوہ بریں ڈاکٹر صاحب نے افضل کو ایک صوفی شاعر مانا ہے ۔ وہ « مشرب فقر » اور « چاشنیٔ عشق » سے بہرہ ور تھے ۔ اس کی طرف اشارہ ان کے داستان نگار نے بھی کیا ہے ۔ خود بکٹ کہانی کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ افضل عشق کے صرف مجازی تصور کے قائل نہیں تھے ۔ وہ فارسی کے صوفی شعراء بالخصوص جامی سے بہت متأثر نظر آتے ہیں ۔ عشق و تصوف کے موضوع پر ان کے ہندی و فارسی شعر اس نظم میں اچھی خاصی تعداد میں مل جاتے ہیں ۔ مثلاً

به مسجد کعبهٔ و ادیار عشق است	به دار و کوچهٔ و بازار عشق است
اگر بر دار باشی ہمچو منصور	نباشی از در دلدار مہجور
به عالم ہرچه بینی کار عشق است	کنوں « قالو بلیٰ » آزار عشق است

اس موقع پر افضل کی داستان معاشقہ کو اس کے راوی کے اپنے الفاظ میں مختصراً پیش کردینا دلچسپی اور افادہ سے خالی نہ ہوگا :

« ناگاہ عشق ہندو زنی بر دلش بمرتبۂ استیلا یافت که مجنون صفت متاع زہد و تقویٰ بقمار محبت آن شیرین ادا سنگدل بت پرست درباخت و در آن بےخودی اکثر غزلہای عاشقانه می فرمود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہرگز آن سیه چشم ، تیرہ درون بحال آن عاشق بے دل مفتون التفات نه فرمود ۔ ۔ ۔ تا آنکه آن

---

۱ ۔ بکٹ کہانی ص ۳۹۰

صنم بت‌خانه رعنائی از نظر آن گرفتار خود را مخفی و نهان ساختی و در مراسم حجاب بحدی تقید نمود که در اعیاد هنود و مراسم معهود هم قامت افزا وجلوه پرداز نبود تا آنکه یکبار از دل‌دار دل‌آزار مایوس گشته در کوچهٔ او با دل زار و چشم اشکبار سر به دیوار حسرت به نشست . . . .

عاقبت خویشان و نزدیکان او صلاح در آن دیدند که آن بلاے جان و آفت جهان را بخانهٔ اقرباے او که به قصبهٔ متهرا دارند و ازین دیار دوردست افتاده باید فرستاد تا این شور و فساد رفع و این ننگ و عار دفع شود . عاشق بعلت پیری و ضعف قویٰ از طے مسافت بعید معذور ممکن که ازین سوداے خام و ارادهٔ ناتمام باز ماند .

«آخر الامر شبی آن ماه را در ہالهٔ لحافی نشانده باحتیاط تمام مخفی بآن دیار فرستادند .

«مدتے مدید چو آن شیداے رمیده‌آرام اثری از آن محبوب گل‌اندام ندیده در تفحص افتاد و آخر معلومش شد که آن شهرهٔ شهر او را در آتش قهر و حرمان گذاشته به متهرا رفته است . از استماع این خبر جان‌کاه سر در پی آن حور لقا نهاد و افتان و خیزان به دیار محبوب رسیده در مقام تفحص و تجسس افتاد .

«روزی در چشم خون‌بارش جمعی از دختران لیلی عذار، خورشید رخسار آمدند که به نشاط و انبساط تمام سیر می‌کردند و آن ماه‌رو، زہره لقا نیز درمیان آنها بود بی‌اختیار نزدیک رفته این شعر حسب حال خود برو خواند :

خوشا رسوائی و حال تباہی سر راہی و آہی و نگاہی

آن لیلی‌وش جفاکار، شیرین‌لقا تلخ‌گفتار بعد از معرفت و شناخت لب شکربار باین جواب تلخ کشاد که ترا شرم از محاسن سفید نیست که سودای عشق بازی چون من زن جوانی در سر داری؟ مولوی ازین سخن انفعالی کشیده در فکر تدبیر شد .

«لهذا ریش تراشیده و زنار آویخته به لباس برہمنان مرید مرشد ساکنان بت‌خانهٔ آن جا گشت وخدمت شبانه روزی آن جا اختیار کرد و شروع در تحصیل علوم ہندوی نموده در اندک زمانه حاوی جمیع علوم و فنون و

کمال آن مسلک آمد . . . و مرتبۂ معلوماتش بجائی رسید که خدمۂ بت‌خانه نائب منائب مرشد خودش تصور کردند».[1]

شدہ شدہ وہ وقت آگیا کہ مندر کا بڑا پروہت مرض‌الموت میں گرفتار ہوا اور ہنگام نزع اس نے اپنے ساتھیوں اور مریدوں کو یہ مشورہ دیا کہ اس کی موت کے بعد اُن کو (افضل‌کو) مندر کا سب سے بڑا پجاری مقرر کیا جائے۔ اس مقام تک پہنچنے کے بعد بالآخر وہ وقت بھی آگیا جب ان کے حصول مراد کی راہ کھل گئی جس کا ذکر بڑے دلکش پیرایہ میں تذکرۂ ریاض الشعرا کی زینت ہے۔

«عادۃ اہل آن دیار بود که در سالی یک روز اماث بزیارت بت‌خانه دیر می آمدند و نثار بسیار می‌گردانیدند و آن را از اعاظم خیرات . . . و وسیلۂ حصول مرادات می‌دانستند. اتفاقاً آن روز موعود رسید و جمع عورات برسم معہود و جہت پرستش و زیارت پیر می‌آمدند و قدمبوسی می‌نمودند. چون نوبت پابوسی به آن منشای عشق و جنون رسید مولانا دست او را به شوق و شغف تمام گرفته بچشم خود مالید و بر زبان آورد که مرا می‌شناسی؟ چون آن شوخ چشم سر بالا کرده شناخت که آن ہمان مہوط وار زمانی در ورطۂ حیرت افتاد و خاموش ماند. آخر الأمر صورت عشق پیر در آئنۂ دلش منعکس شده بی‌اختیار متأثر شد و اشک‌فشان و گریه‌کنان در جواب گفت که برای چون من ناکس این ہمہ تصدیع و تعب کشیده اید. دیگر ہرچه در رضای شما است رضای ما است.»

نتیجہ یہ کہ وہ ہندو عورت مولانا کے کہنے پر مسلمان ہو گئی اور ان کی شریک حیات بن گئی۔

«ہر دو بدیار خود مراجعت نموده مدت حیات باہم سر بردند.
«در سنه ۱۰۳۵ ھ بریاض رضوان شتافت.»[2]

افضل کے اس افسانۂ محبت کا قاری اس کی دلچسپیوں سے لطف اندوزی کے باوجود بعض ذہنی الجھنوں سے دوچار رہتا ہے۔ ترجمہ نگار نے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل کو «ضعیف العمر» اور «علت پیری» میں مبتلا ظاہر کیا ہے۔ کیا اس زمانۂ عمر تلک افضل مجرد زندگی گذار رہے تھے؟ اس لئے کہ ان کے معاملات

۱۔ ریاض الشعرا [والہ داغستانی] مخزونہ آصفیہ اسٹیٹ لائبریری، ق ۹۳-۹۱

۲۔ ریاض الشعراء [والہ داغستانی] مخزونہ آصفیہ اسٹیٹ لائبریری

عشق میں کہیں زن و فرزند و خانماں کا ذکر نہیں ہے ۔ اور کیا اس عمر میں وہ تمام ہنگامہ آرائی ممکن تھی جو اس داستان میں ملتی ہے ۔ ان کے جذبۂ عشق کے والہانہ پن اور اُن کی مہم پسندانہ روش ضعف قویٰ اور علت پیری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ۔ علاوہ بریں وہ جواں العمر ہندو عورت جسے افضل کی کوچہ گردی کے پیش نظر رسوائی و بدنامی سے بچانے کے لئے دور دست قصبہ متھرا میں بھیجا گیا تھا اُسے افضل کے تلاش محبوب میں روپوش ہو جانے کے باوجود اس دیار غیر میں کیوں رکھا گیا ؟ ، اور اس اثناء میں اس کے عزیزوں اور نزدیکوں کو اس کی شادی کر دینے کا خیال کیوں نہ آیا ؟ جبکہ ہندوؤں میں جوان لڑکیاں اتنے دنوں تک نہیں بیٹھی رہتیں ۔ پوجا کے دن بھرے مجمع میں افضل کو مندر کا بڑا پروہت ہوتے ہوئے ایک [پوجا کے لئے آنے والی] عورت کا ہاتھ چومنے اور اس سے اظہار مدعا کرنے کی جرأت کیسے ہوئی اور یہ بات چھپی کیسے رہی ؟ وغیرہ ۔

اس سے کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ افضل کی اس پریم کہانی میں کچھ باتیں زیب داستاں کے طور پر بھی شامل ہوں واله نے اس قصہ کے ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا ۔ وہ خود افضل کا معاصر نہیں ہے ۔

افضل کی حیات معاشقہ کی اس کہانی کے علاوہ ان کی زندگی کے آثار و احوال پردۂ خفا میں ہیں ۔ اُنکی پیدائش ، خاندانی حالات اور تعلیم و تربیت کے ماحول سے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے ۔ صاحب ریاض الشعرا نے ان کا تعارف ایک معلم کی حیثیت سے کرایا ہے اور ان کے علم افضل کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :

> « بحلیۂ فضائل صوری و معنوی و کمالات ظاہری و باطنی محلّی و آراستہ ۰۰۰ شعر ہندی و فارسی را بغایت خوب می گفت و عرائش اسرار و معانیء آبدار در لباس نظم و نثر بجلوۂ ظہور می آورد و مقبول خاص و عام بل و مطبوع جمہور آفاق و انام بود ۔ جمعی کثیر و جمعی غفیر در حلقۂ درس او حاضر می گشتند و استفاضۂ انوارالعلوم از شعشۂ غیر خورشید منیرش می نمودند ۔ »[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک مشہور و معروف شخص تھے ۔ فارسی اور ہندی پر قدرت رکھتے تھے ۔ دونوں زبانوں میں بہت اچھے شعر کہتے تھے اور نظم و نثر دونوں میں صاحب تصنیف و تالیف تھے ۔

۱ ۔ ریاض الشعراء ، ق ۹۱

آج بکٹ کہانی کے علاوہ جو ایک مختصر سی شعری تخلیق ہے، افضل کی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلتا جس سے ان کے کمالات ظاہری و باطنی پر مزید روشنی پڑ سکے دیگر تذکرہ نگار اس بارے میں خاموش ہیں. خود ان کا ذکر ہی بہت کم تذکروں میں آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے نے بہت جلد ان کے آثار علمیہ کو پردۂ گمنامی میں چھپا دیا۔ ان چند اشعار کے علاوہ جو والہ نے بحیثیت ایک فارسی شاعر کے ان کے ترجمہ میں شامل کئے ہیں ان کے فارسی اشعار بھی نہیں ملتے۔ بکٹ کہانی میں ان کے کچھ فارسی اشعار ضرور شامل ہیں۔ اُن کی ہندی تخلیقات میں اب صرف بکٹ کہانی باقی ہے، اور سچ پوچھیئے تو اُسے ہی عوام کی دلچسپیوں نے زندہ رکھا جو اس کے شائق تھے۔ وہ اُسے گاتے اور گنگناتے تھے۔

افضل کی یہ کہانی غالباً ایک زمانے تک سینہ بسینہ ہی چلتی رہی ہے، اس لئے کہ اس کے دریافت شدہ نسخوں میں سب سے قدیم قلمی نسخہ بھی افضل کی وفات سے تقریباً سو برس کے بعد قلمبند کیا گیا ہے۔[۱]

اس کے قلمی نسخوں کی تبئیض و تحریر کے مقامات بھی اسکی شہرت و مقبولیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"اس کے ایک سے زائد نسخے موجود ہیں اور یہ تمام شمال تا دکن مختلف علاقوں اور کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں۔"[۲]

جن اردو تذکروں میں افضل کا ترجمہ موجود ہے وہ افضل کے عشق سے واقف ہیں لیکن اس کی حقیقت سے نہیں

بہر نوع افضل کی بکٹ کہانی کے جذباتی اثر و نفوذ اور عوام کے درمیان اس کی شہرت و مقبولیت کا ذکر ان تذکروں میں موحود ہے مگر کچھ اس طرح:

"اگر چہ ربط کلامش چنداں مضبوط و مربوط نیست لیکن از آنجاکہ قبول بی سبب ورد بی غضب ۔ خاصۂ جناب ازلی ست تصنیفاتش بمرتبۂ مؤثر دلہاست کہ ازحیز تحریر و تقریر متجاوز ست ۔ و مثنوی بکٹ کہانی از وی بر صفحۂ روزگار یادگار است"[۳]

میر حسن نے اس ضمن میں ان طبقات انام کا بھی ذکر کیا ہے جو اس سے دلچسپی لیتے اور اسے پسند کرتے تھے:

۱۔ ملاحظہ ہو "بکٹ کہانی کے نسخے" بکٹ کہانی، ص ۲۰۲ ۲۔ ایضاً، ص ۲۰۸

۳۔ مخزن نکات، ص ۳

«اکثر کھتریاں و گائنان مشتاق او می باشند نصفی فارسی و نصفی ہندی
لیکن قبولیت ورد الٰہی است، بر دلہا اثر می‌کند.» [۱]

ان ترجموں کے فحوائے عبارت سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ تذکرہ نگار افضل کے کلام کے اثر و نفوذ اور تاثیر و تأثر سے واقف ہونے کے باوصف ان کے مرتبۂ شاعری کے کیوں قائل نہیں، اور اس سے اس ذہنی رویہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے جس کے زیر اثر بہت کم تذکرہ نگاروں نے افضل کے ذکر کو اپنے تذکرہ میں جگہ دی ہے۔

اب وہ ریختہ کے قدیم ادبی مزاج اور لسانی امتزاج کو غیرگنگاجمنی اور نامربوط خیال کرتے ہیں۔ یہ نصفی ہندی اور نصفی فارسی انہیں «ان مل بےجوڑ» معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں آگے چل‌کر قائم نے لکھا ہے:

«باید دانست کہ چون فن ریختہ در آن وقت از محل اعتبار ساقط بود
بنا٘ علیہ ہیچ کس بر توغل آن اقدام نمی‌نمود.» [۲]

اس سے اس لسانی معیار اور شاعرانہ «مرزا منشی» پر روشنی پڑتی ہے جس کا تتبع قائم اور ان کے زمانہ کے دوسرے تذکرہ نگار اور شعرا بڑے ادعا کے ساتھ کرنا چاہتے تھے اور جس کی وجہ سے وہ قدیم ریختے کے نمونوں کو چنداں درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے۔

لیکن آج ہم افضل کی شاعری اور زبان شعر کا مطالعہ قائم اور ان کے معاصرین کے نقطۂ نظر سے نہیں کرسکتے۔

افضل کا ریختہ شمالی ہند میں اردو زبان اور اردو شاعری کی راہِ ارتقا کا سنگ میل ہے۔ شعری محاسن کے علاوہ افضل کی بکٹ کہانی غیرمعمولی طور پر لسانی اہمیت کی حامل ہے۔ اس اعتبار سے افضل کی وطنیت اور ان کی شاعری کے لسانی حلقہ کا تعین اہل زبان و ادب کی خصوصی دلچسپی کا مستحق ہے۔

والہ نے افضل کو پانی‌پتی کہا ہے۔ صاحب معدن الجواہر نے بھی جو دراصل افضل کا خوشہ‌چیں ہے انہیں پانی‌پتی قرار دیا ہے۔ تیسرا تذکرہ جس میں یہ روایت ملتی ہے «نتائج الافکار» ہے۔ یہ بھی بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں سرتاسر والہ کی فراہم‌کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ [۳]

۱۔ تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۴　　۲۔ مخزن نکات ص ۲　　۳۔ بکٹ‌کہانی ص ۴۹

ظاہر ہے کہ ان میں سب سے اہم اور اقدم روایت والہ کی ہے جس نے افضل کا ترجمہ بحیثیت ایک فارسی شاعر کے نسبتہً زیادہ تفصیل سے دیا ہے اور اس میں ان کی حیات معاشقہ کی پوری روداد پیش کی ہے۔ لیکن افضل کی وطنیت کے بارے میں والہ کی فراہم‌کردہ اطلاع سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ قائم نے اپنے تذکرہ مخزن نکات کی پہلی روایت (مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ‌آباد ۱۹۲۹ء) میں انہیں «از سکان دیار مشرق» لکھا ہے۔ «دیار مشرق» سے کون سی بستی یا شہر مراد ہے، اس کا حال نہیں کھلتا۔ یہ بیان اس اعتبار سے بھی تعجب‌انگیز ہے کہ صاحب گلزار ابراہیم اور خود میر حسن نے جو اپنے تذکرہ کی تالیف کے وقت دیار مشرق میں قیام‌پذیر تھے اُس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ «دیار مشرق» کے سلسلہ میں بکٹ‌کہانی کے ایک ایسے نسخہ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جو رضا لائبریری، رامپور کی ملکیت ہے اس میں افضل کے نام کے ساتھ «کالپی» لکھا ہوا ہے۔ «کالپی» دیارمشرق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ترقیمہ یا تتمہ موجود نہیں جس سے اس کی قدامت کا اندازہ کیا جاسکے۔ لیکن از روے قیاس یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایسی ہی کوئی روایت قائم کے سامنے رہی ہوگی جو انہوں نے افضل کو «از سکان دیار مشرق» سمجھا۔

اس تذکرہ کی دوسری روایت مخطوطہ لندن میں جسے ڈاکٹر اقتدا حسن نے مرتب کیا ہے اور جو مجلس ترقی ادب، لاہور کی جانب سے سنہ ۱۹۶۶ میں شایع ہوا ہے، یہ عبارت اس طرح موجود ہے:

«محمد افضل مردیست از سکان قصبہ جھنجھانہ»۔[1]

اِس دوسری روایت کے متعلق اس کے فاضل مرتب نے لکھا ہے:

«جگہ جگہ نہایت مفید اضافے کئے گئے ہیں جو مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں . . . . دونوں نسخے کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ طبع شدہ نسخہ نقش اول ہے اور مخطوطۂ لندن نقش ثانی جس میں ضروری ترمیم اور اضافے بھی شامل ہیں۔»

افضل کے وطن سے متعلق یہ وضاحت ایسی ہی ضروری ترمیمات اور اضافوں میں آتی ہے اور ایسی صورت میں یہ دوسری روایت اس کی پہلی روایت کے مقابلہ میں زیادہ معتبر ہوجاتی ہے۔

---

۱ مخزن نکات [مجلس] ص ۸

قائم نے افضل کا ذکر جس انداز سے اپنے تذکرہ میں کیا ہے وہ والہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے افضل کے وطن سے متعلق اس کی روایت بھی مستقل نوعیت رکھتی ہے۔ ریاض الشعرا کا زمانۂ تکمیل سنہ ۱۱۶۳ ہے جیسا کہ اس کے قطعۂ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے:

این تذکرہ چون طرب افزای دل شد تاریخش دل از خرد شامل شد
گفت از ریاض الشعرا رفت خزان در وی چون بہار سر زدہ شامل شد

قائم کے تذکرہ کا سال تکمیل ۱۱۶۸ھ ہے۔ اس اعتبار سے والہ کے تذکرہ کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ لیکن صرف اس تقدم زمانی کی وجہ سے قائم کی روایت کو جو ترمیم و اضافہ کی صورت میں سامنے آئی ہے غیر اہم نہیں قرار دیا جا سکتا۔

قائم کی یہ روایت صاحب مجمع الانتخاب اور اس کے بعد یادگار شعرا کے مرتب نے بھی دہرائی ہے۔

«محمد افضل مردیست از قدما، سکان قصبۂ جھنجھانہ۔»[1]

«افضل، محمد افضل ساکن جھنجھانہ جو میرٹھ سے دور نہیں ہے۔»[2]

یہ دونوں تذکرے (مخزن نکات بروایت دوم اور مجمع الانتخاب) چونکہ بکٹ کہانی کے فاضل مرتب کے سامنے نہیں تھے اس لئے موصوف نے یادگار شعرا کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

«امیرنگر کے افضل کے سلسلہ میں یہ نئی معلومات معلوم نہیں کہاں سے فراہم کی ہے کہ وہ جھنجھانہ کا ساکن ہے جو میرٹھ سے دور نہیں۔»

پروفیسر شیرانی نے امیرنگر کے بعض تسامحات کی نشان دہی اور والہ کے تذکرۂ ریاض الشعرا سے استفادہ کے باوجود افضل کو جھنجھانہ ہی کا باشندہ قرار دیا ہے:

«میرٹھ کے قریب جھنجھانہ یا جھنجھنہ ایک پرانی بستی ہے۔ مغلوں کے عہد میں ایک مردم خیز قصبہ تھا اور بعض مشہور بزرگ اسی قصبہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ شیخ صوفی دانشمند جنھوں نے فنون ہندیہ سیکھ کر ان کے تراجم اکبر کے لئے فارسی زبان میں لکھے۔ اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ سطور ذیل کے موضوع محمد افضل بھی اسی خطہ سے تعلق رکھتے ہیں۔»[3]

---

۱ مجمع الانتخاب شاہ کمال ورق ۲۴ الف
۲ یادگار شعرا ص ۲۸
۳ اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ ص ۱۴

بکٹ کہانی کی اپنی داخلی (لسانی) شہادت بھی اس کے حق میں جاتی ہے کہ وہ پانی‌پت کے نہیں، جھنجھانہ (ضلع مظفر نگر) کے لسانی منطقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ خود ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ «افضل کے بارہ ماسہ کی زبان کا تعلق پانی‌پت سے نہیں ہے۔» چنانچہ افضل کی زبان پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

«افضل کا تعلق والہ کی شہادت کے مطابق پانی‌پت سے تھا جو ہریانی کے علاقہ میں واقع ہے۔ لیکن افضل کی زبان ہریانی کے اس قدر بھی لسانی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔»[1]

اس اختلاف احوال کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف نے لکھا ہے:

اس کا مطلب صاف ہے۔ کھڑی بولی عہد اکبری میں برج‌بھاشا کے زیر اثر ایک ایسی لسانی کروٹ لے چکی تھی جس نے اسے جدید بنا دیا تھا۔ افضل کی بکٹ کہانی اس جدید اردو کا پہلا ادبی و لسانی نقش ہے۔ مجموعی طور پر افضل کی زبان سور داس کی برج بھاشا، اور کبیرداس کی سدھکڑی ملی‌جلی زبان کے برعکس کھڑی بولی کی وہ ترقی‌یافتہ شکل ہے جو ایک طرف اپ بھرنشی لسانی اثرات کھو چکی تھی اور دوسری طرف جمنا پار کرکے موجودہ اتر پردیش دوآبہ کے بالائی حصے میں قدم رکھ چکی تھی۔»[2]

چونکہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذہن میں یہ بات بالکل نہیں کہ افضل کے وطن کا تعلق ہریانی کے علاوہ کھڑی کے علاقہ سے بھی ہو سکتا ہے اس لئے وہ افضل کی زبان پر غیر ہریانوی اثرات کی توجیہ دوسرے انداز میں کرتے ہیں:

(۱) «افضل کو متھرا کے ہندو ماحول کا بھر پور تجربہ تھا اس لیے اس کے بعض اثرات کا آجانا ناگزیر تھا۔

(۲) «افضل کی زبان پر بارہ ماسہ کے اسلوب اور اس سے مختص زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افضل کے علاقہ کی ہریانوی بولی بارہ‌ماسہ کی زبان پر اثر انداز نہیں ہوئی۔»[3]

یہ دونوں باتیں بھی اپنے طور پر وزن رکھتی ہیں۔ لیکن افضل کی زبان پر برج

---

۱ بکٹ کہانی ص ۳۷ ۲ ایضاً ۳ بکٹ کہانی۔ ص ۹۸۔ ۳۷

کے اثرات صرف ان کے قیام متھرا کے مرہون منت نہیں، جبکہ اس وقت اُن کی عمر بھی بہت کافی ہو چکی تھی اور خود والہ کی شہادت کے مطابق وہ اس سے پہلے ہندی اور فارسی شعر خـــوب کہتے تھے۔ اس وقت اُن کی زبان شعر کیا رہی ہو گی اُسے ہم خود ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے لسانی مطالعہ کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں:

«لسانیاتی اعتبار سے افضل کی زبان کو (دکھنی کے مقابلہ میں) جدید اردو سے قریب تر ہونا بھی چاہیے۔ دکھنی اردو تیرھویں اور چودھویں صدی کی «زبان دہلوی» ہے جو ایک طرف اپ بھرنشی لسانی روایت سے لدی پھندی ہے اور دوسری جانب جس کی اساس کھڑی بولی کے مقابلہ میں جمنا پار کی ہریانی اور میواتی بولیوں پر قائم ہے۔ دہلی اور اس کے نواح میں زبان کا یہ کینڈا پندرھویں صدی کے وسط تک رہا۔»[1]

اس کے بعد زبان نے جو نیا ڈول اور کینڈا اختیار کیا اور جس کا اثر بالخصوص ادبی زبان پر پڑا اس کی ایک نمایاں مثال حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی کا کلام ہو سکتا ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے محمود شیرانی نے لکھا ہے:

«اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ دوآبہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی یہ زبان نہ تھی، بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔ مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ، ضلع سہارن پور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی، متوفی سنہ ۹۵۴ھ، باوجود کہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں آج اردو مادری زبان ہے لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج سے مماثل ہے۔ اعلیٰ هـــذا مخدوم بہاءالدین برناوی میرٹھ، ضلع کے ہیں لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اردو نے ان علاقوں سے رفتہ رفتہ برج کو خارج کر دیا۔»[2]

رفتہ رفتہ اس علاقہ سے کھڑی بولی یا اردو کے ذریعہ برج کے اثرات کم ہوئے۔ اس کا اندازہ افضل کی زبان اور طرز بیان سے ہوتا ہے جس میں کھڑی کا اثر برج پر غالب آتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس علاقہ کی ادبی زبان اور خود بولی ٹھولی پر برج کے اثرات اس کے کافی بعد تک باقی رہے اس کا اندازہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کی بکٹ کہانی سے ہوتا ہے جس کی لسانی خصوصیات تقریباً وہی

۱۔ بکٹ کہانی، ص ۲۹۶　　۲ پنجاب میں اردو، ص ب

ہیں ۔ جو افضل کی بکٹ کہانی کی ہیں ۔ کاندھلہ اور جھنجھانہ ایک ہی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں خود مفتی صاحب کا آبائی وطن جھنجھانہ ہی تھا ۔

افضل کی بکٹ کہانی میں ہندی لفظیات کا جو سلسلہ ملتا ہے وہ اس علاقہ کی بولی‌ٹھولی میں ہنوز رائج ہے ۔ ایسے الفاظ بہت کم ہیں جو اس علاقہ کی بول چال کی زبان سے اب خارج ہوگئے ہیں ۔ افعال کی بھی یہی صورت ہے ۔ جو افعال براہ راست برج کے زیر اثر ہیں اُن کی صدائے بازگشت لوک گیتوں اور لوک بھاشا میں اب بھی سنی جاسکتی ہے ۔

ضمیروں میں تیں ، توں ، ہوں ، مُیہہ ، تہاءا ، مھارا ، تم ، تَجے ، تَجے کا استعمال اب بھی ہوتا ہے ۔ حروف ربط میں سیتی ، تے ، تھے بمعنی سے ، موں ، منے ، پو اب بھی اس لسانی حلقہ کی بول چال کا جزو ہیں ۔

پانی‌پت اور جھنجھانہ کا فاصلہ یوں تو کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن دونوں کے درمیان دریائے جمنا حائل ہے ۔ یہ « خط فاصل » دونوں علاقوں کی لسانی خصوصیات کو ایک دوسرے سے الگ کردیتا ہے ۔ پانی‌پت کے آس‌پاس کے دیہات کی زبان آج بھی ہانسی اور حصار کے زیر اثر نظر آتی ہے ۔ بہ نسبت جھنجھانہ کے جو قدیم الایام میں اسی لسانی حلقہ کا جزو تھا جو برج کے زیر اثر آچکا تھا ۔

جہاں تک توجیہ کی دوسری صورت کا سوال ہے یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہوسکتا کہ افضل کے زمانے تک بارہ ماسہ کی زبان اور اسلوب اس بولی‌ٹھولی کے ساتھ مخصوص ہو چکے تھے جو افضل نے اختیار کی تھی ۔ بارہ ماسہ کی طویل روایت اس کی تائید نہیں کرتی ۔ خود « پدماوت » میں جو بارہ ماسہ ملتا ہے اس کی زبان اودھی ہے ۔

ان لسانی شواہد کے پیش نظر یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ افضل جھنجھانہ ، ضلع مظفرنگر (مغربی یوپی) کے باشندہ تھے ، لیکن بسلسلۂ ملازمت ان کا قیام پانی‌پت میں تھا جس کی وجہ سے والہ نے ان کو « پانی‌پتی » لکھا ہے ۔

جھنجھانہ کے معمر لوگوں کی زبانی یہ روایت اب بھی سنی جا سکتی ہے کہ افضل جنھیں وہ بھی شاہ افضل کہتے ہیں ، جھنجھانہ کے تھے اور پانی پت میں بسلسلۂ

ملازمت قیام پذیر رہے تھے۔ انہیں ایک برہمن کی لڑکی سے عشق ہو گیا تھا جو بالآخر مسلمان ہو گئی تھی اور جس سے انہوں نے شادی کرلی تھی۔

رجوع

بکٹ کہانی، مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں (مشمولہ قدیم اردو) طبع ۱۹۶۵

مخزن نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، طبع ۱۹۲۹

تذکرۂ گلزار ابراہیم، مرتبۂ ڈاکٹر محی الدین قادری زادہ، طبع علی گڑھ ۱۹۳۲

تذکرۂ شعرائے اردو، مرتبۂ مولوی حبیب الرحمن خاں شیروانی، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، طبع جدید ۱۹۴۰

تذکرۂ مخزن نکات، مرتبۂ ڈاکٹر اقتدا حسن، مطبوعۂ مجلس ترقی ادب، لاہور طبع ۱۹۶۶

ریاض الشعرا، قلمی، مخزن آصفیہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد دکن

A Catalogue of Hindustani manuscripts in the Library of India office, London, By B. Haedt

*حسینی شاہد

گلزار چشت

کتب خانۂ نواب سالار جنگ کا مخطوطہ نمبر ۱۳۱ (تصوف) شاہ معظم کے دو رسالوں شجرۃ الانقیاء اور گلزار چشت پر مشتمل ہے، اس طرح کہ پہلے شجرۃ الانقیاء ہے اور اس کے خاتمے پر دوسرے صفحے سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر رسالۂ گلزار چشت شروع کیا گیا ہے۔ دونوں رسالوں کی لوح پر ان کے نام درج نہیں ہیں۔ لیکن شاہ معظم نے شجرۃ الانقیاء کے ابتدائی حصے میں اور گلزار چشت کے آخری اشعار میں رسالوں کے نام دے دئیے ہیں:

ہوا جو امر خاتم الانبیا　　اسے نام رکھ شجرۃ الاتقیا
مبارک رکھیا نام گلزارِ چشت　　پڑھے یا سنے سو وہ پاوے بہشت

شاہ معظم نے گلزار چشت کے اشعار کی تعداد چار سو بتائی ہے:

یو سب چار سو دیکھ ابیات ہے　　شہد سو مٹھی تر ہریک بات ہے

لیکن زیر نظر نسخے میں صرف ۳۷۰ شعر ہیں۔ یہ نسخہ ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

شجرۃ الاتقیاء اور گلزار چشت دونوں مثنویوں کی نوعیت منظوم تذکروں کی ہے۔ اول الذکر مثنوی میں حضرت خواجہ بندہ نواز سے علی پیر تک بندہ نوازی سلسلے کی بیجاپوری شاخ کے تمام بزرگوں کا ذکر ہے اور مؤخر الذکر میں حضرت خواجہ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب اور ان کے خلفاء تک تمام سربرآوردہ شیوخ سلسلے کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ ان دونوں تذکروں کے مطالعے کے بعد جو خیال معاً ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ گلزار چشت کو پہلے اور شجرۃ الاتقیاء کو بعد میں نقل ہونا چاہئے تھا، بلکہ شجرۃ الاتقیاء کو ایک علٰحدہ رسالے کی صورت دینے کی بجائے گلزار چشت ہی کے سلسلے میں لکھا جانا چاہئے تھا۔ لیکن دونوں رسالوں

*ڈاکٹر حسینی شاہد ام۔ لے: پی ایچ ڈی؛ پرنسپل اردو آرٹس کالج حیدرآباد: دکن سینٹ عثمانیہ یونیورسٹی دکن کمیٹی الشعرا پردیش ساہتیہ اکادمی وغیرہ۔

کی علیحدہ اور مستقل حیثیت صاف بتاتی ہے کہ یہ تقدیم و تاخیر کاتب کی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں شاہ معظم کے پیش نظر صرف خانوادۂ میراں جی شمس العشاق کا تذکرہ قلمبند کرنا تھا اس لئے انہوں نے اس خانوادے کے سرچشمۂ فیضان حضرت بندہ نواز گیسو دراز سے شجرۃ الاتقیاء کا آغاز کیا اور حضرت جمال الدین مغربی، حضرت کمال الدین بیابانی، حضرت شمس العشاق، حضرت شاہ برہان الدین جانم، حضرت امین الدین علی اعلیٰ، حضرت بابا شاہ حسینی اور حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کو بیان کرکے نظم کو ختم کردیا۔ غالباً اس نظم کی تکمیل کے بعد انہیں احساس ہوا کہ اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کو بھی جوڑنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے گلزار چشت لکھی اور اس میں حضرت خواجۂ اجمیری سے حضرت برہان الدین غریب تک اس سلسلے کے بزرگوں کا حال قلمبند کیا۔ زمانۂ تصنیف کے اسی تقدم و تأخر کی وجہ سے زیر نظر مخطوطے میں پہلے شجرۃ الاتقیاء ہے اور اس کے بعد گلزار چشت نقل کی گئی ہے۔ اس قیاس کی تائید حسب ذیل امور سے بھی ہوتی ہے:

۱) شجرۃ الاتقیاء میں حمد، نعت، واقعۂ معراج کا ذکر اور صحابہ کی منقبت جس تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے وہ گلزار چشت میں نہیں ملتی، بلکہ ان موضوعات پر صرف چند شعر ہیں۔

۲) شجرۃ الاتقیاء میں بزرگان سلسلہ کے حالات و کمالات جس تفصیل، خلوص اور والہانہ پن کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں گلزار چشت میں نہ تو وہ تفصیل ہے اور نہ وہ جوش بیان۔

۳) شجرۃ الاتقیاء میں سبب تصنیف کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ یہ رسالہ رسول اکرم کے حکم کی تعمیل میں لکھ رہے ہیں۔ گلزار چشت میں ایسا کوئی سبب نہیں بیان کیا ہے۔ البتہ نظم کے آخری حصے میں اپنے پیر حضرت امین کی مدح کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "ان ہی کی برکت سے یہ تمام رموز مجھ پر آشکار ہوئے ہیں اور انہیں کے امر سے میں نے یہ اسرار و رموز بیان کئے ہیں":

ہوا راز مکشوف سب آشکار تسلا ہوا دل نے پایا قرار
امر پیر کا تھا سو بولا ہوں میں چھپے راز تب لاکے کھولا ہوں میں

یو سب چار سو دیکھ ابیات ہے　　شہد سوں مٹھی‌تر ہریک بات ہے
مبارک رکھا نام گلزار چشت　　پڑے یا سنے سو وہ پاوے بہشت

ظاہر ہے کہ سلوک و معرفت کے اسرار کی تشریح و تفہیم کا حکم کوئی خصوصی حکم نہیں ہے بلکہ ہر شیخ یہی فریضہ انجام دیتا ہے اور اپنے ہر مرید کو اس فریضے کی انجام‌دہی کی تاکید و تلقین کرتا ہے۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ متذکرۂ صدر اشعار سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ رسالہ گلزار چشت شاہ معظم نے پیر کے حکم پر لکھا ہے۔

اس تشریح سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ شاہ معظم نے خود ان کے بیان کے مطابق، رسول اکرم صلعم کے ایماء پر شجرۃ الاتقیاء لکھی۔ رسالے کا یہ نام بھی حضور اکرم صلعم کا دیا ہوا ہے۔ اس رسالے کی تصنیف کے بعد اوپر کے سلسلے تکمیل کی غرض سے انھوں نے گلزار چشت قلمبند کی۔ شجرۃ الاتقیاء میں حضرت علی پیر کے حالات و کمالات کا تذکرہ بھی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بارھویں صدی کے تیسرے دہے میں لکھا گیا۔ گلزار چشت چونکہ شجرۃ الاتقیاء کے بعد لکھی گئی ہے اس لئے اس کا زمانۂ تصنیف بھی وہی ہوگا۔

گلزار چشت کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

الٰہی تو عالم، علام الغیوب　　تو مومن، مہیمن، کشاف القلوب
سدا حی و قیوم، قادر ہے تو　　ہمہ وقت حاضر سو ناظر ہے تو
تو دانا تو بینا ہے صاحب کریم　　توں خالق تو رازق رؤف الرحیم
تو حاکم ہے حکمت میں روشن‌ضمیر　　ہریک ایک حکمت ترا بےنظیر
فلک کا منڈپ خوب چھایا ہے تو　　سورج چاند قندیل لایا ہے تو
سورج (سوں) دیکھو روز روشن کیا　　این سوں ستاروں کو گلشن کیا
دیا دھرت کو دھیر پانی اوپر　　دیکھو عام سفرہ بچھا تس اوپر

حمد کے بعد شاہ معظم نے مرتبہ گنج مخفی سے ذات احد کے نزول کو بیان کرتے ہوئے حقیقت محمدی کی اس طرح وضاحت کی ہے:

احد تھا سو برحق وہ احمد ہوا　　وہی دیکھ احمد محمد ہوا
ازل سوں اول حق نبی کو کیا　　دیکھو تب نبی کو خلافت دیا
اپے آپنا ذوق لینے بدل　　اپیں خود (وہ) آیا ہے باہر نکل

اس کے بعد نعت میں چند شعر کہے ہیں اور اسی سلسلے میں واقعہ
کو بھی بیان کیا ہے۔ خلفاء کی منقبت صرف ایک ایک شعر میں کی ہے
الاتقیاء میں چاروں صحابہ کی منقبت تفصیل سے کی ہے۔
حضرت علی کی مدح صحابہ کے ساتھ بھی کی ہے اور علاحدہ بھی۔ دوسری دفعہ
کی ہے وہ نہ صرف تفصیلی ہے بلکہ یہاں شاہ معظم نے بڑا زور قلم صرف
اس کے برخلاف گلزار چشت میں دوسرے صحابہ کے ساتھ صرف ایک
اکتفا کیا ہے:

جو تھے . . . علی شاہ دلدل سوار کہتے ہیں جسے صاحب ذوالفقار

شجرۃ الاتقیاء میں معظم نے لکھا ہے کہ خدا نے نبی کو اپنا نائب
نبی نے علی کو اور علی نے ہر ملک میں اولیاء کو اپنا نائب مقرر کیا۔
زیر نظر رسالے میں بھی دہرائی ہے۔ چنانچہ حضرت علی کی مدح کے
اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ

نبی پر کرم کر نبوت دیا علی کے حوالے ولایت کیا
علی کے ہیں نائب ہر اک شہر میں ہر اک ملک میں ہوں ہر اک دہر میں
ہر ایک (ملک) میں ایک اصحاب ہیں ہر یک دہر میں قطب اقطاب ہیں
علی نے ملک سب ولیاں کو دئیے ہر یک ملک کو ایک والی کئے

غرض معظم نے حمد، نعت، منقبت اور تمہید سب کچھ ۳۷ اشعار
کر دیا ہے اور اس کے بعد حضرت خوجہ معین‌الدین چشتیؒ کا ذکر شرو

دئیے ملک خواجہ کو یہ ہند کا جتا ہند کا اور جتا سند
کہتے تو ہیں ہندالولی شاہ کو عطا ہے لقب شہ کو درگاہ سو
دیا تخت حق شہ کو اجمیر کا ہے جس کے نیچے ملک سمیر

معظم کہتے ہیں کہ اجمیر پر پرتھوی راج کی حکومت تھی۔ اس
اجے پال بہت بڑا ساحر تھا۔ اجے پال نے حضرت خواجہ پر سحر و
کئی وار کیے۔ لیکن اس کا ہر وار خالی گیا۔ اس ذلت اور رسوائی کی
وہ چاہتا تھا کہ اڑکر سمندر کے پار نکل جائے۔ لیکن حضرت کی جوتیو
میں پرواز کی اور اس کو گھیر کر لے آئیں۔ خواجہ اجمیری کی اس کر
بیان کے بعد معظم نے صرف دو شعر مدح کے کہے ہیں:

مکمل ولی آج خواجہ ہے او دنیا دیں کا دیکھ راجا ہے او
پرتش کر بن جن و انسان مل دو عالم دیکھو شہ سوں باندھے ہیں دل

اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیاری کی مدح لکھی ہے:

سچا قطب یہ قطب اقطاب ہے دنیا دین میں سچ یو مہتاب ہے
قطب الدیں تو نام ہے شاہ کا اجالا دے مکھ اوپر ماہ کا
ولی شہر میں قطب اظہر ہوا ہندوستاں تب سوں منور ہوا
عجب نور تھا مکھ اوپر ذات کا ویسے چاندجوں چودھویں رات کا
دیکھو شہ کو خوجہ (نے) خواجہ کئے دو عالم میں دکھلا اوجالا کئے
مرید دیکھ حق جس کو ایسا دیا کہتے زاہداں میں اسے انبیا

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے بارے میں معظم کہتے ہیں کہ انہوں نے طلب حق میں مختلف دیار و امصار چھان ڈالے لیکن انہیں اصلی نعمت خواجہ قطب الدین کی خدمت میں حاصل ہوئی۔ حضرت فرید نے بھوک پیاس کی پروا کئے بغیر تلاش حق میں جو دشت نوردی کی تھی اس کا اجر انہیں یہ ملا کہ مٹی ان کے لئے شکر بن گئی۔

کئے سیر سب بر اور بحر کا ہر یک ملک کا اور ہر یک شہر کا
نہ دیکھے خدا کو بیابان میں یہاں آکے دیکھے ہیں اک آن میں
کتک دیس لگ شیخ جنگل پھرے مطالب یہاں آکے حاصل کرے
بھوکے رہ کے جنگل پھرے سواجر شکر کر لئے شیخ مالی بھیتر

معظم کا بیان ہے کہ شیخ فرید کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ان کی والدہ ہیں۔ انہوں نے اپنے لڑکے کی تربیت کچھ اس ڈھنگ سے کی یہ لڑکا سبھوں کے لئے شیخ ہو گیا۔ شیخ فرید نے چاروں راستے طے کر لئے تھے تب وہ داخل حق ہوئے۔

اول والدہ شہ راشد ہوئے دیکھو شیخ تب سب کے مرشد ہوئے
دیکھو چار رہ پر سو جب آئے ہیں وصل حق سوں تب شیخ نے پائے ہیں

معظم حضرت نظام الدین اولیاء کی مدح کرتے ہوئے دو باتوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ایک ان کا لنگر خانہ جس میں ہر روز ہزاروں آدمی کھانا کھاتے تھے دوسرے ان کی محفل سماع۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی بارگاہ میں ہزاروں قوال اور سازندے جمع تھے اور حضرت صبح و شام ساز و سرود میں مستغرق رہتے تھے۔ معظم کا یہ بیان کچھ تو مبالغہ آمیز بیانات اور روایات پر بغیر کسی تحقیق کے اعتبار

کر لینے کا نتیجہ ہے اور کچھ اہل طریقت کے اس غلط تصور پر مبنی ہے
و حال، سوز و مستی اور جذب و بے خودی پابندیء شریعت سے اونچی حا
اس لئے کہ یہ بہو و سکر معرفت الٰہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کو معرفہ
ہو اس کے لئے شریعت ایک ادنیٰ چیز ہے۔ مغلوب الحال ہونا انسان کو
اور معذوری ہے جس سے تکلیف شرعی ساقط ہوجاتی ہے۔ لیکن اس سے مغذ
حالت شریعت سے بہتر کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور پھر صوفیہ پر غلبۂ حا
جنون دوری کا حکم رکھتا ہے۔ جس کا جنون دوری جنون قائم بن جاتا ہ
مجذوب کہتے ہیں، اور مجذوب کا حال اپنی جگہ جیسا کچھ ہو وہ مناسب
ہدایت کے لائق نہیں ہوتا۔ حضرت نظام الدین اولیاء جیسے صاحب رشد، مر
اور ہادیء دین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ رات دن ساز و نغمہ کے ذ
مست و بے خود رہتے تھے نری غلط بیانی ہی نہیں بلکہ ان کے منصب ہدایت
ہے۔ اس کے آگے معظم کہتے ہیں کہ نظام الدین اولیاء مجالس سماع میں
کو شراب معرفت پلاتے تھے۔ جس کسی کو یہ شراب میسر آتی وہ کامل ا
ہو جاتا۔

یو صفرا شہنشاہ کا علم تھا　　فراواں کتک جنس کا طمطام ت
تصرف انھا شاہ کا بے شمار　　کلاونت تھے شاہ (کتے) کتی ہزا
بجنتر کتے شاہ کے قوال تھے　　وہ قوال خود مست احوال تھے
کبھی گائیں جب وہ حسینی مقام　　مجالس کوں تب حال آوے تم
کبھی شوق میں آبجاویں رباب　　نہ رہتا انھا کچھ بھی عالم میں تاد
کبھی مست ہو چنگ بازی کریں　　او عشاق کی کارسازی کرے
اکابر مجالس میں راتے رہیں　　سدا مے محبت سو ماتے رہ
انھا شاہ کا ہاتھ جم کا وہ جام　　پیا سو ہوا ہے وہ تحصیل ت
پیا سو دیکھو توچ فاضل ہوا　　وہ کامل ہوا اور واصل ہ

حضرت نظام الدین اولیاء کی مدح کے بعد کہتے ہیں کہ ایک رو
کو حکم ہوا کہ خواجہ منتخب الدین کو ملک دکن پر مقرر کریں۔ ۔
تعمیل حکم میں خواجہ منتخب الدین کو کئی اولیاء اور اتقیاء کے ساتھ
طرف روانہ کیا۔ خواجہ منتخب الدین کئی منازل طے کرنے کے بعد بھوز

مقام پر پہنچے تو فجر کا وقت تھا۔ انہوں نے اذان دی۔ اذان کی آواز کے کان میں پڑتے ہی اس قطعے کے بسنے والے تمام کافر پتھر ہوگئے۔ معظم کہتے ہیں کہ جس کسی کو ہمارے اس بیان پر شبہ ہو وہ یلوری جاکر ان پتھروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ہمارے بیان کی تصدیق کرلے۔

غارہائے ایلورا کے بارے میں دکن میں یہ روایت آج بھی مشہور ہے کہ یہ اُس آبادی کا ایک حصہ ہے جو حضرت منتخب الدین کی کرامت سے پتھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ بزرگان دین کے تذکرے اس قسم کی من گھڑت روایتوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس طرح کی بے سروپا روایتوں پر معظم کے اس درجہ یقین کو ان کے حسنِ ظن اور جوشِ عقیدت کے سو کیا کہا جاسکتا ہے:[11]

کتک ملک طے کر کے یاں آئے جب امر پیر کا سب بجا لائے تب
ولایت کی تشریف سب پائے تھے اسی کیچ قوت سو یاں آئے تھے
فجر کا دئیے بانگ شہ نے پکار نبی کے کئیے دین کو آشکار
ہوا بانگ کا ملک میں سب نشر ندا سن کے کافر ہوئے سب پھتر
یلوری میں جا کوئی نظارا کریں ہمارا سخن ووچ باور دھریں

معظم ایک اور روایت یہ بیان کرتے ہیں کہ بارگاہ ایزدی سے منتخب الدین کے لئے روزانہ زرین اور جواہر نگار خلعتوں کے طبق اترا کرتے تھے۔ حضرت یہ طبق پہلے اپنے سر پر رکھتے پھر اس طبق میں سے لباس فاخرہ نکال کر زیب تن کرتے اور پھر فقراء میں تقسیم کردیتے۔ اسی بخشش کی وجہ سے ان کا نام زر زری بخش مشہور ہوگیا تھا۔[12]

سدا حق سوں خلعت اترتا انھا سدا پیار حق ان پہ دھرتا انھا
اُتر آئے ہر روز درگاہ سوں سدا نو بہ نو خلعتاں شاہ سوں
اُتر آئے کسوت سدا زر زری امولک رتن بے بدل جوہری
طبق لے کے او شاہ سر پر دھریں اپیں پین کر شاہ بخشش کریں

اسی سلسلہ میں حضرت کی یہ کرامت بھی بیان کی ہے کہ ایک مقامی راجا کی لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کو حضرت کے دیدار کا شوق پیدا ہوا اور وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر سے چل کھڑی ہوئی۔ حضرت کی بارگاہ میں پہنچی تو ان کے جاہ و جلال کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ قریب ہی ایک خشک

باولی تھی۔ راجکماری کے دل میں وسوسہ آیا کہ اگر حضرت صاحب کرا
تو اس اندھی باولی کو پانی سے بھر دیں۔ راجکماری کے اس خطرے کا
کو القا ہوگیا اور انہوں نے باولی پر نظر ڈالی۔ بس پھر کیا تھا۔ باولی سے
سونا ابلنے لگا۔[۱۳] معظم کہتے ہیں کہ آج بھی جو لوگ حضرت کے ع
جاتے ہیں اس باولی کو ضرور دیکھتے ہیں جو «سنا بائیں» (سونے کی باولی) کہ

کتے بائیں اول سو خالی اتھی — نہ تھا اوس میں پانی کتے اک ر
رکھی دل میں یو بائیں پانی بھرے — کہوں گی بڑے پیر ہیں یو کھر
انہا کشف شاہ کو علام الغیوب — عنایت انہا سب کشاف القلو
دیکھے بائیں پر شہ نے بھر کر نظر — ابل کر چلی بائیں سنے سے
عروس کے بدل خلق آتی جتی — ہنوز اگ اسے سنا بائیں
عُرُس — ہَنُوز

کچھ مدت بعد حضرت منتخب الدین کو القاء ہوا کہ ان کا وقت ،
پہنچا۔ آپ نے شاہ برہان الدین غریب کو بلا کر اس کی اطلاع دی اور
اب تم دکن پر حکومت کرو۔ حضرت علی کا علم ان کے حوالے کیا
مرید، فقراء اور اولیاء ساتھ تھے ان سب کو ساتھ کر دیا۔ راستے میں
اولیاء اس قافلے کے ساتھ ہو لئے۔

معظم کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ منتخب الدین کے ہمراہ ب
غریب بھی آئے تھے۔ لیکن کسی تذکرے سے اس کی توثیق نہیں ہوتی
تذکرہ نگاروں[۱۴] کا بیان ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے مولانا برہان ال
کو اپنے سات سو مریدوں کے ساتھ جن میں بعض پالکی نشین تھے، د
کیا تھا اور بعضوں[۱۵] نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت منتخب الدین زر زری
بھیجا اور جب دیوگیر میں ان کا انتقال ہوا تو حضرت برہان الدین غریب
خلافت عطا کرکے دکن کی ولایت پر مامور کیا۔ یہ واقعہ حضرت
اولیاء کے انتقال سے کچھ ہی پہلے کا ہے۔

بہر حال معظم کے بیان کے مطابق حضرت برہان الدین غریب
اولیائے کامل کے ساتھ ایلورا سے دولت آباد روانہ ہوئے۔ راستے میں خلق
دیکھ کر ان کی معتقد ہوتی گئی۔[۱۶] دولت آباد پہنچ کر حضرت نے خو

سکونت اختیار کی لیکن اپنے ساتھیوں کو رشد و ہدایت کے لئے مختلف مقامات کو روانہ کیا:

برابر جتے اولیاء سات تھے نفی ذات میں ہوکر اثبات تھے
دئے ملک سب بانٹ کر شاہ نے سو اس شاہ برہان جم جاہ نے
شہنشہ کے دیک سارے فقیر ہر اک ٹھار بیٹھے ہیں سب ہوکے پیر
روانہ کئے سب کو ارشاد کر اپے شاہ رہے دولت آباد پر

معظم حضرت برہان کے کمالات کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہیں سماع کا بہت شوق تھا اور اس تعلق سے تقریباً وہی بات لکھی ہے جو وہ نظام الدین اولیاء کے بارے میں کہہ آئے ہیں:

بجز راگ دیگر نہ کچھ کام تھا سدا مے محبت کیرا جام تھا[17]

حضرت برہان الدین غریب کے بعد انہوں نے شاہ راجو قتال، حسن سجزی، شاہ زین الدین، پیر تین دمڑی، شاہ خوندمیر شاہ کالے، شاہ حسین گنج رواں، شاہ سانگڑے سلطان کے علاوہ اور کئی بزرگوں کا ذکر کیا ہے. تعجب ہے کہ خانوادۂ چشت کے اس تذکرے میں شاہ حسین گنج رواں اور شاہ سانگڑے سلطان کا تو ذکر کیا گیا ہے جو علی الترتیب سہروردی[18] اور رفاعی[19] سلسلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن شیخ نصیرالدین چراغ دہلی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے، حالانکہ سلسلۂ چشت کی وہ ایک اہم کڑی ہیں اور بندہ نواز کے توسط سے ان ہی کا فیض دکن میں عام ہوا ہے

نظم کے آخری حصے میں معظم نے اورنگ زیب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے شاہ برہان الدین غریب کے گنبد میں پناہ لی تھی تاکہ حضرت کی برکت سے ان کے گناہ بخشے جائیں:

دیکھو بادشاہ یہ ہندوستان کا سو اس باغ بستاں گلستان کا
کتے نام اس کا ہے اورنگ زیب او مقبول حق کا ہے بے شک وریب
لیا شہ کی گنبد کا آکر پناہ برکت سوں حق، شہ کے بخشے گناہ

ابونصر خالدی صاحب نے ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

«یعنی محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے شہ کی گنبد کا پناہ لیا. مراد یہ ہے کہ اس کی لاش برہان الدین غریب کی درگاہ کے احاطے میں دفن ہے.»[20]

اورنگ زیب شاہ زین الدین کے روضے کے پائین دفن ہے۔[1] اس لئے خالدی صاحب کی تاویل درست نہیں معلوم ہوتی۔ معظم کے شعر میں «گنبد» اور «پناہ» کے لفظ بھی غورطلب ہیں۔

دکن میں اب بھی یہ روایت مشہور ہے کہ صوفی سرمد کی شہادت کے بعد اورنگ زیب کا سکون قلب جاتا رہا تھا۔ اور راتوں کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھ لگتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ کسی نے چارپائی الٹ دی ہے برسوں خواب شیریں کی نعمت سے محروم رہے یہاں تک کہ حضرت برہان الدین غریب کی درگاہ پر فاتحہ‌خوانی کے لئے حاضر ہوئے۔ روضۂ مبارک میں قدم رکھتے ہی انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کا کھویا ہوا سکون مل گیا اور انہیں نیند آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معظم نے متذکرۂ بالا شعر میں اسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نظم کو ختم کرتے ہوئے معظم کہتے ہیں کہ سالک کو چاہئے کہ شیخ، رسول اور اللہ کو ایک سمجھے۔ اور خود اپنا اور اپنے پیر کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

معظم کتے قادری ہے فقیر گناہ‌گار عاجز فقیر و حقیر
ملا مجھ کو مرشد ہوا میں امیں مرے حق‌پہ راشد ہو آپیں امیں
یہاں آ کے طالب ہو سجدہ کیا مجھے پیر نے حق دکھاکر دیا

نظم مناجات پر ختم ہوتی ہے:

مناجات یا رب یو کرنا قبول بحق محمد و آل رسول

معظم کی یہ نظم بھی شجرۃ الاتقیاء کی طرح خاصی طویل ہے۔ لیکن شجرۃ الاتقیاء کی گرمی گفتار اس میں نہیں ہے۔ اگرچہ انہوں نے بزرگان سلسلہ کے کمالات وکرامات کے ذکر میں زور بیان دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن خلوص کی وہ شدت اور عقیدت کا وہ جوش نہیں ہے جو شجرۃالاتقیاء میں نظر آتا ہے۔ اس لئے ادبی اعتبار سے بھی یہ نظم شجرۃ الاتقیاء سے بہت پست ہے۔ اگرچہ شجرۃالاتقیاء میں بھی بہت سی ایسی روایتیں ہیں جو حقائق کے خلاف ہیں لیکن زیر تبصرہ نظم میں اس قسم کی روایتوں کی کثرت ہے جس کی وجہ سے تذکرے کے اعتبار سے بھی اس نظم کا وزن گھٹ جاتا ہے۔

حوالے :

۱ شاہ معظم کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون «اردو کا پہلا ساقی نامہ اور اُس کا مصنف» مطبوعہ رسالہ اردو کراچی، جلد ۴۵ شمارہ ۲ بابتہ اپریل، مئی و جون ۱۹۶۹ع۔

۲ شاہ معظم کی منظومات کے نسخے مختلف کتب خانوں اور خانگی ذخیروں میں مل جاتے ہیں، لیکن گلزار چشت اور شجرۃ الاتقیاء کے صرف ایک ہی نسخے کا پتہ چل سکا ہے۔

۳ نصیرالدین ہاشمی مرحوم نے اس مثنوی کا نام گلزار جنت لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو نواب سالار جنگ کے کتب خانے کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست ص۷۸۵۔

۴ تذکروں کا بیان ہے کہ حضرت عثمان ہارونی سے خلافت و اجازت حاصل کرنے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین ہارون سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور بارگاہ نبوی پر حاضری دی۔ اس موقع پر رسول اکرم صلعم نے بشارت دی کہ «خدا نے ہندوستان کا ملک تیرے سپرد کیا ہے۔»

۵ تذکرہ نگاروں نے اس کا نام جیپال جوگی لکھا ہے۔ وہ راے پتھورا کا گرو اور بہت بڑا ساحر تھا۔ راے کے حکم سے اس نے اپنے ڈیڑھ ہزار چیلوں کے ساتھ حضرت کو تنگ کرنا شروع کیا لیکن اس کے سحر و طلسم کی ایک نہ چلی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو بڑی سوانح عمری ص ۱۸) بعض تذکروں نے جیپال کو راے پتھورا کا بھائی بھی بتایا ہے۔

۶۔ اس ناکامی اور نامرادی نے جیپال کی آنکھیں کھول دیں اور وہ حضرت خواجہ کے دائرۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ جیپال نے حضرت سے التجا کی کہ مجھ کو عمر جاوید عطا کی جائے تاکہ تلافیٔ معاصی ہوسکے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ تو قیامت تک زندہ رہےگا مگر چشمِ خلائق سے پوشیدہ رہےگا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ جیپال اب تک زندہ ہے اور ہر شبِ جمعہ کو زیارت روضۂ مقدسہ کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ جو زائر راستہ سے بھٹک جاتے ہیں ان کو راہ بتانے کی خدمت اس کے ذمے ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت نے جیپال کا نام عبداللہ رکھا تھا۔ (بڑی سوانح عمری ص ۲۰)

۷ صاحب سیرالاولیاء نے لکھا ہے کہ شیخ فرید نے طے کا طریقہ اختیار کیا تھا۔

چھٹے دن ضعف اس قدر غالب آیا کہ آپ نڈھال ہوگئے ۔ اگرچہ افطار کا وقت ہو گیا تھا لیکن غیب سے کچھ نہ پہنچا ۔ رات گئے بھوک سے بیتاب ہوکر حضرت نے چند کنکریاں زمین سے اٹھاکر منہ میں ڈال لیں ۔ یہ کنکریاں شکر کی ڈلیاں بن گئیں تب ہی سے وہ پیر شکربار اور گنج شکر کہلانے لگے ۔ (سیر الاولیاء ص ۷۴) ۔

۸ صاحب سیر الاولیاء نے حضرت نظام الدین اولیاء کی سماع سے دلچسپی ، سماع کی محفلوں ، اس کے جواز ، آداب ، افادیت اور اہمیت کے بارے میں بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سماع کو اہمیت ضرور دیتے تھے لیکن صبح و شام اسی میں مستغرق نہیں رہتے تھے (ملاحظہ ہو سیرالاولیا ، نواں باب ، ص ۴۸۹)

۹ بعض تذکرہ نگاروں نے (مثلاً معارج الولایت) آپ کو شیخ العالم خواجہ فریدالدین گنج شکر کا مرید اور خلیفہ بتایا ہے ۔

۱۰ ایلورا ۔

۱۱ صاحب برکات الاولیاء نے بھی اس روایت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ (برکات‌الاولیاء ص ۱۲)

۱۲ مترجم روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیاء نے اپنے ذخیرۂ قلمی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ خطاب‌حضرت نظام الدین اولیاء کا عطاکیا ہوا ہے ۔ (ملاحظہ ہو روضۃ الاولیاء ص ۵۲) ۔

۱۳ مترجم روضۃ الاولیاء نے بھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ حضرت کی اس کرامت سے متأثر ہوکر سونا بائی نے اسلام قبول کیا اور اپنے پیر کی نظر کیمیاء اثر سے تھوڑے ہی عرصے میں بڑی عارفہ اور کاملہ ہو گئیں ۔ سونا بائی کا مزار حضرت کے گنبد کے برابر زیارت گاہ خلائق ہے ۔ (ملاحظہ ہو روضۃ الاولیاء ص ۵۴) ۔

۱۴ روضۃ الاولیاء بحوالۂ محبوب ذی المنن ص ۱۵۴ ۔

۱۵ تاریخ فرشتہ جلد دوم ، ص ۵۴۱ ۔

۱۶ واضح رہے کہ ایلورا سے دولت آباد چار پانچ کوس سے زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے ۔

۱۷ صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ « مولانا برہان الدین کا سماع میں پلے درجے کا

غلو تھا اور آپ کے ساتھ آپ کے یاروں کے رقص میں ایک جداگانہ طرز تھی. چنانچہ آپ کے یاروں کو اور لوگ برہانی کہ کر پکارا کرتے تھے.» (سیرالاولیاء ص ۲۷۹).
روضۃ الاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیہ، ص ۱۲.
تاریخ قندہار، ص ۲۰۸.
قدیم اُردو، جلد اول، ص ۲۲۳.
«گنبد اطہر (حضرت زین الدین) کے جانب غرب سلطان اورنگ زیب غازی نوراللہ مرقدہٗ حسب وصیت اپنے مولانا کے ظل عاطفت میں آسودہ ہیں.» (روضۃالاولیاء المعروف بہ نفحات الاصفیہ، ص ۱۲۷).

* احمر لاری

حسرت موہانی بحیثیت تذکرہ نگار

اردو شاعری کی طرح اردو تذکرہ نگاری بھی فارسی کی مرہونِ منت ہے اردو شعرا کے تذکرے نہ صرف یہ کہ فارسی تذکروں کے طرز پر مرتب ہوئے بلکہ عرصہ تک ان کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ اردو کے دستیاب تذکروں میں سب سے قدیم تذکرے «نکات الشعرا»، «گلشن گفتار» «اور تحفۃ الشعرا» ہیں۔ یہ تینوں تذکرے ۱۱۶۵ھ (مطابق ۱۷۵۲ع) میں مرتب ہوئے ان تینوں کی زبان فارسی ہے۔ مرزا علی لطف کا تذکرہ «گلشن ہند» پہلا تذکرہ ہے جو اردو زبان میں لکھا گیا۔ یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ (مطابق ۱۸۰۱ع) میں «گلزار ابراہیم» سے ترجمہ و مترجم ہوکر مرتب ہوا۔ اس کے بعد بھی ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۴ع) تک جتنے تذکرے مرتب ہوئے ان کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ ۱۲۶۸ھ میں امام بخش صہبائی نے «انتخابِ دواوین» کے نام سے مشہور شعرا کا ایک انتخاب مرتب کیا جس میں انتخابِ کلام کے ساتھ شعرا کے مختصر حالات زندگی بھی درج ہیں۔ «انتخابِ دواوین» کی زبان اردو ہے۔ دراصل یہیں سے اردو شعرا کے تذکروں کو اردو زبان میں لکھنے کی روایت کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ ۱۲۶۰ھ کے بعد اردو شعرا کے جتنے تذکرے لکھے گئے ان میں سے بیشتر کی زبان اردو ہے۔

ہندوستان میں اردو زبان کو اٹھارویں صدی کی ابتدا سے مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ع) کے بعد نہ صرف مغلیہ سلطنت پر زوال آیا بلکہ فارسی زبان بھی زوال پذیر ہوئی۔ فارسی کا زوال اردو کی ترقی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اور دھیرے دھیرے اردو ہر شعبۂ زندگی میں فارسی کی جگہ لینے لگی۔ اردو شاعری نے خاص طور سے ترقی کی اور بہت جلد عوام و خواص میں مقبول ہو گئی۔ البتہ اردو نثر کی طرف ذرا دیر میں توجہ کی گئی۔ جب اردو شعرا کی تعداد بڑھنے لگی اور عوام و خواص میں ان کو وہی اہمیت حاصل ہو گئی جو کـ

* ڈاکٹر نورالحسن احمر لاری، ام۔ اے و پی ایچ۔ ڈی، استاد شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی۔ (یو۔ پی)

زمانے میں فارسی شعرا کو حاصل تھی تو تذکرہ نگاروں کو ان کے متعلق مستقل تذکرے لکھنے کی فکر ہوئی۔ « نگار پاکستان » کے « تذکروں کا تذکرہ نمبر » (۱۹۶۲) میں اردو تذکروں کی جو فہرست دی گئی ہے وہ « نکات الشعرا » سے « آب حیات » تک چون تذکروں پر مشتمل ہے یہ فہرست بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

۲

ڈاکٹر سید عبداللہ تذکرے کے فن سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ « در حقیقت تذکرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک مرکب نوع تصنیف ہے۔ وہ اجزا جن پر ایک تذکرہ عموماً مشتمل ہوتا ہے ، تین ہیں .... جدید اصطلاحات کی رو سے ان کے تذکروں میں بیاگرافیکل ڈکشنری (قاموس) لٹریری ہسٹری (تاریخ ادب) اور لٹریری کرٹسزم (تنقید ادب) کے عناصر سہ‌گانہ یک جامجتمع ہوئے تھے [1] اس نقطۂ نظر سے اگر تذکروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر تذکرے میں یہ تینوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مگر کسی تذکرے میں کسی ایک پہلو پر زور دیا گیا ہے تو دوسرے تذکرے میں کس پہلو پر میر کے « نکات الشعرا » میں خاص زور تنقید اور اصلاح سخن پر ہے۔ ابراہیم خاں خلیل کا تذکرہ « گلزار ابراہیم » سوانح نگاری پر زور دیتا ہے۔ اور بہت سی خامیوں کے باوجود کریم الدین کے « طبقات شعرائے ہند » میں تاریخ ادب کا شعور جھلکتا ہے۔

ایک مرکب نوع تصنیف ہونے کے باوجود « تذکرہ فن سیرت کی ایک شاخ ہے۔ »[2] تذکروں کی حیثیت بیاگر افیکل ڈکشنری کی ہے اور بیاگر افیکل ڈکشنری کی نمایاں خصوصیت ایجاز و اختصار ہے۔ English Biography in the 18 th century میں لانگیکر نے لکھا ہے کہ تذکرۂ رجال میں مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اشخاص کے واقعاتِ زندگی کو ایسے پر معنی ایجاز و اختصار سے بیان کرے جس سے ان اشخاص کی پوری تصویر سیرت آنکھوں میں پھر جائے۔ ایک بیاگرافی اور بیاگر افیکل ڈکشنری میں یہی فرق ہوتا ہے کہ بیاگرافی میں سوانح نگار ایک فرد کی مفصل ترین اور جارح ترین سرگذشت بیان کرتا ہے۔ اس کے برعکس کسی « معجم » یا « قاموس تراجم » (بیاگر افیکل ڈکشنری) میں گنجائش کے کم ہونے کی وجہ سے اختصار سے کام لینا پڑتا ہے۔ »[3]

---

۱ ڈاکٹر سید عبداللہ ، « شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن » مکتبہ جدید لاہور (۱۹۵۲) ص ۹۳،۹۲
۲ ڈاکٹر سید عبداللہ ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاروں کا فن ، ص ۹۳ ص ۲۹
۳ ایضاً

مندرجہ بالا تعریف کو ذہن میں رکھ کر اگر اردو تذکروں پر نظر ڈال تو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اہم تذکرے اس خصوصیت کے حامل ہیں۔ ایجاز و کے باوجود ان تذکروں میں شاعر کی زندگی، اس کی شخصیت، اس کے اور افتاد طبع کی مختصر لیکن جامع عکاسی ملتی ہے۔ اردو شاعری کی ابت لے کر انیسویں صدی کے آخر تک جتنے شاعر گذرے ہیں اُن کے متعلق م زیادہ تر انہیں تذکروں سے حاصل ہوئی ہیں۔ بڑے شعرا کے سلسلے میں تذکروں میں اتنا مواد بکھرا ہوا ہے کہ آج انہیں کی بنیاد پر ان کے متعلق کتابیں تصنیف ہو رہی ہیں۔

تمام اہم تذکرہ نگاروں نے اختصار کے باوجود جامعیت کو پیش نظر رکھ مختصر الفاظ میں شاعر کی زندگی کی اہم کڑیوں کی نشاندہی کی گئی ہے سلسلے میں تذکرہ نگاروں نے حفظِ مراتب کا لحاظ رکھا ہے۔ بعض تذکر بیجا اختصار کا نقص بھی ملتا ہے۔ «نکات الشعرا» اس باب میں خصوصیت کے بدنام ہے۔ میر نے حالاتِ زندگی پر ذرا کم توجہ کی ہے۔ «نکات الشعرا اثر کے تحت جو تذکرے مرتب ہوئے ہیں، ان میں بھی یہ خامی ملۃ میر حسن، مصحفی اور شفیق نے اپنے تذکروں میں حالاتِ زندگی پر زیادہ توجہ اور سنین کا بھی التزام کیا ہے۔ ابراہیم خاں، مرزا علی لطف اور کریم الد شعرا کے حالاتِ زندگی زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ سن و وفات و نیز دیگر اہم واقعات کے سنین بھی التزام کے ساتھ دئیے گئے ہیں۔ ا تذکروں پر مغرب کے اثرات نمایاں ہیں، اس لئے ان میں ایک حد تک ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

سیرت نگاری کے سلسلے میں بھی ان تذکروں میں ایجاز و اختصار کو ، رکھا گیا ہے۔ «نکات الشعرا» میں ضرورت سے زیادہ ایجاز و اختصار کے سیرت نگاری کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ «ہمارے نکات کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے»[1] میر کے یہاں ، جامعیت ہے کہ شاعر کی شخصیت، اس کی افتادِ طبع اور اس کے ما

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ص ۲۹

نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ میر حسن، مصحفی اور شفیق کے تذکروں میں بھی یہ خوبی ملتی ہے۔ «گلزار ابراہیم»، «گلشن ہند اور «طبقاتِ شعرائے ہند» میں مغربی اثرات کے تحت سیرت نگاری میں کس قدر تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ مگر ان میں وہ حسن نہیں جو میر کی مختصر تصویروں میں ہے۔

۳

اردو میں تنقید کی ابتدا انہیں تذکروں سے ہوتی ہے۔ لیکن ان میں تفصیلی تنقید کی تلاش فضول ہے۔ ان میں شعرا کے کلام پر مُجمل رائیں ملتی ہیں، جنہیں تنقیدی نقوش و اشارات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ رائیں بھی زیادہ تر کلام کی ظاہری خوبیوں یا خامیوں کے متعلق ہوتی ہیں۔ اس وقت تنقید کا معیار یہی تھا۔ ان تذکروں میں جو تنقیدی نقوش و اشارات بکھرے ہوئے ہیں، انھیں کو بنیاد بنا کر آج اس دور کے شعرا پر تفصیلی تنقیدیں لکھی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ ان تذکروں کی «دنیاے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں»[1] حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی میر کا «نکات الشعرا» بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ریختہ کے اقسام، ان کی خصوصیات، لب و لہجہ، اور شعری محاسن وغیرہ کا اجمالی ذکر سب سے پہلے اسی تذکرے میں ملتا ہے۔ شعرا کے کلام پر بھی میر نے بڑی بیباکی سے اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ «نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے»۔[2]

قائم، میر حسن اور مصحفی کے تذکرے بھی تنقید کے نقطۂ نظر سے اہمیت کے حامل ہیں۔ میر حسن نے بھی میر کی طرح اپنے تذکرہ میں ریختہ کی تعریف کی ہے، اور طرز متقدمین اور متأخرین کے فرق پر روشنی ڈالی ہے انھوں نے جگہ جگہ اردو شعرا کا مقابلہ فارسی شعرا سے بھی کیا ہے۔ مصحفی کی رایوں میں تنقیدی عنصر کم سہی، «تاہم بعض نامور شعرا کے متعلق ان کی رائیں خاص وقعت رکھتی ہیں» جامع اور مفصل تذکروں میں سوانحی عنصر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، مگر ان میں تنقید بہت کم ملتی ہے۔ ایسے تذکروں میں صرف شیفتہ کا «گلشن بے خار» ایسا تذکرہ ہے جس کی تنقیدی اہمیت بھی ہے۔ شیفتہ نے بیشتر شعرا کے متعلق

---

۱ کلیم الدین احمد۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ (۱۹۵۷ع) ص ۲۹
۲ ڈاکٹر سید عبداللہ، شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن۔ ص ۲۰
۳ مولوی عبدالحق۔ مقدمۂ ریاض الفصحاء مؤلفہ مصحفی ص ط ی۔

کوئی رائے نہیں دی ہے، یا صرف دو ایک سطروں میں رسمی رایوں پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن جن شعرا کے متعلق انھوں نے کسی قدر تفصیل سے اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان کی تنقیدی صلاحیت کے مظہر ہیں۔ اہم شعرا کے متعلق خصوصاً ان کی رائیں بڑی وقیع ہیں۔ انھوں نے اردو شعرا کا موازنہ فارسی شعرا سے بھی کیا ہے۔ اور اس میدان میں وہ میر حسن سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔

اسی سلسلے میں انتخابِ کلام کا بھی ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ انتخابِ کلام سے بھی تذکرہ نگار کے تنقیدی نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔ انتخابِ کلام تذکروں کی اہم خصوصیت ہے۔ ابتدائی تذکروں میں انتخابِ کلام مختصر ہوتا تھا۔ مگر جب جامع اور تفصیلی تذکرے لکھے گئے، تو ان میں انتخابِ کلام بھی طویل ہوتا گیا۔ علوم کو مختصر انتخابِ کلام سے تشفی نہیں ہوتی تھی، اس لئے ان کے ذوق کی تسکین کے لیے بیاضیں بھی مرتب کی گئیں۔ بعض تذکرے انھیں بیاضوں کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ میر، قائم، میر حسن، مصحفی اور شیفتہ انتخابِ کلام میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق اور تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

۴

کریم الدین نے «طبقات شعرائے ہند» کے دیباچے میں لکھا ہے کہ «کتب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں فنِ تاریخ کی ہیں اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بلحاظ تکمیل فن تواریخ کی ان فن کی کتابیں ہر ایک زبانِ مروجہ میں جس کو یہ خیال پیر امون خاطر ہوا ہے، تصنیف کی ہیں۔ خصوصاً زبانِ عرب اور زبانِ فارسی وغیرہ میں اس قسم کی کتابیں بہت تصنیف ہوئی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی زبانِ اردو میں بھی اس طریق تصنیف کا استعمال کیا گیا ہے۔»[1] اس عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ تذکرہ نگار تذکروں کو تاریخ کی ایک شاخ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے تذکروں میں تاریخ کے اوصاف کا پایا جانا لازمی ہے۔ انھیں تذکروں نے آگے چل کر قاموس نگاری کے دور سے گذر کر تاریخ ادب کی حدد میں قدم رکھا۔ یوں تو میر کے «نکات الشعرا» میں بھی ایک نیم تاریخی ترتیب موجود ہے، مگر سب سے پہلے قائم نے «مخزن نکات» میں ادوار کا تعین کیا۔ قائم کے بعد میر حسن نے اس روش کو اپنایا۔ میر کے «نکات الشعرا» اور اس سے متاثر تذکروں

---

۱ کریم الدین طبقات شعرائے ہند دیباچہ ص ۱

میں سنین کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے مگر بعد کے تذکرہ نگاروں خصوصاً میر حسن، مصحفی اور شفیق نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ «گلزار ابراھیم» اور «گلشن ہند» کی تو یہ خاص خصوصیت ہی ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں تذکروں میں تاریخی مواد بھی کافی ہے۔ دتاسی کے «تاریخ ادب ہندوستانی» اور کریم الدین کے «طبقات شعرائے ہند» میں تاریخ ادب کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہیں۔ ان تذکروں میں مختلف ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اردو شاعری کو تاریخی نقطۂ نظر سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مگر شعرا کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے ہی لکھے گئے ہیں، اس لیے یہ تذکرے تاریخ ادب کا درجہ نہیں حاصل کرسکے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے ہاتھوں تاریخ نگاری کی روایت درجۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ «آبِ حیات» اردو شاعری کی پہلی باقاعدہ تاریخ ہے۔ آبِ حیات سے متاثر ہوکر اردو شاعری کی اور بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں «گل رعنا» اور «شعرالہند» خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ کلیم الدین احمد، ڈاکٹر احسن فاروقی اور بعض دوسرے نقادوں نے «آب حیات» «گل رعنا» اور «شعرالہند» کو تذکروں کی صف میں رکھا ہے۔ حسرت موہانی نے بھی «آبِ حیات» کے ساتھ تذکرہ کا لفظ جوڑ دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ اردو شاعری کی تاریخیں ہیں۔ انھیں تذکروں میں شمار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ظاہر ہے کہ لفظ تذکرہ سے جو تصور ہمارے ذہن میں آتا ہے، «آب حیات» اور «شعرالہند» وغیرہ میں اس کا عکس دور دور تک نظر نہیں آتا۔ یہ سمجھنا کہ آب حیات کے بعد اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت ختم ہوگئی، صحیح نہیں۔ مثال کے طور پر «جلوۂ خضر» مولفہ صفیر بلگرامی، «آب بقا» مولفہ خواجہ عبدالرؤف عشرت اور «خم خانۂ جاوید» مولفہ سری رام کا نام لیا جاسکتا ہے۔ حسرت موہانی کا تذکرہ بھی (جو نا مکمل اور غیر مرتب ہے) اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

۵

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ «اگر اردو شعرا کی ایک عمدہ بیاگرافیکل انسائکلوپیڈیا تیار کرلی جائے جس میں ان سب تذکروں کا لب لباب موجود ہو تو یقیناً یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی، جس سے ہمیں اپنے سب شاعروں کے مجمل

مگر صحیح حالات یکجا معلوم ہوسکیں گے ۔ خمخانۂ جاوید اس تخیل کی عملی
ہے ۔ مگر نا مکمل ہے[1]

حسرت کے یہاں بھی تذکرہ نگاری کا یہی تصور ملتا ہے وہ بھی اردو ،
ایک جامع قاموس مرتب کرنا چاہتے تھے ۔ جس میں تاریخی شعور بھی کارفر
حسرت کے نظریۂ تذکرہ نگاری کو سمجھنے کے لئے ان کی تذکرہ نگاری کی
اور عہد بعہد ارتقا پر نظر ڈالنا ضروری ہے ۔

حسرت کی تذکرہ نگاری کا آغاز علی گڈھ میں ان کی طالب علمی کے
میں ہی ہو گیا تھا ۔ انہوں نے « انجمن اردوئے معلی » کے جلسوں میں (
۱۔ ۱۹۰۰ و ۲ ۔ ۱۹۰۱ء) مندرجۂ ذیل پانچ مضامین پڑھے تھے :

۱ اصغر علی خاں نسیم	۲ سید محمد خاں رند
۳ منیر ۴ سالک	۵ میر کے بہتر نشتر

ان میں سے مضامین نمبر ایک تا چار تذکروں کے خطوط پر ہی لکھ
ہیں ۔ نمبر ایک اور دو کو حسرت نے بعد میں اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ میں
الشعرا کے عنوان کے تحت شائع کیا ۔ مضامین نمبر ۳ اور ۴ حسرت کی
طالبعلمی ہی میں « محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین ، علی گڈھ » میں شائع ہ
اس زمانے میں ان کا ایک اور مضمون بعنوان « طالب علی خاں عیشی » مخز
شائع ہوا ۔[5] یہ مضمون بھی تذکرہ کے طرز پر لکھا گیا ہے ۔

لیکن باقاعدگی کے ساتھ تذکرہ نگاری کی طرف حسرت اس وقت متوجہ
جب انہوں نے اپنا رسالہ « اردوئے معلیٰ » جاری کیا ۔ انہوں نے اس کے
ہی شمارے میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ لکھنے کے ارادے کا اظہار ان
میں کیا ہے :

---

۱ ڈاکٹر سید عبداللہ ، « اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن » ص ۱۰۹
۲ تلمذ حسین ، خلاصہ کار روائی انجمن اردوئے معلی بابتہ ۲ ۔ ۱۹۰۱ ، موشومہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج
علی گڈھ ، جون ۱۹۰۲ ع ، ص ۱۰
۳ اردوئے معلی جنوری ۱۹۰۷ ء (مضمون نمبر ۱) ایضاً نومبر ۱۹۰۴ ع (مضمون نمبر ۲)
۴ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڈھ ، جنوری ۱۹۰۲ (مضمون نمبر ۳) ایضا ، اپریل ۱۹۰۲ ع (مضمون
۵ مخزن ، لاہور ، جنوری ۱۹۰۱ع ۔ بعد میں یہ مضمون اردوئے معلی ، دسمبر ۱۹۰۶ع میں بھی شائع ہوا ۔

« آزاد کے درد مند دل کو اردو کی محبت نے مجبور کیا۔ تذکرہ آبِ حیات لکھا گیا اور حق یہ ہے کہ بے مثل لکھا گیا۔ یہ اسی کی بدولت ہے کہ کبھی کبھی مصحفی کا نام زبانوں پر آجاتا ہے۔ جس طرح آزاد نے مصحفی کا نام روشن کیا، خدا ان کی بھی شہرت کو قیامت تک قائم رکھے لیکن بندہ حسرت کی آرزو کہتی ہے کہ مصحفی کی طرح ان کے شاگرد ہوس، شہیدی، عیشی، غافل، گرم، مضطر، تنہا بھی اپنے کمال کی کیوں نہ داد پائیں۔ آزاد پر ذوق و مومن و غالب کا حق تھا، حسرت پر سیم و تسلیم و امیر کا حق ہے۔

« اپنی ہیچمدانی کا علم ہے۔ لیکن اصرارِ طبیعت کو کیا کروں۔ تمنا مجھ سے کہتی ہے اور میں قلم سے کہتا ہوں کہ لکھ، جوکچھ ہوسکے لکھ۔ جانتا ہوں کہ حقِ تذکرہ نویسی ادا نہیں کرسکتا۔ لیکن پھر بھی آمادۂ تحریر ہوں۔ »[۱]

اردوئے معلیٰ اپنے پہلے دور میں جولائی ۱۹۰۳ع سے جون ۱۹۱۳ع تک نکلتا رہا (مئی ۱۹۰۸ع سے ستمبر ۱۹۰۹ ع تک حسرت کی گرفتاری کی وجہ سے پرچہ بند رہا) دوسری بار «اردوئے معلیٰ» جنوری ۱۹۲۵ ع سے نکلنا شروع ہوا اور مارچ ۱۹۴۲ تک جاری رہا۔ درمیانی وقفے میں حسرت نے ایک سہ ماہی رسالہ «تذکرۃ الشعرا» کے نام سے نکالا تھا۔ لیکن اس کے محض چند ہی شمارے نکل سکے۔ انہیں رسائل میں حسرت شعرا کا تذکرہ لکھتے رہے۔ بعض شعرا کا تذکرہ انہوں نے دوسروں سے بھی لکھوا کر اپنے رسائل میں بھی شائع کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے چند شعرا کے دواوین یا ان کے انتخابات اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کئے یہ مقدمے بھی تذکروں ہی کے خطوط پر لکھے گئے ہیں۔[۲]

حسرت کی تذکرہ نگاری کے منصوبے میں ایک واضح ارتقا ملتا ہے۔ جولائی ۱۹۰۳ ع کے اردوئے معلیٰ میں انہوں نے اپنے تذکرے کا خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

« زمانۂ شاعری کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے چاہئے تھی لیکن دلچسپیء مزید کے خیال سے اس طریق کو پسند کرتا ہوں کہ دور اول کے

---

۱ اردوئے معلیٰ، جولائی ۱۹۰۳ ع۔ صفحہ ۲۰۱

۲ میری نظر سے حسب ذیل شعرا کے دواوین یا ان کے انتخاب گزرے ہیں جنہیں حسرت نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔

کسی استاد کا حال لکھ کر ضمن میں اس کے سلسلۂ تلمذ میں اس وقت تک جتنے استاد ہوئے ہیں ان سب کا ذکر لکھا جائے اور پھر اسی طو پر دورِ اول کے دوسرے استاد کا ذکر شروع ہو۔ و علیٰ ہذا۔

« سب سے پہلے یہ سلسلہ حاتم سے شروع کرتا ہوں۔ اس کی کئی وجو ہیں۔ اول تو یہ کہ صرف یہی ایک ایسا سلسلہ ہے جو باوجود قدامت اس وقت تک قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ بندہ کو بھی اسی خاندان شاعری سے تعلق ہے »[۱]

اکتوبر ۱۹۰۹ کے اردوے معلی میں انہوں نے اس کی مزید وضاحت کی

« مدت سے ہمارا ارادہ تھا کہ اردو زبان میں تمام گذشتہ اور موجود اساتذہ کا ایک ایسا تذکرہ ترتیب دیا جائے، جس میں ہر استاد کا مفصل حال اور اس کے کلام پر بے لاگ تنقید موجود ہو، اور اس تذکرے کی تقسیم باعتبار سلاسل شعرا پانچ جلدوں میں ہو۔ اس طور پر کہ جلد اول میں سلسلۂ شاہ حاتم کے کل استاد اور صاحب دیوان شعرا کا ذکر ہو۔ جلد دوم میں سلسلۂ مصحفی کا۔ جلد سوم میں سلسلۂ ناسخ کا۔ جلد چہارم میں سلاسل میر تقی میر، میرسوز، میرزا مظہر، جعفر علی حسرت، مرزا غالب کا اور جلد پنجم میں اساتذۂ متفرق کا حال درج ہو »۔[۲]

مندرجۂ بالا منصوبے کو حسرت نے اپنے رسالہ «تذکرۃ الشعرا» میں بعینہ پیش کیا ہے۔[۳] لیکن اردوے معلی کو ۱۹۲۵ میں دوبارہ جاری کرتے حسرت کی تذکرہ نگاری کے منصوبے میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی، جو مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

« ارباب سخن، یہ اردو شعرا کا ایک مکمل تذکرہ ہے، جس کے آٹھ طبقے قرار دئے گئے ہیں۔ ان طبقات میں سے طبقۂ ہفتم و ہشتم کے اک شعرا کا نام زیر عنوان « معاصرین حسرت » ایک قطعہ میں درج کردیا گیا ہے۔ آیندہ ہر ماہ ان معاصرین موجود و مرحوم میں سے کسی ایک

---

۱ اردوے معلی، جولائی ۱۹۰۳ع، ص ۳
۲ اردوے معلی، اکتوبر ۱۹۰۹ع، ص ۱
۳ تذکرۃ الشعرا حصہ اول جزو سوم، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۱۵ع، ص ۱

تذکرہ بالالتزام شائع ہوا کرے گا۔»[1]

حسرت نے اپنے تذکرے کا خاکہ آخری اور مکمل شکل میں اردوے معلی کے شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۲۶ع میں پیش کیا ہے۔ اسی کو معمولی لفظی تغیر کے ساتھ جنوری ۲۷ع نیز جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۳۰ع کے «اردوے معلی» میں دہرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

«ارباب سخن۔ اس نام سے ہم شعرائے اردو کا ایک جامع و مستند تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں، جس کے مفصلۂ ذیل پانچ حصے قرار دئے گئے ہیں:

(۱) حصۂ اول، سلاسل شعرائے اردو، جس میں شعرائے اُردو کی ترتیب و تقسیم ان کے سلسلۂ شاعری کے اعتبار سے کی جائے گی، جس کے دیکھنے سے بہ یک نظر معلوم ہو سکے گا کہ کس شاعر کو کس خاندان سے تعلق ہے۔

(۲) حصۂ دوم، فہرست شعرائے اردو۔ جس میں مذکورہ بالا سلاسل کے جملہ شعرا نیز شعرائے متفرق (کی) ایک مکمل فہرست بقید نام و نشان مرتب کردی جائے گی۔

(۳) حصۂ سوم، تذکرہ شعرائے اردو جس میں تمام قابل ذکر شعرائے اردو کا حال مع انتخاب کلام درج کیا جائے گا۔

(۴) حصۂ چہارم، طبقات شعرائے اردو۔ جس میں اردو زبان کے جملہ مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کی تقسیم ان کے زمانۂ شاعری کے لحاظ سے مفصلہ ذیل سات طبقوں میں کی جائے گی۔

طبقۂ اول از ابتدائے عہد تا ۱۱۸۰ھ، طبقۂ دوم از ۱۱۸۱ھ تا ۱۲۱۰ھ۔ طبقۂ سوم از ۱۲۱۱ھ تا ۱۲۴۰ھ۔ طبقۂ چہارم از ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۷۰ھ۔ طبقۂ پنجم از ۱۲۷۱ھ تا ۱۳۰۰ھ۔ طبقۂ ششم از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۰ھ۔ طبقۂ ہفتم از ۱۳۳۱ھ (رواں)۔

(۵) حصۂ پنجم، مربیان شعرائے اردو، جس میں شاہان و امرائے دہلی و اودھ اور نوابان و امرائے مرشدآباد، عظیم آباد، حیدرآباد، رامپور، بھوپال، ٹونک، بنارس، کدورہ، فرخ آباد و باندہ وغیرہ میں سے ان کا حال درج کیا جائے گا جو خود شاعر تھے اور جنھوں نے اپنے زمانے کے مشاہیر سخن کی مربی گری کی تھی۔»[2]

۱۔ اردوے معلی جنوری، فروری ۱۹۲۵ع، ص ٹائیٹل ۲

۲ اردوے معلی شمارہ جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۳۰ع، ص ۱

مندرجۂ بالا اقتباس سے حسرت کا نظریۂ تذکرہ نگاری اپنی ترقی یافتہ شکل میں واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ پہلے وہ اپنا تذکرہ سلاسلِ شعرا کی بنیاد پر مرتب کرنا چاہتے تھے۔[1] لیکن جلد ہی انہیں اس طریقے کی خامی کا احساس ہو گیا۔ بعد میں انہوں نے جو منصوبہ بنایا وہ زیادہ موزوں تھا اور تذکرے کی روایات سے بھی ہم آہنگ تھا۔ حالانکہ حسرت آب حیات سے متأثر ہوکر تذکرہ نگاری کی طرف مائل ہوئے تھے، لیکن وہ تذکرے کو سیرت ہی کی ایک شاخ متصور کرتے تھے۔ وہ آزاد کی طرح تذکرے کو تاریخ ادب نہیں بنانا چاہتے تھے۔ بلکہ اسے قاموس تراجم کی شکل میں مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ہاں «طبقات شعرائے ہند» اور «آب حیات» کے اثر سے ان کے یہاں تاریخی ارتقا کا احساس بھی ملتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ایک باب زمانۂ شاعری کے لحاظ سے شعرا کی تاریخی ترتیب کے لئے وقف کیا تھا۔ حسرت نے مواد کی فراہمی میں بیشتر تذکروں کے ساتھ ساتھ آب حیات سے بھی مدد لی ہے۔ مگر جہاں تک روشِ تذکرہ نگاری کا سوال ہے، «آب حیات» سے ان کی راہ الگ ہے۔ «آب حیات» اردو شاعری کی تاریخ ہے، اس لئے اس میں صرف نمائندہ شعرا کو جگہ ملی ہے۔ مگر حسرت تذکرے کو قاموسِ تراجم سمجھتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے تذکرے میں دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کو بھی جگہ دی ہے۔

(٦)

حسرت کے تذکرے «ارباب سخن» کا پہلا اور دوسرا حصہ پہلے اردوئے معلی[2] میں اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔[3] تیسرا حصہ اردوئے معلی اور تذکرۃ الشعرا کے اوراق میں اور انتخابات دواوین کے مقدموں کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ چوتھا اور پانچواں حصہ غالباً لکھا ہی نہیں گیا، یا اگر لکھا گیا تو چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

---

۱ سعادت خان ناصر نے اپنے تذکرہ «خوش معرکہ زیبا» (۱۲۶۲ھ - ۱۸۴۶ء) کو اسی نہج پر مرتب کیا تھا۔ انہوں نے شعرا کا ذکر بلحاظ حروف تہجی یا ابجد نہیں کیا اور ہر شاعر کے ساتھ اسی کے شاگردوں کا بھی تذکرہ لکھا تھا۔ ممکن ہے کہ حسرت نے «خوش معرکہ زیبا» ہی کے پیش نظر شعرا کا تذکرہ سلاسل کی بنیاد پر لکھنے کا ارادہ کیا ہو۔

۲ اردوئے معلی جنوری ۱۹۲۷ء تا اگست ۱۹۲۸ء۔

۳ ارباب سخن، حصہ اول و دوم، مطبوعہ رئیس المطابع کانپور (طبع اول)، ۱۹۲۹ء۔

«ارباب سخن» کے پہلے حصے میں مندرجۂ ذیل ۱۴ سلاسل کا شجرہ دیا ہوا ہے:
(۱) سلسلۂ شاہ حاتم تا شاہ نصیر و شاگردان نصیر [باستثناے ذوق و مومن] (۲) سلسلۂ مومن و شاگردان مومن تا نسیم و تسلیم و شاگردان تسلیم۔ [۳] سلسلۂ ذوق و شاگردان ذوق تا شاگردان داغ و ظہیر (۴) سلسلہ میرزا مظہر جان جاں (۵) سلسلۂ میرتقی میر (۶) سلسلۂ خواجــــہ میر درد (۷) سلسلۂ میر سوز (۸) سلسلۂ حسرت و جرأت و شاگردان جرأت (۹) سلسلۂ مصحفی و شاگردان مصحفی (۱۰) سلسلۂ اسیر و امیر و شاگردان اسیر و امیر (۱۱) سلسلۂ آتش و صبا و شاگردان آتش و صبا (۱۲) سلسلۂ ناسخ و شاگردان ناسخ باستثناے وزیر، رشک، برق (۱۳) سلسلۂ برق و رشک و وزیر (۱۴) سلسلہ غالب۔

دوسرے حصے میں مندرجہ بالا سلاسل کے شعرا کی فہرست کے علاوہ اساتذۂ متفرق کی فہرست بھی دی ہوئی ہے اس فہرست میں شعرا کا تخلص، نام مولد و مسکن اور ان کے دیوان کی کیفیت (یعنی مطبوعہ ہے یا قلمی) درج ہے۔

تیسرے حصے کے متعلق حسرت نے جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۳۰ع کے اردوے معلی میں لکھا ہے کہ «قریب قریب کل صاحب سلسلہ شعرا کا حال ۱۹۰۳ع سے ۱۹۳۰ع تک اردوے معلی میں درج ہو چکا ہے»۔[1] حسرت کا یہ دعوی صرف ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ بہت سے اہم اساتذہ جیسے ولی، میر، درد، ناسخ اور آتش وغیرہ کا ترجمہ نہیں لکھا گیا ہے۔ چونکہ تیسرا حصہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے، اس لئے ان شعرا کی فہرست جن کا تذکرہ حسرت نے خود لکھا ہے یا دوسروں سے لکھوایا ہے، ضمیمہ کی شکل میں اس مقالے کے آخر میں شامل کردی گئی ہے۔

حسرت نے شعرا کے حالات کی فراہمی میں بقول خود «دواوین اساتذہ و بیاضہاے متفرق و دیگر ذرائع مختلف» کے علاوہ مندرجہ ذیل تذکروں سے مدد لی ہے:

۱ نکات الشعرا از میر تقی میر
۲ تذکرۂ الشعرا از غلام ہمدانی مصحفی
۳ طبقات شعراے اردو، ترجمہ کتاب دی تاسی مصنف فرانس

---

۱ اردوے معلی، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۳۰ع ص ۱

۴ تذکرۂ جلوۂ خضر از سید فرزند احمد صفیر بلگرامی
۵ تذکرۃ الشعرا از حکیم قدرت اللہ قاسم
۶ تذکرۃ الشعرا (گلشن بےخار) از نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ
۷ تذکرۂ سخن شعرا از عبد الغفور نساخ
۸ نغمۂ عندلیب از حکیم قطب الدین باطن
۹ تذکرۂ طور کلیم از نور الحسن خاں صاحب کلیم
۱۰ تذکرۂ بزم سخن از علی حسن خاں صاحب
۱۱ تذکرۂ آب حیات از آزاد[1]

محولہ بالا تذکروں کے علاوہ حسرت نے چند دوسرے تذکروں سے بھی مدد لی ہے، جن کے حوالے بعض شعرا کے ذکر میں ملتے ہیں جیسے، تذکرۂ فتح علی شاہ،[2] تذکرۂ قائم،[3] تذکرۂ شاہ کمال،[4] تذکرۂ میر حسن،[5] تذکرۂ گلشن ہند[6] وغیرہ۔

اس طرح انہوں نے اردو کے تقریباً تمام دستیاب تذکروں سے استفادہ کیا ہے اور شعرا کے حالات کی فراہمی میں بڑی تحقیق و تلاش سے کام لیا ہے۔ اس کے باوجود حسرت کے یہاں چند غلطیاں ملتی ہیں جیسے (۱) انہوں نے آب حیات کی تقلید میں مرزا مظہر کا نام جان جاناں[7] لکھا ہے جبکہ ان کا صحیح نام جان جاں ہے۔ (۲) بنواری لال شعلہ کو تلامذۂ غالب میں شامل کرایا ہے[8] جو صحیح نہیں[9] (۳) غالب کو نظیر اکبرآبادی کا شاگرد بتایا ہے[10] جو روایت یا درایت دونوں پہلوؤں سے ثابت نہیں ہوتا[11] (۴) میر مہدی مجروح کو پانی پت کا باشندہ بتایا ہے،[12] حالانکہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور غدر کے زمانے میں عارضی طور پر پانی پت

---

۱ اردوئے معلی، جولائی ۱۹۰۳ء، ص ۳۔
۲ اردوئے معلی، فروری، مارچ ۱۹۰۷ء، ص ۹ [حاشیہ]
۳ تا ۶ اردوئے معلی، فروری تا جون ۱۹۳۰ء، ص ۴۔
۷ اردوئے معلی، فروری مارچ ۱۹۰۷ء، ص ۱۔
۸ اردوئے معلی، ستمبر ۱۹۱۲ء، ص ۴۔
۹ مالک رام، تلامذۂ غالب، دیباچہ، ص ۷۔
۱۰ حسرت موہانی، دیوان غالب مع شرح [طبع سوم] مقدمہ، ص ۲ و ۳۔
۱۱ مالک رام، ذکر غالب، [اشاعت چہارم] ص ۳۸۔
۲۱ اردوئے معلی، اگست ۱۹۰۵ء، ص ۲۔

چلے گئے تھے[۱۳] لیکن ایسی غلطیوں کی تعداد بہت کم ہے ۔

حسرت نے خاندان مومن و نسیم کے شعرا اور اپنے معاصر شعرا کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بیشتر ذاتی معلومات پر مبنی ہے ۔ وہ چونکہ خاندان مومن و نسیم دہلوی سے تعلق رکھتے تھے اس لئے اس خاندان کے شعرا سے ان کو ایک دلی لگاؤ تھا اور ان میں سے اکثر سے ان کے نجی تعلقات تھے ۔ معاصر شعرا میں سے بھی بیشتر سے حسرت کے ذاتی تعلقات تھے اور ان سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ خط و کتابت بھی رہتی تھی ۔ اس لئے ان شعرا کے متعلق ان کا تذکرہ ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

(باقی)

***

۱۳ مالک رام ، تلامذۂ غالب ، ص ۲۵۲ ۔

٭ ذاکر حسین فاروقی

منیر شکوہ آبادی

۳

ہندوستان آنے کے بعد منیر نے دیکھا کہ یہاں کی تو دنیا ہی بدل چکی ہے۔ تاجوروں کے سروں سے تاج چھن چکے۔ مسند نشین بوریا نشین ہو گئے۔ امراء خاک بسر، شرفا در بدر، ارباب ہنر بیکار، صاحبان علم بیروزگار، عالی گہر دانہ دانہ کو محتاج، شریف زادیوں کو سر چھپانے کی احتیاج، ارباب وطن کی نگاہیں بدلی ہوئی، یہ حالات دیکھ کر دل پر ایک چوٹ لگی۔ ان کے خون شدہ دل کی تصویریں صفحۂ قرطاس پر یوں بکھریں:

دل تو پژمردہ ہیں داغ غم گلستاں ہوں تو کیا
آنکھیں روتی ہیں دہاں زخم خنداں ہوں تو کیا

لاکھوں گل‌رو داغ حسرت لے گئے زیر زمیں
باغ عالم میں اگر دو پھول خنداں ہوں تو کیا

ہو گئے برباد شاہان سلیماں منزلت
اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا

گیسوؤں والے تو لاکھوں ہو گئے پیوند خاک
ان کے مرقد سے جو پیدا سنبلستاں ہوں تو کیا

فرش خواب اب اہل مسند کو نہیں ہوتا نصیب
بوریا باف آج زیبِ تختِ سلطاں ہوں تو کیا

بیگمیں شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب
اب چڑیلیں صاحبان قصر و ایواں ہوں تو کیا

٭ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی لکھنوی، بی۔ اے، پی ایچ۔ ڈی: استاد اردو، مہاراشٹر کالج، بمبئی: مصنف دبستان دہلی و داستان اردو

مسجدیں ٹوٹی پڑی ہیں صومعہ ویران ہیں
یاد حق میں ایک دو دلہائے سوزاں ہوں تو کیا

لٹ گئے قصر مرصع کھد گئے زریں محل
رنج سے معمور اگر دلہائے سوزاں ہوں تو کیا

دانہ دانہ کے لئے محتاج ہیں عالی گہر
اشک حسرت اپنے مروارید غلطاں ہوں تو کیا

صوفیان صاف طینت واصل حق ہو گئے
خود نما دو چار ننگ اہل عرفاں ہوں تو کیا

کاملوں کو کردیا برباد تو نے اے فلک
چند نالائق ترے ممنون احساں ہوں تو کیا

جاں بلب ہیں غم سے استادان فن نظم و نثر
مطمئن اس عہد میں دس بیس ناداں ہوں تو کیا

منعم و فیاض ہیں محتاج نان خشک کے
خاکروبوں کو میسر خوان الواں ہوں تو کیا

پھرتے ہیں آوارہ خضر جادۂ اہل کمال
مدعی علم و دانش چند ناداں ہوں تو کیا

بھیڑیوں سے بچ رہے جو چند یوسف اے فلک
خانماں برباد اسیر بند و زنداں ہوں تو کیا

نوحہ گر ہیں قاضیان و مفتیان اہل عدل
چند نامنصف پناہ اہل دوراں ہوں تو کیا

عالمان باعمل تو پیتے ہیں خون جگر
راحتوں میں رہزنان دین و ایماں ہوں توکیا

بے کفن وہ ہیں کہ شان میرزائی جن میں تھی
سوگ میں صد چاک داماں و گریباں ہوں تو کیا

بجھ گئیں شمعیں، جلیں پروانے تو کیا فائدہ
اڑگئے پروانے، شمعیں نورافشاں ہوں تو کیا

دیکھنے والے نہیں آئینے پھر کس کام کے
بے زلیخا شہر سارے یوسفستاں ہوں تو کیا
روئیے کس کس مزہ کو یاد کر کے اے فلک
زخم دل پر سینکڑوں خالی نمکداں ہوں تو کیا

ہندوستان کے حالات پر ایک اور غزل مسلسل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جس بزم جانفزا میں ابھی کل کی بات ہے　　خالی سرور سے دل پیر و جواں نہ تھا
فرش لطیف دامن نظارہ سے لطیف　　ذی رتبہ میر فرش سے تاج شہاں نہ تھا
فانوسیں تھیں گلوے پریزاد سے سوا　　روشن تھیں صاف نور کی شمعیں دھواں نہ تھا
پر روشنی تھی برق تجلی سے آشنا　　بیگانہ شمع طور سے اک شمعداں نہ تھا
پھولوں کی ہر طرف تھیں ہزاروں مسہریاں　　بیدار بخت خواب مسرت کہاں نہ تھا
میوے کی ڈالیاں، کہیں پھولوں کی ڈالیاں　　سرسبز جن کے سامنے باغ جناں نہ تھا
آب گہر کی موج تھی، پر نہر سے بلند　　فوارہ وہ نہ تھا کہ جو گوہرفشاں نہ تھا
ارباب عیش کی کہوں کیا خوش سلیقگی　　وہ کون تھا کہ ہمسر شائستہ خاں نہ تھا
پریونکے جھنڈتھے کہیں جھرمٹ حسینونکے　　محبوب جن کے آگے مہ آسماں نہ تھا
فتنہ کے عطر کو سر مو بھی جگہ نہ تھی　　آشفتہ کوئی گیسوے عنبرفشاں نہ تھا
چھائے ہوئے تھے چنپی رنگوں کے قہقہے　　جن سے شگفتہ تر چمن زعفراں نہ تھا
وہ بزم دلفریب تھی ایسی کہ رات بھر　　رنج و ملال کے لئے رستہ جہاں نہ تھا

دیکھا اسی طلسم خوشی کو جو صبح دم
جز چغد اور کوئی وہاں نوحہ خواں نہ تھا

منیر کے قلب و ذہن پر انقلاب سنہ ۵۷ ع اور ہندوستان کی تباہ حالی کا ایسا اثر پڑا تھا کہ وہ اسے مرتے دم تک فراموش نہ کر سکے چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا تذکرہ بڑے پرسوز انداز میں کرتے ہیں۔ خالص عشقیہ اور رسمی غزلوں میں بھی اچانک ہندوستان کی پامالی کا مرثیہ شروع کردیتے ہیں مثلاً

ہندوستان بھر میں ہے ماتم معاش کا　　جس گھر میں دیکھتا ہوں یہی ہائے ہائے ہے
کعبہ کو شیخ بیچے جو گاہک کوئی ملے　　صید حلال چشم برہمن میں گائے ہے
دعوت میں جو رئیس تکلف بہت کرے　　پینے کو آب گرم ہے یا سرد چائے ہے
نادان سر جھکاتے ہیں دولت کے سامنے　　گوسالہ سامری کا نظر میں یہ گائے ہے

منیر کو انڈمان کی قید سے تو نجات مل گئی تھی لیکن اب عالم یہ تھا کہ الہ آباد میں دانہ دانہ کو محتاج تھے۔ زندگی بھر حرماں نصیبی، تیرہ بختی اور قسمت کی ناسازگاری کا شکار رہنے کے باوجود نہ ہمت کی کمر شکستہ تھی اور نہ عزم کی گردن خم۔ معراج المضامین میں انھوں نے اپنی تباہ حالی، خانہ ویرانی، ذلت و مسکنت، افلاس و تنگ دستی اور مصائب و ابتلا پر خدا کی بارگاہ میں مناجات پیش کی ہے لیکن انتہائے کسرنفسی کے باوجود اپنا طنطنہ قائم رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:

خدا وندا ترا عبداقل ہوں　　اسیر حلقۂ طول امل ہوں
سیہ کاری میں خال روئے ظلمات　　کجی میں حلقۂ گیسوے ظلمات
سواد نامہ اعمال فاسق　　سیہ کاری کی خاطر لیل غاسق
شکست توبہ کی بنیاد مجھ سے　　بنائے خیر کی افتاد مجھ سے
سر سر کش نہیں سجدے سے واقف　　گرا بھی ہوں تو قبلہ سے مخالف
وظیفہ ہے مرا شعر و معما　　نماز و روزہ اسم بے مسما
صبوحی صبحدم اپنا وظیفہ　　بیاض گردن مینا صحیفہ
مری مسجد ہے ہر محراب ابرو　　تلاوت میں ہمیشہ مصحف رو
جوانی تھی بنائے ضعف ایماں　　ہوئی پیری شباب عمر عصیاں
مرے باعث ہے بخت فتنہ بیدار　　مرا اقبال فرش راہ ادبار
خرابی کی جو بستی ہے تو مجھ سے　　عروج بخت پستی ہے تو مجھ سے
متاع خانۂ سیلاب بردہ　　چراغ قبر حسرت ہائے مردہ
میں ہوں مفلس کا دن بے خواب کی شب　　سحر پروانہ کی سرخاب کی شب
مدار گردش چرخ کہن ہوں　　بلائے ناگہانی کا وطن ہوں
مرا دل ہے پناہ یاس و حرماں　　میں ہوں امید گاہ یاس و حرماں
ہجوم زخم خنداں بزم شادی　　مرا نالہ عصائے نامرادی
نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی　　پسند آئی ہے صحبت بے کسی کی
ٹھکانا بے دیاری کا ہے مجھ سے　　بھرم بے اعتباری کا ہے مجھ سے
پڑا ہے طالع ناکام سے کام　　وثیقہ بے زری کا ہے مرے نام
نہیں ہے آبرو کچھ میری اصلا　　مگر اتنی کہ اشک چشم عنقا
نہ عزت ہی نے مورلنگ سمجھا　　مجھے تو عار نے بھی ننگ سمجھا

تاکید الذم بمایشبہ المدح کی صنعت میں معلوم یہ ہوتا ہے
کا ایک طوفان ہے جو امنڈتا چلا آ رہا ہے۔ کہنا صرف اتنا تھا کہ
بد اعمال ہوں، پریشان روزگار ہوں، غریب الدیار ہوں، لیکن عجزو
اس اظہار میں بھی اپنے شاعرانہ پندار کو قائم رکھا ہے۔ اعتراف قد
تیکھے پن کے ساتھ۔ معبود برحق کے حضور میں اظہار عبدیت ہے مگر
کے ہمراہ۔ خود اپنی ہجو کی ہے لیکن ایسے تیوروں سے کہ قصیدہ
خود اپنا مرثیہ کہا ہے لیکن جہاں اس میں سوز اور تڑپ ہے وہیں
بھی ہے کہ پڑھنے والا اس غم میں لذت محسوس کرتا ہے۔

دو سال الہ آباد میں بیروزگاری اور فاقہ مستی کے دن گذارنے
خبر ملی کہ ولیعہد رام پور کا عقد ہونے والا ہے۔ انہوں نے موقع
کے نواب کلب علی خاں والئی رام پور کی خدمت میں ایک عریضہ مع
عقد ارسال کیا اس عریضہ میں بڑے پردرد اور پرتاثیر انداز میں اس
اور تیرہ بختی کی شکایت کی ہے جس کے وہ برسوں سے شکار تھے
آمد اور خلاقی قابل توجہ ہے۔

گزارش ہے ادا سنج ادب کی — گزارش ہے فقیر جاں بل
فغاں کی ہے تبسم سے گزارش — لب تشنہ کی قلزم سے
تپش کی ہے تسلّی سے شکایت — اندھیرے کی تجلّی سے
جفا سے دیو کی ہے جم سے نالش — دلِ زخمی کی ہے مرہم سے
سماعت سے ہے نالہ کی گزارش — مہ تاباں سے ہالہ کی
نیاز تشنہ لب دریا کو پہنچے — درود نیم جاں عیسیٰ کو
دعائے سجدہ کعبہ تک رسا ہو — مناجات زمیں عرش آ
زبونی طالب فرخندگی ہے — خداوندی سے عرض بند
کہ میں ہوں اک خس طوفانِ غم — شرار نالۂ زندانی
دل سوزاں میں آہ نارسا ہوں — سیہ خانہ میں نقش بو
دل پر درد میں راز نہفتہ — زباں عجز پر حرف
گہر ہوں میں توزیر سنگ ہوں میں — ہوں آئینہ تو رہن زنگ

بیابان خرابی مجھ سے معمور جہاں کس‌مپرسی میں ہوں مشہور
قدح نوش سر شک چشم تر ہوں نمک خوار جراحات جگر ہوں
چراغ صبح کی سی روشنی ہوں مہ داغ جگر کی چاندنی ہوں
بنی ہے ناامیدی میری درباں مرے گھر پاس ہے ناخوانده مہماں

منیر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ذہن میں مضامین کی خلاقی کا مادہ بڑی شدت سے موجود تھا ۔ معلوم ہوتا ہے جیسے مضامین کے پرے کے پرے ہاتھ باندھے سامنے موجود ہیں اور یہ شہنشاہ معانی انہیں الفاظ کی قید میں اسیر کرتا جاتا ہے ۔ ذرا سی بات ہوتی ہے تو اسے سو طریقہ پر نظم کرتے ہیں معمولی سی بات میں بھی درجنوں مضامین ایجاد کر دیتے ہیں ۔ متذکرہ بالا اشعار بھی ان کے اسی ملکۂ مضمون آفرینی و آمد مضامین کا ایک واضح ثبوت ہیں ۔

اس عریضۂ میں جہاں غدر کے ہاتھوں اپنے قدر داں امرا کی تباہی کا تذکرہ بڑے گریہ خیز انداز میں کیا ہے وہیں جن لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر نو نئی دولت حاصل کی تھی ان پر بڑی سخت چوٹیں کی ہیں :

جو نو دولت تونگر کچھ ادھر ہیں وہ نا پرساں ارباب ہنر ہیں
جہاں ان کا ہے عـــرش کبریائی فرشتہ کی وہاں مشکل رسائی
سخاوت کو کہیں اصراف بے جا عروس بخل پر تقوے کا پردا
جو سائل مستحق بھی ہو کرم کا تو ہو ذر کو کہیں بندہ درم کا
اگر دیدیں کسی کو ایک پائی توسمجھیں بخش‌دی‌ساری خدائی
نماز پنجگانـــہ پرہیں نازاں خدا کو کرتے ہیں ممنون احساں
دورنگی ان کی ظاہر کرسکے کون لباس حضرت موسیٰ میں فرعون

منیر نے ولیعہد کے عقد کے جو قطعات تاریخ روانہ کئے تھے ان میں ایک غیر منقوط اور ایک ذوبحرین تھا ۔ ایک قطعہ کے مصرع تاریخ سے بیک وقت عیسوی اور ہجری سن نکلتے تھے اور لطف یہ ہے کہ نہ تعمیہ کی ضرورت ، نہ تخرجہ کی حاجت۔ نواب کلب علی خاں ان سے بہت متأثر ہوئے ۔ منـــیر رام پور بلائے گئے اور ۱۲۸۷ع سے باقاعدہ دربار رام پور سے منسلک ہو گئے ۔

نواب کلب علی خاں بڑے علم دوست اور ہنر پرور رئیس تھے ۔ دہلی اور لکھنؤ کے ادبی مراکز کے اجڑ جانے کے بعد انہوں نے اپنے جود وکرم کی بدولت رام پور

کو اردو شعرا و ادب کا مرکز بنا دیا تھا۔ جلال ، اسیر ، امیر ، داغ اور دوسرے کئی اساتذہ ان کے دربار سے وابستہ تھے ۔ منیر نے ایک کا ذکر کیا ہے ۔

مجمع شاعـــران نامی ہے شاعری کی ہے گرم با
بحر ، منشی ، اسیر اور امیر ہمسر انوری و مختہ
طبع پاک عروج و داغ سے ہے منفعل ابر کی گہر
ہے جلال و حیا وشاغل سے محفل نظم جلوہ گر
مثنوی میں صبا و خواجہ بشیر رونق شاعری و نثہ
بدر ، شادان ، غمیں ، غنی ہردم رہتے ہیں مدح خوان سر
فارسی گو نثار شیرازی تر زبانی میں ابر آز
فن تاریخ میں رسا منصور جان صاحب کی ریختی پ
سب سے بڑھ کر منیر کو حاصل بیکمالی و ہرزہ گفتہ

شعرا کے علاوہ دربار میں ممتاز علما ، اطبا ، حفاظ ، مفتی او بہترین فنکار موجود تھے اور رام پور مجمع ارباب کمال بن گیا تھا ۔ قصائد میں ان لوگوں کا تذکرہ موجود ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا کلب علی خاں کے عہد کا رام پور علم ، ادب ، شعر اور فن کا ایک جس نے ارباب علم کے دلوں سے اودھ کا دربار اٹھ جانے کا غم ب

منیر دربار رام پور سے منسلک تو ضرور ہو گئے تھے لیکن رام پور میں رہتے نہیں تھے ۔ کبھی فرخ آباد میں ہیں تو کبھی کانپور ، آباد میں ہیں تو کبھی لکھنؤ میں ۔ یہی وجہ ہے کہ آخر تک افلاس کا شکار رہے ۱۲۹۴ھ میں قحط پڑا ۔ بہت سختی کا زمانہ تھا ۔ اناج اور دودھ نایاب ، جیب خالی ، اس پر طرفہ ستم یہ کہ ماہ رمضان بڑی تکلیف اٹھائی ۔ لیکن چونکہ مصائب پر مسکرانا اور ہنس کے فطرت کا جزو بن چکا تھا اس لئے قحط کے تذکرہ میں بھی جہاں حزن کا اظہار ہونا چاہئے تھا انہوں نے بڑا پرلطف انداز بیان اختیار مندرجۂ ذیل رباعیاں ملاحظہ ہوں :

اس قحط کے مارے زخم خنجر کھالیں　　تلوار کے پھل سب اہل جوہر کھالیں
بچے بھی یہ چاہتے ہیں ہو جائیں ادھیڑ　　کھچڑی جو ہوں اپنے بال چن کر کھالیں

ماہ رمضان میں فاقے ہیہات ہوئے　　گھی گوشت سے محروم یہ دفعات ہوئے
کوڑی بھی نہ خرچ کی بنے زاہد خشک　　کیا مفت میں ہم تارک لذات ہوئے

غلہ سے ہے ہر کشت تمنا خالی　　ہاتھوں کی طرح پیٹ ہے سب کا خالی
سب بھوک کے مارے قحط میں مرتے ہیں　　دوزخ نہ بھرا ہو گئی دنیا خالی

کیا قحط میں آ گئی تباہی اس سال　　پیاسے مرتے ہیں مرغ و ماہی اس سال
شبنم سے بھی ہے باغ جوانی محروم　　کیوں کر بھیگیں مسیں الٰہی اس سال

ہے قحط بھی ابکی تنگدستی بھی ہے　　ماہ رمضان بھی فاقہ مستی بھی ہے
روزہ میں منیر کیوں نہ افیون ہو کم　　ان روزوں حرام کیف ہستی بھی ہے

سنہ ۱۲۹۶ھ میں آفتاب الدولہ قلق کے زیر اہتمام منیر کا کلیات شائع ہوا اور ۴ رمضان سنہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ع کو یہ آفتاب شاعری ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ اکثر تذکروں میں ان کا سال وفات سنہ ۱۸۸۱ع درج ہے لیکن یہ غلط ہے۔ ان کے انتقال کی جو تاریخ ان کے شاگرد رشید بزم آفندی نے کہی ہے ، ع:

چراغ شاعری گل ہو گیا اب

اس سے سنہ ۱۸۸۰ع نکلتے ہیں۔
ان کے انتقال کی ہجری تاریخ ہے : انتقال منیر عالی قدر سے جس سنہ ۱۲۹۷ نکلتا ہے۔

منیر بڑے باکمال شاعر تھے۔ ان کا موازنہ اگر اردو کے کسی شاعر سے کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف سودا ہیں۔ انہوں نے غزل بھی کہی ، قصائد بھی کہے ، مثنویاں بھی کہیں ، رباعیاں بھی کہیں ، تاریخیں بھی کہیں ، مراثی بھی کہے۔ غرض ہر صنف کلام میں داد سخنوری دی اور کمال یہ ہے کہ ہر صنف میں اپنی استادی کی شان قائم رکھی۔ ان کے تین دیوان ، دو مثنویاں اور قصائد کا ایک مجموعہ آج بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں ان کے دو دیوان چوری ہوگئے۔ تیسرا دیوان انہوں نے کانپور میں ایک صاحب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ چوتھا دیوان بھی افلاس سے تنگ آکر بیچ ڈالا۔ دو ضخیم مثنویاں بھی فروخت ہو گئیں۔ اس طرح

تقریباً بارہ ہزار اشعار کا سرمایہ یا تو چوری ہو گیا اور یا پھر فروخت ہوگیا۔ ہزارہا اشعار پر مشتمل تقریباً ڈیڑھ سو مراثی انہوں نے ایک دوست کو بخش دئیے تھے جنھوں نے اسے ایک مالدار متشاعر کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہ بھی دستبرد زمانہ کے ہاتھوں ختم ہوگئے۔ اگر یہ سارا کلام محفوظ رہتا تو ساٹھ ہزار شعر سے کم نہ ہوتے اس لئے کہ اس وقت بھی ان کا جو کلام ہمارے سامنے موجود ہے وہ پینتیس(۳۵) ہزار اشعار سے کم نہیں ہے۔ اکثر و بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کے اشعار کی تعداد ۲۹ ہزار لکھی ہے۔ یہ وہ تعداد ہے جو انہوں نے معراج المضامین میں بتائی ہے۔ لیکن معراج المضامین سنہ ۱۲۸۶ھ مین لکھی گئی تھی اور منیر سنہ ۱۲۹۷ھ تک زندہ رہے۔ اس دوران مین انہوں نے ایک مثنوی، متعدد قصائد اور درجنوں غزلیں کہیں جن کے اشعار بہرحال اس تعداد پر مستزاد ہیں جو معراج المضامین میں بتلائی گئی ہے۔

اتنا بڑا ذخیرۂ کلام بجائے خود ان کی قادر الکلامی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس عظیم مجموعہ میں موتی بھی ہیں اور خذف ریزے بھی؛ ہیرے بھی ہیں اور کنکر بھی لیکن یہ صرف منیر ہی پر موقوف کیوں؟ کس استاد کا کلام اس ناہمواری سے خالی ہے؟ سب کے یہاں جہاں بلندش بسیار بلند کے نمونے ملتے ہیں وہیں پستش بغایت پست کے نمونے بھی پائے جاتے ہیں۔

منیر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی مضمون آفرینی ہے۔ وہ بےحد ذہین تھے اور مضامین کے انبار لگاتے چلے جاتے تھے۔ وہ ایک ہی بات کو سو طریقوں سے کہتے ہیں اور ہر مرتبہ ایک نیا مضمون پیدا کر دیتے ہیں۔ نئی اور نادر تشبیہوں اور نئے نئے استعاروں کی ایجاد میں انہیں ید طولیٰ حاصل ہے اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جتنی نئی تشبیہیں، استعارے اور نئے مضامین ہمیں ان کے یہاں ملتے ہیں، اردو کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتے۔ ان کی ذہانت، طباعی کسی مقررہ حد میں محدود رہنے پر آمادہ نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جس طرح سودا نے ہئیت، اسلوب اور مواد میں نئے نئے تجربات کئے ہیں، اسی طرح منیر نے بھی روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ہئیت، اسلوب اور مواد میں تجربے کئے ہیں۔ ان سے قبل ہمارے کسی مستند استاد نے ادب میں سیاست اور وقتی یا ہنگامی مسائل کو جگہ نہیں دی تھی لیکن انہوں نے

قصائد اور مثنویوں کے علاوہ غزلوں تک میں سیاسی مسائل کو داخل کیا۔ یہ ان کا ایک ایسا اجتہاد فکر ہے جس کی آج عام طور پر تقلید کی جا رہی ہے اسی طرح آج جسے نظم کہا جاتا ہے وہ ان کے یہاں غزل مسلسل کی شکل میں موجود ہے۔ ان کے کلام سے ان کے عہد کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی زندگی کا ایک پورا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے بلکہ اس دور کی ایک اچھی خاصی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، یہ صفت بھی ان کے علاوہ ان کے کسی ہم عصر یا کسی پیشرو کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

منیر نے محض مواد ہی میں تجربے نہیں کئے بلکہ ہیئت میں بھی تجربے کئے، حتیٰ کہ شاید وہ پہلے مسلّم الثبوت استاد ہیں جس نے وہ نظم معریٰ یا آزاد نظم بھی کہی جو دور حاضر کی ترقی پسندی کی دین تصور کی جاتی ہے۔ آغا سید حسن علی خان کے لڑکے کی وفات پر انہوں نے جو تعزیت نامـــہ روانہ کیا ہے وہ اسی «آزاد نظم» کا ایک نمونہ ہے۔ منیر کے دور میں اس قسم کی نظم کو «نثرمرجز» کہا جاتا تھا اور کوئی مستند استاد اس نثر مرجز کو نظم کہہ کے پیش کرنے پر تیار نہیں تھا۔ لیکن منیر نے اپنے عہد کے مروجہ تصورات کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے نظم کے روپ میں پیش کیا جو ان کے اجتہاد فکر اور جدت نگاہ کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

منیر جہاں روایت سے بغاوت اور فکر و نظر کی آزادی کے شدت سے قائل تھے وہیں اپنے استاد رشک کے قواعد کی پابندی میں اتنے متشدد تھے کہ بعض اوقات اپنی شاعری کو محض قواعد پر قربان کردیتے تھے۔ رشک کا یہ فیصلہ تھا کہ جس قافیہ میں نون آخری حرف ہو اس میں عطف و اضافت لائیں تو اعلان نون نہیں ہوگا اور اگر عطف و اضافت نہ ہو تو اعلان نون واجب ہوگا۔ منیر نے ایک مرتبہ رشک کو اپنی ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا:

گنـــبد قبر عاشقـان ٹوٹے اے زمیں تجھ پر آسماں ٹوٹے

رشک نے کہا، شعر اچھا ہے۔ مگر آسمان ٹوٹے بولتے ہیں، آسماں ٹوٹے کوئی نہیں بولتا۔ اس لئے دوسرا مصرع بدلو منیر نے مصرع تو کیا پورا شعر ہی بدل دیا اور اب ان کے کلیات میں یہی شعر یوں نظر آتا ہے:

روز دلہـائے مے کشاں ٹوٹے اے خدا جام آسماں ٹوٹے

ظاہر ہے کہ اس تبدیلی سے مطلع ستیاناس ہو گیا۔ اصل مطلع میں نون نہ سہی لیکن بڑا خوبصورت مطلع تھا۔ مگر اخفاے نون کے ساتھ جو کہا گیا ہے اس میں کوئی بات یا کوئی حسن نہیں پایا جاتا۔

نواب کلب علی خاں نے ایک مرتبہ ناسخ کے اس مصرع کو طر دیا: طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اور یہ قید لگائی کہ غزل میں کم از کم ایک شعر گریباں کے قافیہ میں ضر چاہئیے، منیر نے عذر کیا کہ میں اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق عطف و کے بغیر یہ قافیہ استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر عطف و اضافت کے بغیر ا کروں گا تو اعلان نون واجب ہو جائےگا اور اس صورت میں مصرع ناموزوں نواب نے فرمایا کہ خیر، آپ غزل کہیں اور اپنے استاد کے قاعدہ کی پابندی چنانچہ منیر نے ۷۳ شعر کی غزل کہی اور ہر شعر میں گریباں کا قافیہ نظم وہی کہ کہیں عطف کا پیوند ہے اور کہیں اضافت کی پخ۔ آخری دو اشعہ اپنی مشکل کا اظہار یوں کرتے ہیں:

خداوند نعم کے حکم سے چارہ نہ تھا ورنہ نہ کہتا یہ غزل ہی ذکر کیا جیب و گریبا
منیر افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے وگرنہ لطف دکھلاتا مضامین گریبا

اس سلسلہ میں یہ وضاحت کردینا ضروری ہے کہ منیر نے یہ لزوم صرف غزل تک محدود رکھا ہے۔ قصائد اور مثنویوں میں اس کی پابندی نہیں

استاد کا یہ احترام اس زمانہ کی تہذیب کا جزو تھا اور منیر چونکہ طور پر مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے اس لئے ہمیں اس معاملہ میں انہیں تصور کرنا چاہئیے۔ مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ میں اگر وہ رشک کے اصول نہیں کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دوسرے استاد مرزا د قسم کی پابندیوں کے سخت مخالف تھے اور مرزا صاحب کا یہ حکم تھ چاہیے غزل میں رشک کے اصول پر عمل کرتے رہیں لیکن دوسرے اصنا میں ہرگز یہ اصول نہ برتیں۔ چنانچہ منیر ایک سعادت مند شاگرد کی حی زندگی بھر دونوں استادوں کی ہدایت پر عمل کرتے رہے۔ غزل میں ہمیشہ اضافت کے ساتھ اخفاے نون کرتے رہے اور دوسرے اصناف سخن میں قید کے قائل نہیں ہوئے۔ ان کی یہ وضع‌داری ہمارے دور میں خواہ کتنی

اعتراض کیوں نہ سمجھی جائے لیکن پرانی تہذیب میں بہر حال اس کا ایک خاص مقام تھا اور ہمیں اس پر اسی زاویہ سے غور کرنا چاہئیے ۔

منیر کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت اپنے فن سے ان کا خلوص اور لگاؤ ہے ۔ وہ شاعر تھے اور شاعری اُن کی زندگی تھی ۔ انہیں فن شعر سے عشق تھا ۔ خود شعر کہتے تھے ۔ دوسروں کو شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے ہر شاعر کا احترام کرتے تھے اور ہر استاد کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے ۔ انہوں نے کبھی اپنے معاصرین پر تنقید نہیں کی اور معاصرانہ چشمک کے جذبہ سے ان کا دل ہمیشہ پاک رہا ۔ انہیں شاعری کا چلتا پھرتا اسکول کہنا بجا ہو گا ۔ جہاں جاتے تھے وہاں شعر و سخن کا چرچا عام کر دیتے ۔ ان کے درجنوں شاگرد تھے جن کے کلام پر پابندی سے اصلاح دیتے تھے اور ہر طرح ان کی ہمت افزائی ضروری تصور کرتے تھے ۔ ان کے متعدد شاگرد صاحب دیوان ہوئے ہیں ۔ کانپور ، فرخ آباد ، الہ آباد اور باندہ کو انہوں نے اپنی فیض تربیت سے اردو شاعری کے بڑے مراکز میں تبدیل کر دیا تھا ۔ جس زمانہ میں انڈمان کی قید کے شدائد جھیل رہے تھے اس زمانہ میں بھی شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کا مشغلہ جاری رہا اور یہ بجائے خود اس خلوص کا ثبوت ہے جو انہیں شعر و شاعری سے تھا ۔ وہ ایک چـــراغ تھے جس سے درجنوں چراغ روشن ہوئے اور یہ ان کی ایک ایسی عظیـم ادبی خدمت ہے جسے کسی حـالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

ان کے شـاگردوں میں بزم اکبرآبادی ، شہیر مچھلی شہری ، کلیم لکھنوی ، جوہر فرخ آبادی ، ضو بدایونی ، نیسان الہ آبادی وغیرہ نے بہت شہرت حاصل کی ۔ ان کے شاگرد متعدد شہروں میں پھیلے ہوئے تھے اور ان کی وجہ سے ملک کے مختلف علاقوں میں اردو زبان و ادب کی خو اشاعت ہوئی اس کا سہرا بھی منیر ہی کے سر ہے ۔

منیر صرف شاعر نہیں تھے ، نثر نگار بھی تھے ۔ انہوں نے ایک داستان لکھی تھی جو ان کے انتقال کے بعد آگرہ کے ایک رسالہ میں قسط وار چھپی تھی ۔ وہ مضامین بھی لکھتے تھے اور ان میں زیادہ تر مقفیٰ و مسجع عبارت استعمال کرتے تھے ۔ عبدالغفور خان نساخ نے انتخاب نقص کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں انیس ، دبیر ، ناسخ وغیرہ پر اعتراضات کئے تھے ۔ یہ کتاب ۱۲۹۶ میں شائع ہوئی تھی ۔ منیر نے قلم برداشتہ سنان دل خراش کے نام سے اس کا تفصیل

جواب لکھا ۔ سنان دلخراش تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۶ نکلتے ہ
تصانیف کے علاوہ انہوں نے اعلان الحق ، سراج المنیر ، تنبیہ النشأتین اور
نام کی مذہبی کتابیں بھی لکھی تھیں جو غدر کے ہنگامہ میں ضائع ہ
لغت بھی مرتب کیا تھا ۔ لیکن وہ بھی شائع نہیں ہو سکا ۔

ہمارے کلاسیکل اساتذہ میں صرف سودا اور منیر دو ایسے بزرگ
نے ہر صنف سخن میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے نمونے پیش کیے ہیں
یہ ہے کہ ہر صنف میں اپنا پایۂ استادی قائم رکھا ہے ۔ میر، درد، مص
اور غالب محض غزل کے شاعر ہیں ، دوسرے اصناف سخن میں ان کی
محض ہیں ۔ ذوق اور مومن نے غزل اور قصیدہ دو اصناف میں اپنے ک
کیا ہے ۔ آتش ، ناسخ ، رند ، وزیر، صبا ، رشک ، خلیل اور بیشتر
محض غزل تک محدود رہے ۔ حسن ، نسیم، شوق اور قلق نے صرف مث
کمال کا اظہار کیا ۔ ضمیر، دبیر اور انیس نے مرثیہ گوئی میں نام کما
صرف سودا اور منیر کو حاصل ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ہ
میں داد سخنوری دی بلکہ ہر صنف کو اپنی جودت طبع ، ذہانت اور
سہارے آسمان پر پہنچا دیا ۔ منیر کے لئے یہ فخر کم نہیں کہ غزل
قصیدہ کا ، مثنوی کی بات چھوڑے یا رباعی کی ، مرثیہ پر بحث ہو یا ت
ہر صنف سخن کے سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ ان کا نام آتا ہے بلکہ
تسلیم کی جاتی ہے اور یہ ان کی قادر الکلامی ، استادی اور پختہ مش
ثبوت ہے کہ جس کے بعد ان کا نام ہمارے ادب کی تاریخ میں زندہ ر

(ختم)

* م۔ ن۔ سعید

ضمیمۂ قطب مشتری

ضمیمہ ہے یا الگ مثنوی؟

مثنوی قطب مشتری قدیم اردو کی مشہورترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔ اس مثنوی کا مصنف اسداللہ وجہی ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ والیِ گولکنڈہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کا درباری شاعر تھا، اور بعض قیاسات کے مطابق اردو کا پہلا ملک الشعراء تھا۔ یہ مثنوی اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ علاوہ اور بہت سی خصوصیات کے، اس کی سب سے زیادہ قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ یہ قدیم اردو کی پہلی طبعزاد عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں زمانۂ تصنیف کے ایک مشہور حقیقی عشقیہ واقعے کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس کے بہت سے کردار حقیقی ہیں اور کم از کم مثنوی کا ہیرو محمد علی قطب شاہ بوقت تصنیف بقید حیات تھا۔ یہ مثنوی ۱۰۱۸ھ میں لکھی گئی اور اس کا ہیرو محمد علی قطب شاہ ۱۰۲۰ھ میں فوت ہوا۔

اس مثنوی میں محمد علی قطب شاہ کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ کہانی کی بنیاد ایک حقیقی واقعہ پر رکھی گئی ہے جس کا بیش تر تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔ یہاں ہم گلزار آصفی کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

> "پُل دریائے موسیٰ بہ سببِ تعشق مرزا محمد قلی کہ بر حُسنِ جاں فزائے بھاگ متی طوائف میلے کلّی داشت تیار گردید ...... روزے موسم باراں موافق معمول خود بوقت شب قصد نمودہ چوں بر سرِ دریائے موسیٰ رسید، دید کہ طغیانیء آب از حد زیادہ است ...... فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بے اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بہ زور حفظ حقیقی سلامت آمدہ۔"

وجہی نے اس واقعہ سے مرکزی خیال اور کردار لئے ہیں اور مثنوی کی کہانی خود ترتیب دی ہے۔ یہ اس لئے کہ حقیقی واقعے میں ایک داستان بننے کے

*جناب م۔ ن۔ سعید صاحب، ایم، اے، استاد و صدر شعبۂ اردو، میونسپل کالج، چکبالاپور، میسور۔

امکانات قریب قریب ناپید ہیں، اور وجہی کے لئے اپنے زمـــانے کی روایات اور داستان گوئی کے تقاضوں کو پورا کئے بغیر مثنوی لکھنا ممکن نہ تھا۔ وجہی نے «قطب مشتری» میں جو قصہ بیان کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے :

ابراہیم قطب شاہ کے ہاں بڑی تمناؤں کے بعد محمدقلی قطب شاہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ شہزادے کو مناسب تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں، قطب شاہ خواب میں ایک حسینہ کو دیکھ کر اسے دل دے بیٹھتا ہے۔ اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ حسینہ بنگال کی شہزادی مشـتری ہے، اپنے ایک مشیر عطارد کو لے کر اسے حاصل کرنے نکل پڑتا ہے۔ راستے میں ایک اژدھے کا مقابلہ کر کے اسے ختـــم کر دیتا ہے۔ پھر ایک دیو سے اس کی مڈ بھیڑ ہوتی ہے۔ اسے بھی ہلاک کرکے ایک اور ہم پیشہ مریخ خاں کو قید سے رہا کـراتا ہے۔ دوران سفـر ایک پری اسے روک لیتی ہے۔ شہزادہ مجبوراً اس کے ہاں ٹھہر جـاتا ہے۔ لیکن اپنے مشیر عطارد کو آگے روانہ کر دیتـا ہے۔ مشیر جو خود ایک باکمـال مصور ہے۔ مشتری کو قطب شاہ کی تصویر دکھا کر مبتلائے عشق کرتا ہے۔ قطب شاہ پری سے رخصت ہوکر اپنی محبوبہ سے جا ملتا ہے۔ مریخ خاں کو بنگال کی حکـــومت سپرد کرکے قطب و مشتری دکن آ جاتے ہیں اور امن چین سے حکومت کرتے ہیں۔

یہ مثنوی ڈاکٹر عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کی تھی۔ اس کی ترتیب کے وقت ان کے پیش نظر دو نسخے تھے۔ وہ خود مثنوی کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

> «یہ مثنوی میں نے دو نسخوں سے مرتب کی ہے۔ ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جو بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ناقص اور نا مکمل ہے۔ اور اول اور آخر اور بیچ بیچ میں سے ورق غـائب ہیں۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لندن[1] کا ہے جس کا عکس منگوا لیا گیا تھا۔ ان دونوں نسخوں سے مقابلہ کرکے یہ نسخہ ترتیب دیا گیا ہے۔»

ان نسخوں کے اختلافات کا ذکـر کرتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں :

> «میرے نسخے کی دو خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زیادہ بڑا ہے۔ یعنی اس میں بعض بیان ایسے ہیں، جو برٹش میوزیم کے نسخے میں نہیں۔ مثلاً سفر میں شہزادے کو جو مہمیں پیش آئی ہیں وہ لـندن والے نسخے میں صرف دو ہیں۔ اژدھے اور دیو کی

۱ ڈاکٹر گوپی چندنارنگ کے بیان کے مطابق یہ انڈیا آفس لندن کا نسخہ ہے۔

لڑائی۔ لیکن میرے نسخے میں سمیرغ کا مقابلہ بھی ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی مقامات میں اضافہ ہے۔ اگر یہ مقامات مکمل ہوتے تو میں مثنوی کے متن میں شامل کر دیتا، اس لئے جتنا حصہ موجود ہے، وہ ضمیمہ کے طور پر اضافہ کر دیا گیا ہے۔»

یہ ضمیمہ جس کا عبدالحق نے ذکر کیا ہے مثنوی کے آخر میں شامل ہے اور کل بائیس صفحات پر آیا ہے۔ اس کے بارے میں عبدالحق نے جو کچھ کہا ہے اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

١۔ یہ ضمیمہ مثنوی قطب مشتری کا ہی حصہ ہے۔

٢۔ اس میں سمیرغ کے مقابلے کے علاوہ بھی کئی اور مہمات کا بیان ہوا ہے۔

٣۔ یہ واقعات نامکمل ہیں ورنہ مثنوی کے متن میں شامل کرلئے جاتے۔

دوسرے الفاظ میں بقول عبدالحق ضمیمہ کا مثنوی سے معنوی ربط قائم ہے اور مثنوی کی کہانی کے واقعات سے، جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے، ضمیمہ کے واقعات کا گہرا تعلق ہے۔ یعنی یہ واقعات قطب شاہ کی مہم کے ہی واقعات ہیں۔ مثنوی میں ان کی عدم شمولیت کا جواز فقط ان کا نامکمل ہونا ہے۔ اس مقالے میں انہی نتائج سے بحث کرنی مقصود ہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ ضمیمہ کے واقعات بھی بیان کر دئے جائیں تا کہ مثنوی سے ان کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالنے اور فیصلہ کرنے میں آسانی رہے اور بحث زیادہ معنی خیز ہو۔

ضمیمہ میں کل چھ باب ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغاز کے کچھ اشعار نہیں ہیں۔ پہلا باب بعنوان «رستن شاہ زادہ از تہلکۂ دریا» یوں ہے:

خدا کے کرم سے شاہ زادہ دریا سے باہر نکلا۔ کئی دن تک دریا میں پھنسے رہنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے ساحل پر آ کر کچھ پھل توڑ کر کھائے۔ اس سے طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ اتنے میں دریا کے کنارے ایک جہاز لنگرانداز ہوا۔ شہزادے نے مسافروں کو سلام کیا۔ انہوں نے خیریت پوچھی۔ شہزادے نے بتایا کہ میرا باپ بڑا تاجر تھا۔ ہم سفر پر نکلے تھے کہ بیچ دریا میں طوفان نے آن گھیرا۔ مال و متاع غرق ہوگیا اور سارے ہمراہی ڈوب گئے۔ صرف میں ایک تختے کا سہارا لے کر بچ گیا۔ یہ سن کر ایک بوڑھے عامل نے کہا کہ اب بے سہارا کیسے رہوگے۔ میرے ساتھ چلے چلو۔ شہزادے نے

شکریہ ادا کیا اور عامل کے ساتھ رہنے اور اس کی خدمت گذاری پر رضا مند ہوگیا۔ لیکن وہ خوددار اتنا تھا کہ کبھی اس نے ان بزرگ کا احسان لینا گوارا نہ کیا۔ ایک انگوٹھی بچ گئی تھی۔ وہی بیچ کر پیٹ بھرتا رہا۔ اسی طرح دو برس گذر گئے۔ ایک دن رود نیل دیکھ کر اسے خیال گذرا کہ اس کا منبع تلاش کرنا چاہئے۔ اسی میں سرفرازی ہے۔ چنانچہ عامل کے پاس جا کر اپنا خیال ظاہر کیا۔ عامل نے اس کے ارادے سے اتفاق نہ کیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن شاہ زادہ یہی کہے گیا۔

یو دل کا طلب پھرن ہارا نہیں

چنانچہ عامل نے مجبوراً اسے اجازت دے دی اور کہا کہ تیرا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ مجھ سے جو مدد ہو سکتی ہے کرنے کو تیار ہوں۔ یہ کہہ کر اپنا صندوق منگایا۔ اسے کھولا۔ ۔ ۔ ۔ »

اس کے بعد کچھ اشعار چھوٹ گئے ہیں۔ بہرحال دوسرا باب بعنوان « رضا گرفتن شاہ زادہ از عامل بہ ھوس دیدن اصل (رود) » شروع ہوتا ہے جو یوں ہے:

شاہ زادہ زادراہ لے کر نکلا اور دریا کے کنارے بہت دور تک چلتا گیا صحرا میں چلتے چلتے بھوک پیاس سے برا حال تھا۔ آخر خدا نے مہربانی کی اور اسے دور ایک ٹیلہ نظر آیا۔ اس کی دوسری طرف ایک خوش نما باغ تھا۔ شہزادے نے باغ میں پہنچ کر پھل پھلاری سے اپنی بھوک پیاس مٹائی۔ اور اب جو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس باغ میں کئی درخت سونے کے ہیں اور ان میں لعل و جواہر کے خوشے لگے ہیں۔ یہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی اور وہ ایک خوشہ توڑنے آگے بڑھا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا، اس کے پورے جسم میں برقی رو کا ایک جھٹکا سا لگا اور وہ بے سدھ ہوکر زمین پر گر پڑا۔

وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اسے دور سے کچھ لوگ آتے دکھائی دئیے۔ وہ فوراً آڑ میں ہوگیا۔ ان کے قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ایک بادشاہ اپنے وزیروں کے ہمراہ آ رہا ہے۔ باغ میں آ کر بادشاہ نے کہا کہ بہت دن سے میرے دل میں ایک بات کی خلش تھی کہ اس باغ میں سونے کے درخت اور لعل و جواہر کے خوشے کہاں سے آئے۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ جواب دو ورنہ کسی کو زندہ نہ چھوڑوں گا۔

وزیر یہ سن کر گھبرا گئے۔ ایک نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا ۔ جہاں پناہ ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے یہی دیکھتے آئے ہیں۔ آج تک اس کے بارے میں کسی نے پوچھا اور نہ ہم نے دریافت کیا۔ ہمیں چند روز کی مہلت دیجئے تو جواب ڈھونڈھ نکالیں ۔

بادشاہ نے غضبناک ہو کر کہا ، اچھا ، اچھا۔ مگر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تمھاری اولاد کو کولہو میں پسوا دوں گا ۔ بادشاہ تو غصے میں بھرا چلا گیا لیکن وزیر سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے۔ اتفاقاً ان کی نظر شاہ زادے پر پڑی اور انھوں نے پوچھا کہ تو کون ہے اور یہا کیوں چھپا بیٹھا ہے؟

یہ باب بھی نا مکمل ہے، یعنی بعد کے اشعار نہیں ہیں ۔ اگلا باب « باز گشتن وزیران و رفتن شاہ زادہ پیش تو » ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ زادے نے وزیروں کی مشکل حل کردی اور ان کو مطلوبہ جواب مل گیا ۔ قصہ آگے یوں ہے :

وزیروں نے شاہ زادے کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوگئے۔ شہزادہ پھر ندی کے کنارے کنارے چلنے لگا ۔ کئی دن بعد وہ ایک شہر میں پہنچا ۔ وہاں ایک نیک مرد سے اس کی ملاقات ہوئی ۔ وہ شاہ زادے کو اپنے گھر لے گیا ۔ شاہ زادے نے اسے اپنی سرگزشت کہہ سنائی۔ کھا پی کر وہ آرام کر رہا تھا کہ اسے دو جانوروں کی بات چیت کی آواز سنائی دی ۔ اس نے سنا کہ ایک گدھا اور ایک بیل باتیں کر رہے ہیں ۔ بیل مالک کی سختیوں کی شکایت کر رہا تھا ۔ گدھے نے کہا میں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ ذرا آزما کر دیکھ لو۔ تم آج رات گھاس کا ایک تنکا بھی نہ کھاؤ ۔ کل مالک آ کر دیکھے گا تو سمجھے گا کہ تمھاری صحت بگڑ گئی ہے۔ یوں تمھیں کام سے چھٹی مل جائے گی اور کچھ دن مزے میں گذارو گے۔ شاہ زادہ یہ سن کر ہنس پڑا ۔ میزبان کی بیوی سمجھی کہ شاید شاہ زادہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس نے اس سے باز پرس کی۔ شہزادے نے بات بنائی کہ اسے اپنے گھر کی کسی بات پر ہنسی آ گئی تھی۔

گدھے کی ترکیب کامیاب رہی۔ مالک نے اپنے ملازم سے کہا کہ آج بیل سست ہے۔ لیکن آج ہی بیج بونا بھی ضروری ہے۔ تم گدھے کے بدلے میں میرے دوست سے بیل مستعار لے لو۔ اس کے دوست نے گدھے سے خوب کام لیا ۔

گدھا اس ناگہانی افتاد پر بہت جھنجھلایا۔ شام کو گھر واپس ہوا تو بیل نے چھک کر خیریت پوچھی۔ گدھا جلا ہوا تو تھا، لیکن اس نے دل میں بغض کو دبا کر کہا، بھئی میرے تو مزے رہے، سارا دن ہری ہری گھاس پر لوٹتا رہا۔ ہمارے مالک کے ارادے [illegible] دن معلوم ہوتے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بیل اگر کل تک ٹھیک ہو [illegible] میں، اسے ذبح کر دوں گا۔ یہ سن کر بیل کے ہوش اڑ گئے۔ گدھے نے اس کے کہا کہ اب تو ہی اس مشکل سے نجات دلا۔ بتا میں کیا کروں؟ شاہ زادے مشورہ دیا کہ بس حسب معمول صبح تک پوری گھاس چر جا۔ مالک سمجھے گا کہ تیرا درد مٹ گیا اور تیری جان بچ جائے گی۔ شہزادہ یہ سن کر ہنسنے لگا۔ اب عورت بگڑ گئی۔ اس کا شوہر بھی بیوی کے غصہ دلانے سے اس کے پیچھے پڑ گیا۔ شاہ زادے نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر کہا، اچھا خیر، سچی بات بتادوں گا لیکن لکھ کر اور تمہاری بیوی جب تک اصرار نہ کرے اسے کچھ نہ بتانا۔ شوہر نے بیوی سے قلم دوات لانے کے لئے کہا۔ بیوی مطلوبہ چیزیں لانے کے لئے جوں ہی اٹھی اس کی گود سے ایک روٹی اچھل کر صحن میں جا گری۔ وہاں اُن کا کتا لیٹا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہوشیار ہو ایک مرغ روٹی جھپٹ کر بھاگا۔ کتے نے غصے میں آکر مرغ کو بے شرم کہا۔ مرغ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ بے شرم تو اور تیرا مالک۔ وہ اتنا کم عقل ہے کہ عورت کی بات سنتا ہے۔ شہزادہ یہ سن کر مسکرا پڑا۔ اب میزبان کو بہت غصہ آگیا۔ آخر شہزادے نے اسے پوری بات بتادی اور اس کی شرمندگی کی حد نہ رہی۔ بیوی کی بات نہ سنتا تو اُلو کیوں بنتا۔ چنانچہ بیوی جب واپس ہوئی تو اسے پکڑ کر خوب پیٹا۔ س،ق:

نہ سن بات عورت کی بد ہے بڑی اگر خوب اچھے ہی شکر کی چھری

شہزادے کو اب وہاں اوررہنا مناسب نہ معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ وہاں سے رخصت ہوا۔

یہاں تیسرا باب ختم ہوتا ہے۔ چوتھے باب کا عنوان ہے «رفتن شاہزادہ پیش عابد و راہ نمودن او۔» قصہ آگے یوں ہے:

شاہ زادہ پھر ندی کے کنارے کنارے چلا۔ چلتے چلتے ایک پہاڑ پر اس کی ایک عابد سے ملاقات ہوئی۔ عابد نے اسے پہچان لیا کہ یہ « مشرق کرے شہ

کا فرزند ہے ۔ » اس نے بڑی شفقت کی اور شہزادے کو صحیح راستے پر لگا د
اس نے کہا کہ شہزادہ ایک پرندے کا پنجہ پکڑ کر دریا پار کرے اور اس گ
تک پہنچے جہاں سے نیل کے علاوہ فرات ، دجلہ اور جیحون نکلتے ہیں ۔ عابد
یہ بھی کہا کہ جب تو پرندوں کے اڑنے کے مقام پر پہنچے گا تو تیرے ہات انگ
کا ایک خوشہ آئے گا ۔ اس کو بہ حفاظت لانا ورنہ میری جان چلی جائے گی ۔ ا
اتفاق سے ایسا ہو جائے تو واپس آکر میری لاش دفنا دینا) شہزادہ اس کے کہ
کے مطابق چلا ۔ اسے انگور کا خوشہ بھی ملا اور ایک پرندے کا پاؤں پکڑ کر ا
نے دریا بھی پار کر لیا ۔ آگے چلا تو ایک غیب داں شیخ سے اس کی ملاقہ
ہوئی ۔ شیخ نے کہا کہ مجھے عابد نے یہ سیب دے کر تیرے پاس بھیجا ہے ۔
ہدایت کی ہے کہ اسے فوراً کھا لینا ضروری ہے ۔ شہزادے کے سیب کھانے
دیر تھی کہ انگور کا خوشہ غائب ہو گیا ۔ شیخ نے قہقہہ لگا کر کہا کہ میں ابل
ہوں ۔ وہ خوشہ جنت کا تھا ۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ تم جنت کا میوہ کھاتے اور
محروم رہتا ۔ شہزادہ ناکام واپس ہوا ۔ حسب ارشاد عابد کی لاش ملی ۔ اس نے اسے دفنا

اگلے باب ۔ « باز گشتن شاہ زادہ از مغرب و سوار شدن بہ کشتی » کے واق
یوں بیان ہوئے ہیں :

شہزادہ پھر سفر پر نکلا ۔ جنگل بیابان میں سفر کرتے ہوئے اس کی ح
بہت خراب ہو گئی ۔ کئی دن بعد اسے سمندر میں ایک جہاز دکھائی دیا ۔ شہزا
نے ایک بانس کے سرے پر چادر لٹکا کر جہاز کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔ جہ
اشارہ پا کر اس کے قریب آیا ۔ جہازیوں نے شہزادے کا خیر مقدم کیا ۔ شہزا
نے انہیں بتایا کہ یہ سب قدرت کا کرشمہ ہے کہ میں مشرق سے نکل کر مغرب
بھٹک رہا ہوں ۔ جہاز کے تاجروں نے اس کی پوری مدد کرنے کا اسے یقین دلایا
سب نے اپنے اپنے مال کا چھٹا حصہ اسے دے دیا ۔ لیکن بدقسمتی سے جہاز ط
میں گھر گیا ۔ صرف شہزادہ کسی طرح سے جان بچا کر ساحل تک پہنچ سکا

آخری باب کا عنوان ہے « سوار شُـــدنِ شاہ زادہ بہ کوہ کہ دخترِ باد
مغرب بود » ۔ اس میں یہ داستان بیان ہوئی ہے :

« شاہ زادے نے جزیرے کے ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا ۔ کئی دن
پھل کھاکر گذارہ کرتا رہا ۔ جب طبیعت بیزار ہو گئی تو ایک گھوڑا ذبح کر

اس کے کباب بھون کر کھائے۔ ایک دن اس نے سوچا کہ آخر کب تک یوں ہی گزارہ کرے گا۔ یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے، کم از کم اس درخت پر چڑھ کر کچھ دیکھنا چاہئے۔ ابھی یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی گود میں ایک سیب آ گرا شہزادہ حیران ہوا کہ یہ سیب کہاں سے آیا کیوں کہ درخت تو سیب کا نہیں تھا۔ اوپر نظر اٹھائی تو حیران رہ گیا کہ ڈالیوں میں ایک حسینہ بیٹھی ہوئی تھی

لگیا دیکھنے جھاڑ اُپر رُخ باند
کہ ڈالیاں میں یوں تھی ابر میں جیوں چاند

شہزادہ اسے دیکھتے ہی دل دے بیٹھا۔ اس نے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ حورِ بہشت ہے یا ارم کی پری ہے؟ اس حسینہ نے کہا کہ میں سیمرغ کی بیٹی ہوں، تو کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟ تیری خیر اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلاجا یا کہیں چھپ جا ورنہ سیمرغ تجھے کھا لے گا۔ شہزادہ بہت ہنسا اور بولا، تو دیوانی ہے جو خود کو سیمرغ کی بیٹی سمجھتی ہے۔

توں بالغ ابھے پن نہیں تُج عقل ہے مُج ناد توں آدمی کا نسل

تجھے یقین نہیں تو اب جیسے ہی سیمرغ آئے تو اس سے آئینے کی فرمایش کر۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر تجھے یقین آ جائیے گا۔

جب سیمرغ آیا تو شاہ زادہ چھپ گیا۔ بادشاہِ مغرب کی دختر نے اُس سے آئینے کی فرمایش کی اور وہ اس کی خواہش پوری کرنے چلا گیا۔ . . »

یہاں اشعار ختم ہوگئے ہیں۔

اس ضمیمے کے واقعات سے کئی سوالات ابھرتے ہیں۔ کیا یہ ضمیمہ مثنوی قطب مشتری کا ہی حصہ ہے؟ اس کے بیان کردہ واقعات، کیا قطب شہ کی مہم کا حصہ ہیں؟ اگر اس ضمیمہ کے نامکمل مقامات مکمل ہو بھی جائیں تو کیا انھیں موجودہ مثنوی میں کھپایا جا سکتا ہے؟ قطب شہ کی مہم کا تو ایک ہی مقصد تھا، یعنی مشتری کو حاصل کرنا۔ لیکن بائیس صفحات کے ضمیمے میں مشتری کا ذکر ایک جگہ بھی نہیں آیا ہے بلکہ شہزادے کو دلچسپی ہے تو رودِ نیل کا منبع تلاش کرنے سے۔

ضمیمے کی داستان جب شروع ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ سمندری طوفان میں گھر کر اکیلا ہو چکا ہے۔ اگر لمحے بھر کو فرض کرلیا جائے

کہ یہ شہزادہ قطب شاہ ہی ہوگا تو بھی بات نہیں بنتی کیوں کہ دکن سے بنگال کے سفر میں کہیں بھی سمندری سفر کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر یہ ممکن ہوتا تب بھی بھٹک کر شہزادے کو ہندوستان ہی میں کہیں پہنچنا تھا۔ لیکن وہ سیدھے مصر پہنچتا ہے۔ عابد اسے پہچانتا بھی ہے تو "مشرق کرے شہ کے فرزند" کی حیثیت سے۔ شہزادہ ایک جگہ خود بھی کہتا ہے کہ میں مغرب میں بھٹک رہا ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ضمیمے میں مثنوی کے دوسرے کرداروں کا بالکل ہی ذکر نہیں ہے۔ مثنوی میں قدم قدم پر قطب شہ کو مشتری کی یاد ستاتی رہتی ہے، وہ اس سے جلد جا ملنے کو بےتاب ہوتا ہے۔ اس کے سفر کا بنیادی مقصد ہی مشتری کو حاصل کرنا ہے۔ لیکن ضمیمے کا شہزادہ آوارہ مزاج ہے۔ اس کی مہمات کا مقصد واضح نہیں۔ وہ وزیروں کی رہنمائی کرتا ہے، عورتوں کی برائیاں کرتا ہے، رود نیل کا منبع تلاش کرکے زندۂ جاوید بننا چاہتا ہے۔ سب کچھ کرتا ہے لیکن مشتری کو کبھی یاد نہیں کرتا۔ بھول کر بھی یاد نہیں کرتا۔ ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شاہ زادہ کوئی اور ہی ہے۔ اسے قطب شہ سے کوئی نسبت نہیں۔

یہ سرسری جائزہ ہے، ورنہ ان بائیس صفحات کے قطب مشتری کا ضمیمہ نہ ہونے کے حق میں بہت سے قوی دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ضمیمے میں مرکزی کردار کو "شاہ زادہ" کہا گیا ہے اور عنوانات بھی اسی قسم کے ہیں۔ جیسے "رستن شاہزادہ . . . . " "رفتن شاہزادہ . . . " "رضا گرفتن شاہ زادہ" وغیرہ، جب کہ قطب مشتری میں وجہی ہر جگہ قطب شہ کو شہ کے لفظ سے مخاطب کرتا ہے۔ جیسے:

سو شہ پکھوے میں دائی کے یوں اچھے کچا موتی سیپی منے جیوں اچھے

فرنگ میاں تے کاڑے شہ جاں یوں نکلتا ہے کنچلی میں تے سانپ جیوں

نہ صرف وہ بلکہ مثنوی کا ہر کردار قطب شہ سے "شہ" کہہ کر ہی مخاطب ہوتا ہے۔ وجہی نے عنوانات میں بھی اس کا پورا نام لکھا ہے۔ جیسے "غزل گفتن محمد قلی قطب شہ" "اجازت خواستن محمد قلی قطب شہ" "یاد کردن مشتری محمد قلی قطب شہ" وغیرہ۔ وہ قطب شہ کا نام بہت احترام سے لیتا ہے اور اُس کے لئے اوامر تعظیمی استعمال کرتا ہے۔ لیکن ضمیمے میں شہزادے کو جذباتی لاتعلقی کے

کے ساتھ واحد غائب میں مخاطب کیا گیا ہے۔ اور قطب شہ کا تو کسی صیغے میں کوئی ذکر ہی نہیں آیا۔ پھر ضمیمے کا شہزادہ ایک نہایت معمولی شخص معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قطب شہ کی شخصیت کے ساتھ اس کی امتیازی شان، اس کا مرتبہ اور اس کا جذبۂ عشق برابر وابستہ ہے۔ اس کی یہ صفات کہیں بھی نظر سے اوجھل نہیں ہوتیں۔

اب واقعات کی صحت کی طرف آئیے۔ قطب مشتری ایک طبع زاد مثنوی ہے۔ اس کی رنگ آمیزی کے سلسلے میں وجہی نے بہت سے واقعات گھڑے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے ہی مہماتی کارناموں کا ذکر ہے جن تک تخئیل کی عام رسائی ہو سکتی تھی۔ جیسے اژدہے یا دیو کا مقابلہ، پریوں سے مڈبھیڑ وغیرہ۔

ضمیمے میں جو واقعات ہیں ان میں سے کئی ایک «الف لیلیٰ» سے اخذ کئے گئے ہیں اور ایک سے زیادہ بار مختلف مصنفوں کے یہاں قلم بند ہوچکے ہیں۔ گدھے اور بیل کی کہانی دنیا کی کئی زبانوں میں کہی جا چکی ہے۔ اسی طرح سیمرغ اور شہزادی کی کہانی بھی۔ وجہی ایک حقیقی قصے کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس لئے اسے یا تو حقیقت پر قناعت کرنی تھی یا واقعات کی تخلیق خود کرنی تھی۔ الف لیلیٰ کے قصے تو وجہی سے بھی زیادہ پرانے ہیں اور شاید اس کے زمانے کے لوگ بھی اُن سے خوب واقف تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کیا وجہی ان مشہور عالم قصوں کو قطب شاہ کی مہم کے کارنامے بناکر پیش کرتا؟ اور خصوصاً ایسی حالت میں کہ جس وقت مثنوی لکھی گئی قطب شاہ بقیدِ حیات تھا۔

اس سلسلے میں وجہی کی شخصیت خود ہمارے نتائج کی تائید کرتی ہے مثنوی کے آغاز میں اس نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے:

نکو بول مضمون تو ہور کا　　کہ کالا ہے دوجگ میں موں چور کا
جو کوئی فہم میں ٹُک ہنسیاں اہیں　　سو دُسریاں کے وو خوشہ چنیاں اہیں
ہنروند اس کوں کھیا جائیگا　　جو کوئی دل تے اپنے نوا لیائیگا

یعنی جس نے دوسرے کا مضمون چُراکر اپنا بنا لیا وہ دونوں جہاں میں روسیاہ ہے۔ جو عقل کے کورے ہیں وہی دوسروں کی خوشہ چینی کرتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہنرمند یا حقیقی فن کار وہی ہے جو اُپج اور تخلیق کرے۔ ایسے تخلیقی فن کار سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو پھر سے چوسے۔

اس ضمن میں صرف زبان اور اسلوب کا جائزہ لینے سے بھی یہ مغالطہ دور ہو جاتا ہے۔ ضمیمے اور اصل مثنوی کی زبان میں کافی فرق ہے۔ قطب مشتری کے ہر شعر میں وجہی کی شخصیت کی چھاپ موجود ہے۔ وہ کہتا ہے :

دو جگ جس اُتم ہیرے کا مول ہے وو ہیرا سو ہر یک مرا بول ہے

اس کا احساسِ برتری، انانیت اور قوی لہجہ ہر شعر سے جھلکتا ہے۔ وہ جو بات بھی کہتا ہے مکمل اعتماد اور پورے یقین سے کہتا ہے۔ اسے فن پر بھی کامل عبور ہے۔ اس کا جمالیاتی احساس بالیدہ ہے مثنوی «قطب مشتری» لکھنے سے اس کا مقصد فقط بیان داستان نہیں بلکہ فن شعری کے معراج کی ایک خوبصورت مثال پیش کرنا اور اپنے فنی کمالات کا اظہار کرنا بھی ہے اس کا کوئی شعر ایسا نہیں جو وزن سے گرا ہواہو ۔ سودا اور نصرتی کی طرح اسے الفاظ کو انگوٹھی میں نگینے کےطرح جڑنا آتا ہے۔ الفاظ اس کے اشعار میں یوں استعمال ہوتے ہیں کہ انہیں اور ڈھنگ سے ترتیب دینا ناممکن سا لگتا ہے۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کے اشعار میں «لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے» ہیں۔

ضمیمے کا مصنف ایک مجہول شخصیت کا مالک ہے۔ اس کے اسلوب میں کوئی دل کشی نہیں۔ وہ واقعات کا بیان سیدھے سادے انداز میں کرتا ہے۔ دراصل قطب مشتری کے مقابلے میں اس کا مقصد فقط بیان داستان ہے۔ شاعری سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ اسی لئے صرف چھبیس صفحات میں اس نے جتنے واقعات سمودئیے ہیں قطب مشتری کے سو صفحات میں بھی اتنی تفصیل نہیں۔ ! اس کے اکثر اشعار وزن سے ساقط بھی ہیں۔ وہ بیان میں تشبیہوں اور استعاروں کی مدد بالکل نہیں لیتا اور یہی ایک چیز اس میں اور وجہی میں امتیاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ گدھے اور بیل کی کہانی میں اس نے دو چار اشعار مین عورتوں کی برائی کی ہے۔ وجہی کو ایسے مواقع خدا دے۔ اس کے رجحان کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس موقع پر تین چار صفحات ضرور سیاہ کرتا۔

پھر «قطب مشتری» میں قطب شاہی تہذیب وتمدّن کے مرقع جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ پرستان سے رخصت ہوتے ہوئے قطب شہ اور مہتاب اپنی انگوٹھیاں بدل لیتے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے اپنی کوئی نشانی دے جانا دکنی معاشرت کی ایک خصوصیت ہے۔ وجہی ایک حقیقی قصہ قلم بند کررہا تھا اور آمیزش کے باوجود اس

کے قدم زمین پر ہی رہے تھے۔ ضمیمہ کے کرداروں میں ان پہلوؤں کا فقدان ہے ا، کے علاوہ وجہی جیسا آرسٹوکریٹ جس نظر سے چیزوں کو دیکھ سکتا ہے، ضمیمہ کا مصنف نہیں دیکھ سکتا۔ وہ نچلے طبقے سے زیادہ واقف ہے۔

ایک آخری اور اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ مثنوی «قطب مشتری» اپنی موجو حالت میں کسی طرح بھی نامکمل یا تشنہ نہیں کہی جاسکتی۔ تسلسل، ربط اور تکمہ سبھی کچھ ہے۔ اگر مثنوی کے اندر ضمیمے کو کہیں کھپانے کی کوشش کی جائے مثنوی کا مجموعی تأثر، آہنگ اور ربط و تسلسل سخت متاثر ہوگا۔

ضمیمہ دراصل ایک الگ ہی مثنوی ہے۔ اس کا جتنا حصہ چھپا ہے وہ ناقہ الطرفین ہے۔ اس کی ابتداء کا اندازہ لگانے میں مشکل نہیں ہوتی لیکن اس کے اخ کا قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ہو سکتا ہے، مثنوی وہیں ختم ہوگئی ہو، یا کچھ اوروا قہ بھی ہوں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ضمیمہ بذاتِ خود ایک الگ مثنوی ہے؛ «قطب مشتر: میں اس کی شمولیت غلط ہے؛ اور یہ کہ قطب مشتری اپنی موجودہ حالت میں اِ مربوط و مکمل مثنوی ہے۔

دیوی سنگھ چوہان نقد و تبصرہ

دکھنی اردو کی لغت

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ان کے ایک ساتھی ڈاکٹر غلام عمر خاں، ریڈر شعبۂ اردو، جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد نے دکھنی اردو کی لغت۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کرکے شائع فرمائی ہے۔ اس لغت کی اشاعت آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی، حیدر آباد کی طرف سے ہوئی ہے۔ مرتبوں کے بیان کے مطابق اس لغت میں چھ سات ہزار الفاظ شامل ہو پائے ہیں۔ ان میں محاوروں کی تعداد بھی معتد بہ ہے۔ جن کتابوں سے اس لغت کا خزانۂ الفاظ فراہم کیا گیا ہے ان کی تعداد ٢٦٧ ہے۔ ان میں سے ٢١٧ مخطوطات کی صورت میں ہیں اور ٥٠ مطبوعہ کتابیں ہیں۔ مطبوعات میں سے مکمل متن کے ساتھ صرف ٢٩ ہیں اور بقیہ ٢١ اقتباسات پر مشتمل ہیں جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی وغیرہ کی تالیفات سے لئے گئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دکھنی ادب کے مطالعہ میں ابھی کتنی منزلیں طے کرنی ہیں۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرتبین کو اس لغت کے تیار کرنے میں کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

کسی لغت کے مرتب ہونے سے قبل اگر اس زبان کی اہم ترین کتابیں محققین کے ہاتھوں مستند روپ میں شائع ہوں، لفظوں کی صحیح صورت واضح ہو اور تحقیق کی روشنی میں ہر لفظ کے معنی کی بنیاد معلوم ہوجائے تو اس زبان کی لغت کا کام اطمینان بخش طریقہ سے انجام پا سکتا ہے۔ یہ واضح ہے کہ دکھنی زبان کے بارے میں یہ کام ابھی ہونا باقی ہے۔ تمام زبانوں کے لئے یہی اصول کارآمد ہوگا۔ بھارت کی موجودہ آریہ بھارتیہ بھاشاؤں کو اسی اصول کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ دکھنی اردو کے تعلق سے اس اصول کے برتنے میں مزید احتیاط

جناب دیوی سنگھ وینکٹ سنگھ چوہان، بی۔ اے: ال ال۔ بی۔ (عثمانیہ)، سابق دکن پبلک سروس کمیشن حکومت مہاراشٹر، بمبئی۔

کی ضرورت ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں ایک تو دکھنی اردو پر پرانی مراٹھی کا اثر بہت زیادہ ہے، اور دوسرے یہ کہ دکھنی اردو کی موجودہ صورت کا سب رنگ ڈھنگ بدلا ہوا ہے۔ نئی آریہ بھارتیہ بھاشائیں سنسکرت، پراکرت، اپبھرنش وغیرہ کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس اردو نے سنسکرت، پراکرت وغیرہ سے منہ موڑ کر فارسی اور عربی کو اپنایا ہے۔ نتیجۃً دکھنی کے مطالعہ میں کافی رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں۔ دکھنی آج کی دیگر آریہ بھارتیہ بھاشاؤں کی مانند سنسکرت پراکرت، اپبھرنش وغیرہ کے دودھ پر پلی ہے۔ اس لغت میں دکھنی کے ایسے ہی الفاظ کو شامل کیا گیا ہے جو ان ماخذوں سے لئے گئے تھے۔ فارسی، عربی کے صرف ایسے الفاظ کو اس لغت میں جگہ دی گئی ہے جو املائی صورت میں دکھنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ بھارتیہ اہل صرف و نحو کی اصطلاح میں گویا یہ دکھنی کے تدبھو شبدوں کا لغت ہے۔

جہاں تک لغت کی کاملیت کا سوال ہے ڈاکٹر مسعود حسین خان کا یہ بیان ملحوظ رہے کہ "اس قسم کا کوئی کام نہ اب تک تجویز ہوا اور نہ مکمل کیا گیا ہے تاہم مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس کی حیثیت نشان راہ کی ہے، منزل کی نہیں۔ . . . بعض ایسے الفاظ بھی خارج کردئے گئے ہیں جن کے معانی آخری وقت تک مشتبہ رہے اور جو مرتب شدہ متون سے واضح نہ ہو سکے۔"

دکھنی مطبوعہ متنوں میں سے زیادہ تر کتابوں کو ہم نے دیکھا اور پڑھا ہے اور وقتاً فوقتاً بعض کتابوں کے کئی الفاظ کی صحیح قرأت اور اصل معنی کی طرف اہل ادب کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے اس لئے ہم کو فاضل مرتب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ دکھنی الفاظ کی درست قرأت اور اصل معنی ڈھونڈھنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ ابھی اس سلسلہ میں ہم کو بہت کام کرنا ہے۔ مرحوم بابائے اردو کی کوششیں اس جہت میں خصوصاً قابل قدر ہیں۔ انہوں نے اپنی ہر مرتبہ کتاب کے آخر میں فرہنگ الفاظ دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے الفاظ کے معانی کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ برسوں تک اورنگ آباد میں مقیم رہے اور اسی شہر سے ان کا دکھنی کا کام شروع ہوا۔ انہوں نے مراٹھی زبان کے تدبھو الفاظ

کو جو دکھنی میں مستعمل ہیں سمجھنے کی کافی کوشش کی ہے۔ انھوں نے گلشن عشق میں سنترنا، پسا، دان، کہان، کھنورا، (گھنورا) وغیرہ جیسے الفاظ کے معنی دئیے ہیں اور وہ درست بھی ہیں۔ لیکن یہ الفاظ اس لغت میں شامل نہیں کئے گئے کہان، لفظ ضرور دیا گیا ہے لیکن اس کے دروڑا کے معنی نہیں پائے جاتے۔

باوجود غور و فکر اور احتیاط اس لغت میں کئی الفاظ کی قرات درست نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے چند لفظوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔ گلشن عشق میں علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں اَبَلاَ بَلی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کتاب مذکور کے فاضل مرتب نے ابلا کو ایلا پڑھا ہے۔ یہی قرات لغت میں بھی پائی جاتی ہے۔ اصل لفظ اَبلاَ بَلی ہے جس کے معنی ہیں "غریب اور لاچاروں کی اپنے بل طاقت سے حفاظت کرنے والا"۔ اسی قسم کی غلطیاں اند (اندر)، ایرئیکی (ایرس کی) السٹا (السنا)، خان اُدیس (خاندیس)، مدن‌پورن (مدن‌پوری)، تجنا (تجنا)، مگمبر (بگمبر)، منکٹ (منگٹ)، مولکا (مول کا)، میٹا (مٹیا)، ہتنگ (متنگ)، وغیرہ کی قرات میں سرزد ہوئی ہیں۔ ایسے اور کئی الفاظ ہیں یہ محض بطور نمونہ ہیں۔ درست قرات کے معلوم کرنے میں علم معنیات (Semantics) اور علم تاریخی معنیات (Historical Semantics) کو بڑا دخل ہے۔ ان دونوں ہی کی روشنی میں محقق راہ راست پر چل سکتا ہے۔ علم معنیات کا کافی لحاظ نہ ہونے سے بہت سے الفاظ کے درست معنی تک پہنچنے میں کافی رکاوٹیں حائل ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے الفاظ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جو محض حرف "ک" سے تعلق رکھتے ہیں:

کولا: گیدڑ (صحیح معنی لومڑی)

کارنے: سبب (کارن سے)

کتی: چھوٹی تلوار (صحیح کاٹنے کا آلہ، لکڑی سے باندھی ہوئی درانتی)

کنگر، کنگھر: کنھیرا (کنگر نہیں۔ صحیح معنی قلعہ کے نزدیک بنائے ہوئے سپاہیوں کے گھر۔ یہ ہر قلعہ کے نزدیک پائے جاتے ہیں جیسے اوسہ، دھارور، پرندہ وغیرہ)

کُسن: چولی (کَسن نہیں۔ سنسکرت کُچ کی جمع)

کلٹن: بدکار (صحیح معنی کلٹا، کٹنی)

کھٹو: شرمندہ (صحیح معنی رنجیدہ)

کھونگڑی: گدڑی (صحیح معنی گھونگڑی، کمبل)

کھوڑا: خرابی، عیب (صحیح معنی بری عادت)
کھونیا: بالوں کا جوڑا (صحیح معنی گھونسلہ)

لغت میں محاوروں کے معنی بھی دئے گئے ہیں۔ چند محاوروں کے سلسلے میں فاضل مرتبین سے تسامح ہوگیا ہے۔ مثلاً اوتارنا۔ معنی دئے گئے ہیں مار ڈالنا، قتل کرنا۔ محاورہ گردن اوتارنا ہے۔ سند میں جو مصرع دیا گیا ہے وہ یہ ہے: «جو گھوڑے کی گردن اوتاریا اُنے»۔ ایک دوسرا محاورہ دیا گیا ہے: من میں بھیدنا۔ اس محاورہ کی سند میں یہ مصرع پیش کیا گیا ہے: «لیا اپنے من میں اس دھات بھید» اس سے واضح ہے کہ محاورہ بھید لینا ہے اور معنی ہیں اصلیت کو پہنچنا، حقیقت معلوم کرنا۔ اس کے مترادف دکھنی کا ایک اور محاورہ ہے: «انت لینا» جو صحیح طور پر اس لغت میں سمجھایا گیا ہے

اس لغت کی سب سے بڑی خوبی اور ایک لحاظ سے دکھنی اردو ادب کی بڑی خدمت یہ ہے کہ اس میں ہر لفظ اور محاورہ کے معنی کے ساتھ ساتھ ان کے اسناد بھی دئے گئے ہیں۔ لیکن دکھنی اردو کے باقاعدہ اصولی مطالعہ کے فقدان کی وجہ سے مرتبین کو صرف ان کتابوں کے نام بتانے پر اکتفا کرنا پڑا ہے جن میں سند کے طور پر پیش‌کردہ مصرع اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ «علی نامہ» «گلشن عشق»، «سب رس» وغیرہ جیسی ضخیم کتابوں میں ان مصرعوں اور جملوں کو تلاش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لئے جدید طرز پر مرتب کی ہوئی کتابوں میں اشعار کی مسلسل تعداد پانچ‌پانچ کے وقفہ سے بتائی جائے اور نثری کتابوں میں ہرصفحہ پر سطور کی تعداد اسی وقفہ سے لکھی جائے۔ اگر اس ڈھنگ سے قدیم اردو کا ادب مرتب ہوکر شائع ہو تو محققین کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن بہت کم کتابیں اس طرح سے شائع ہوئی ہیں۔ اس لئے مرتبین کو محض کتاب کے نام پر اکتفا کرنا پڑا ہے۔

لغت میں اعراب کا استعمال بہت کم ہوا ہے، حالانکہ وہ بلا استثنا ہر لفظ پر ہونا چاہئے تھا۔ اعراب کی وجہ سے صحیح تلفظ معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بھوکن اور بھومان میں حرف اول کے تلفظ بالکل الگ الگ ہیں۔ لیکن اعراب نہ ہونے سے پڑھنے والے کو کوئی مدد نہیں ملتی۔ اسی طرح الفاظ کی بنیاد معلوم کرنے کی کوشش اس لغت میں بہت کمزور ہے۔ کسی لفظ کی جڑ تلاش کی جائے

تو معنی و مفہوم بآسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ خوش قسمتی سے اردو ہندوستانی زبان کے مستند لغات میں کوششیں ہوئی ہیں۔ شکسپیر اور پلاٹس کی کاوشیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک صدی قبل جون پلاٹس نے شکایت کی تھی کہ (ملاحظہ ہو پلاٹس کی ہندوستانی یا اردو زبان کی گرامر، دہلی ۱۹۶۷ع، دیباچـــہ) اردو زبان کے محققین پراکرت، اپبھرنش وغیرہ کے خزانوں استفـادہ نہیں کرتے۔ کم و بیش وہی صورت حال آج بھی دکھائی دیتی ہے دکھنی اردو کے مطالعہ اور لغت نویسی کے میدان میں یہ خامی کہیں زیادہ اثر رکھتی۔ چونکہ یہ لغت دکھنی اردو کے تدبھو الفاظ پر مشتمل ہے اس لئے اگر الفاظ اور محاوروں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھا جاتا، جیسا کہ شکسپیر، پلاٹس وغیرہ نے کیا ہے، تو لغت کی افادیت میں یقناً اضافہ ہوتا۔

ایک لفظ کتاب کے نام سے متعلق ـ گردپوش پر کتاب کا نام «دکنی اردو کی لغت» دیا گیا ہے اور اندر ٹائٹل کے صفحے پر «دکنی اردو کی لغت» چھپا ہے۔ ایک علمی کتاب کے نام میں یہ دورنگی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

آخر میں میں ہر دو مرتبین کو مبارکبـاد دیتا ہوں کہ انھوں نے لغت مرتب کرکے ایک علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ بنیادی کام ہے۔ اس لغت کی اساس پر ہی اگلا قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

تبصرے

کتاب الزھد والرقائق از امام شیخ الاسلام عبد اللہ بن مبارک رح ،
تعلیق و تحقیق : مولانا حبیب الرحمان صاحب اعظمی ، مجلس احیاء المعارف
مالیگاؤں ، ضلع ناسک ، صفحات ۷۰۰ سے زائد ، قیمت : تیس روپے۔

زہد و رقائق اسلامیات کا ایک مستقل اور اہم باب ہے جس میں بندے کے تعلق مع اللہ اور دنیا کی بےثباتی کا درس ہوتا ہے۔ یوں تو احادیث کی کتابوں میں عموماً اس کا مستقل باب ہوتا ہے اور اس کے ماتحت اخلاص ، للٰہیت ، عبدیت ، اخلاق اور ایمان و یقین کے سلسلے کی احادیث و آثار درج ہوتی ہیں ، مگر اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے اسلام نے اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ، جن میں حضرت امام عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۸۱ھ) کی یہ کتاب سب سے قدیم اور اہم ہے۔ مصنف کی جلالت شان اور کتاب کی قدامت کی وجہ سے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں موضوع سے متعلق احادیث رسول ، آثار صحابہ اور اسلاف کے اقوال و واقعات محدثانہ انداز میں سند کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں جو تیسری صدی تک کی اسلامی تصانیف کی خصوصیات میں شامل ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے دنیا کے خال خال کتب خانوں میں تھے ، چنانچہ موجودہ نسخہ مصر و شام اور ہندوستان کے تین قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ اور یہ اہم علمی و دینی خـــدمت حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے انجام دی ہے جو احادیث و آثار کے متون و رجـال کے زبردست عالم ہیں اور حدیث کی متعدد نایاب و نادر کتابوں کو ایڈٹ کرچکے ہیں۔ حق یہ ہے کہ بوریہ نشینی اور بے سروسامانی میں بھی تحقیق و تعلیق کا وہی معیار قائم کیا گیا ہے جو آج کل کے علمی عشرت خانوں میں مطلوب ہے۔ ابتدا میں حضرت محقق کے قلم سے عربی زبان میں ۶۳ صفحات کا پُرمغز مقدمہ ہے جس میں کتاب کی اہمیت موضوع کی افادیت اور حضرت مصنف کی شخصیت سے متعلق بحث ہے۔ اس کے بعد ۵۶۴ صفحات تک اصل کتاب ہے۔ پھر امام نعیـــم بن حمـاد کی روایت سے کتاب الزھد والرقائق کے زیادات کو الگ سے ۱۳۲ صفحات میں کتاب سے متصل ہی چھاپا گیا ہے۔ آخر میں جدید طرز کی ہرقسم کی فہرستیں مرتب کی گئی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ احادیث و آثار کے قدیم

ترین مدوّنات میں سے ایک اہم اور مستند مدون ہمارے سامنے آ گیا اور وہ بھی حضرت امام عبداللہ بن مبارک جیسے مشہور و مستند اور امام اسلام کی کتاب کی شکل میں۔ جو لوگ احادیث و آثار کے ذخیروں کو تیسری اور چوتھی ہجری کی پیداوار خیال کرتے ہیں اور اس بارے میں غلط فہمی پھیلاتے ہیں ان کے لئے اس قسم کے قدیم ذخیرے گویا چیلنج ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ علمی خزانوں میں اسے اہم جگہ ملے۔ خاص طور سے یہ مدارس اسلامیہ اور علماء کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔

قاضی اطہر مبارک پوری

غزال رعنا، مرتبۂ جاوید وششٹ، کتاب بھون، کلاں محل، دہلی ٦
صفحات: ۲۱٦، قیمت چھے روپے

اردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر، محمد قلی قطب شاہ، معانی، بقول ڈاکٹر محی الدین زور ایک ہند لمانی یا ہندو مسلم ثقافت کا بانی تھا۔ قطب شاہ کے ذہن و فکر کی یہ نیرنگی اور جدت اس کی غزلیات میں بھی موجود ہے۔ شمال کے شعرا کی طرح وہ غیر ملکی موضوعات اور فارسی انداز بیان میں کلی طور پر گرفتار نہیں تھا بلکہ مقامی رنگ اور رسوم و رواج بھی اس کے پیش نظر رہے۔ غزال رعنا اس کی غزلوں کا انتخاب ہے جو دلی کالج کے صدر شعبۂ اردو جاوید وششٹ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ انتخاب میں جو غزلیں شامل ہیں، ان سے قلی قطب شاہ کے حالات زندگی اور افکار و میلانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں سب سے نمایاں خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ قلی قطب شاہ نے غزل کے موضوعات کو مذہب، اخلاق، فلسفہ اور تصوف کے دائروں تک پہنچانے کے بجائے خالص لغوی معنوں میں پیش کیا۔ ان غزلیات کو پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ «اس کی بیشتر غزلیں، گفتگو با زناں، کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔» قلی قطب شاہ کی مبالغہ آمیز مذہب پرستی اور عیاشی بھی ان غزلوں سے آشکارا ہے۔ بقول ڈاکٹر زور «عشق و عاشقی کے سلسلے میں کا سلطان محمد قلی نے جہاں شاعری میں کمال حاصل کیا، ساتھ ہی تصوف کا چسکہ پیدا کر لیا»۔ عقائد اور فطرت کے تصادم کے نتیجے میں قلی قطب شاہ کی شاعری میں ایک نیا رخ پیدا ہو گیا اور وہ اپنی محبوباؤں کے وصال کو نبی کا

صدقہ اور ائمہ کا کرم سمجھنے لگا»:

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے کرو عیش جم بارا پیاریاں سوں پیارے

زیر نظر انتخاب میں «حافظ و معانی» کے عنوان سے حافظ اور قلی قطب شاہ کے ہم معنی اشعار بھی دئیے گئے ہیں۔ ان اشعار میں قلی قطب شاہ وہ زور، جوش اور روانی نہیں پیدا کرسکا جو اس کی دوسری غزلوں میں پائی جاتی ہے۔

آثار محروم (رسالۂ پگڈنڈی، امرتسر کا محروم نمبر) مرتبۂ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۷۰ع، صفحات ۲٦۸، قیمت ۷ رُپے

آثار محروم میں اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم کی حیات اور فن پر ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کے خیالات اور احساسات کو عمدگی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ یوں تو محروم کی شخصیت اور ان کے پختہ فن پر وقتاً فوقتاً ملک کے مختلف رسائل میں مضامین شائع ہوتے رہے ہیں لیکن زیر نظر نمبر میں اس درویش صفت شاعر کے فکر و فن اور رجحانات و میلانات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ محروم کا غائر مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ نمبر اطمینان بخش ثابت ہوگا۔ محروم نے حالی، چکبست اور اقبال کی روایتوں کو آگے بڑھایا ہے۔ اردو کی ادبی، علمی اور لسانی ترقی میں ان کے سرمایے کا بھی حصہ ہے۔ ان تمام حقائق کو اس نمبر کے ممتاز اور معروف لکھنے والوں نے اجاگر کیا ہے۔ اس مخصوص نمبر میں فراق گورکھپوری، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر محی الدین زور وغیرہ جیسے نامور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں۔

الفوز العظیم از حبیب الرحمن خان شروانی، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈھ، سنہ ۱۹٦۸ع، صفحات ۸۲۔ قیمت درج نہیں۔

«الفوز العظیم» مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کا سفرنامۂ حجاز ہے جو دوسری بار شائع ہوا ہے۔ اس میں شروانی مرحوم کی خلوص، عقیدت اور محبت سے مملو ایسی تحریریں ملتی ہیں جو اردو ادب میں ایک نئے طرز کی نشان دہی کرتی ہیں۔ ان تحریروں میں حسن عقیدت اور اخلاص جذبات کا دلکش اور شگفتہ رنگ نظر آتا ہے۔ سفرنامے میں «رویائے عظیمہ» کے عنوان کے تحت جو تأثرات پیش کئے ہیں، وہ آج کے قاری کو کچھ اجنبی سے محسوس ہونگے لیکن عشق حبیب میں ڈوبے ہوئے انسان کے لئے یہ باتیں خلاف واقعہ نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ

یہ سفرنامہ بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی «اخلاص و عقیدت کے جذبات قلبی تأثرات اور باطنی کوائف میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کی ہر ہر سطر سے حسن اور حسن ادب کا آب زلال ٹپکتا ہے»۔

فانی کی شاعری از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، نسیم بکڈپو، لکھنو، سنہ ۱۹۶۹ع، صفحات ۲۳۸، قیمت ساڑھے چار روپے

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی تصنیف «فانی کی شاعری» دراصل اُن کا ایک مقالہ ہے جسے بعد میں قطع و برید اور ترمیم و اضافے کے بعد کتاب کی شکل دی گئی ہے۔ اس سے قبل اردو میں فانی پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں وہ یا تو تشنہ ہیں یا پرانی تحقیقات کا پرتو۔ زیر نظر مقالہ میں ڈاکٹر صدیقی نے مختلف عنوانات کے تحت فکر و فن کو وضاحت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

فانی کی شخصیت اور فلسفۂ غم کی ماہیت اور اہمیت پر جو مضامین ہیں، ان کی روشنی میں فانی کے غمِ دنیا اور غم عاشقی کی تفہیم آسانی سے ہوتی ہے۔ فانی کا غم اور عشق دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ فانی کی شخصیت، حقیقت شناسی، فلسفیانہ ژرف نگاہی اور قدرتِ ترجمانی نے ان دونوں جذبوں کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔

کتاب کا ایک باب فانی کا تصوف ہے۔ فانی نے جن صوفیانہ خیالات کو نظم کیا ہے اُن سے فانی کی یاسیت، محرومی اور دنیا سے بیزاری، تجریدی اور عملی صورت میں نظر آتی ہے۔ فانی کے تصوف سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر صدیقی نے بیشتر دوسروں کی رایوں کا تجزیہ کیا ہے۔

فانی کے خیالات اور تصورات پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں ان کا تجزیہ بھی مصنف نے ایک باب میں کیا ہے۔ اسی طرح سے ایک باب میں فانی کی غزلگوئی کی امتیازی خصوصیات بتائی ہیں اور فانی کی غزلوں کے موضوعات سے بحث کی ہے۔

کتاب میں ایک ضمیمہ کے ذریعے ان مخصوص تراکیب کی فہرست دی گئی ہے جو فانی کی جدت پسندی، زبان دانی اور تلاش و تجسس کا نتیجہ کہے جاسکتے ہیں۔ فہرست بہشت شوق، ادا آشنا بےخلش مدعا، جلوہ آتش پنہاں، جواب بے سوال وغیرہ جیسی نادر ترکیبیں نظر آتی ہیں۔

کتاب کے آخر میں فاضل مصنف نے فانی کا منتخب کلام بھی دیا ہے۔

یہ کتاب فانیات میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

فہرست عنوانات

۱	مذہبیات	۱
۲	تذکرہ و سیرت نگاری	۷
۳	تنقید، ادب، لسانیات	۱۲
۴	تاریخ و سیاسیات	۳۲
۵	تعلیمات	۳۶
٦	آرٹ	۳۷
۷	متفرقات	۳۷

مذہبیات

۱ احسان الٰہی ، ڈاکٹر رانا
علامہ محمد طاہر پٹنی اور ان کی
مجمع بحار الانوار
(المعارف ، لاہور ، جنوری ۶۹ ، ۱۰ تا ۲۳)
علامہ پٹنی نے اس کتاب میں احادیث ،
آثار ، قرآن مجید کے غریب الفاظ
اور نادر نکات بھی پیش کئے ہیں ۔

۲ احمد سعید ، پروفیسر
سر سید اور علمائے دیوبند
(المعارف ، لاہور ، مارچ ۶۹ ، ۱ د تا ۵۶)
علمائے دیوبند نے سرسید کے مذہبی
خیالات کی مخالفت کے باوجود
ان کو ملحد تصور نہ کیا ۔

۳ اختر راہی
اناجیل اربعہ پر ایک نظر
(زندگی ، رامپور ، فروری ۶۹ ، ۶ تا ۵۳)
اناجیل مروجہ کو سامنے رکھ کر
یہ بتایا ہے کہ اس وقت اس
کا کوئی اصلی نسخہ موجود نہیں
ہے اور ان کی تاریخی حیثیت
متعین کرنے کے مختلف طریقے
بتائے ہیں ۔

۴ ارشد ، رشید احمد
اسلام اور جدید تحریکات
(بینات ، کراچی فروری ۶۹ ، ۱۳ تا ۲۵)
بتایا ہے کہ اسلام وطنیت کے مضر
اثرات ، قومی تعصب مذہب ، اور
قومیت ، کمیونزم وغیرہ سے کس
طرح اپنے ماننے والوں کو ان
چیزوں سے دور رکھتا ہے اور
خلافت الہیہ کی اہمیت پر زور
دیتا ہے ۔

۵ اظہر ، غلام حسین
فطرت انسانی
قرآن اور حدیث کی روشنی میں
(زندگی ، رامپور ، فروری ۶۹ ، ۳۸ تا ۴۵)
فطرت انسانی کا مطالعہ قرآن اور
حدیث کی روشنی میں کیا ہے ۔

۶ اقبال احمد اعظمی
نظریۂ ارتقا (ایک گمراہ کن تحقیق)
(زندگی ، رامپور ، نومبر و دسمبر ۶۹ ، ۲۶ تا ۳۱ و ۲۰ تا ۲۸)
ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو گمراہ کن
اور غلط قرار دیا ہے ۔

۷ امین احسن اصلاحی
پردہ اور قرآن
(الفرقان ، لکھنو ، جون ۶۹)
اسلامی پردہ سے متعلق اس کے
حدود ، اس کی مختلف کیفیات
اور اس سلسلہ میں پردہ کی
خاص خاص رخصتوں کا تجزیہ
کیا ہے ۔ نیز مروجہ پردہ پر
تنقید کی ہے ۔

۸ امین احسن اصلاحی
اسلامی ریاست میں عورتوں کے
حقوق و فرائض
(الفرقان ، لکھنؤ ، نومبر ۶۹)

مضمون میں مضمون نگار نے اسلامی
ریاست کے خد و خال پیش
کرتے ہوئے عورتوں کا کیا مقام
ہے ثابت کرنے کی کوشش
کی ہے۔

۹ انور الجندی
اسلام اور مغرب
(المعارف، لاہور، فروری ۶۹، ۳۵ تا ۴۳)
مغرب میں تبلیغ اسلام کی راہ میں
جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا
ان کا ذکر ہے اور مسلمانوں
کی مذہبی رواداری پر روشنی
ڈالی ہے۔

۱۰ انوار علی خاں سوز
عورت اور اسلام
(برہان، دہلی، جون ۶۹، ۳۶۵ تا ۳۸۶)
اصلاً یہ مقالہ جنسیات اور اسلام
کے موضوع پر ہے اور ضمناً
اس میں اسلامی نظام زندگی
میں عورت کے مرتبہ و مقام
پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۱ اے۔ ڈی۔ ارشد، ڈاکٹر
فیضی کا مذہب
(اردو سہ ماہی، کراچی اپریل تا جون ۶۹، شمارہ ۲ ۵ تا ۲۲)
یہ بتایا ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی
کے بیان کے مطابق وہ ملحد
بےدین اور دہریہ تھا۔

۱۲ بشیر حسین جعفری
الجمہوریۃ اللبنانیہ
(زندگی، رامپور، جنوری ۶۹، ۵۱ تا ۵۶)
جمہوریہ انسان کا محل وقوع، مغربی
حالات تاریخی پس منظر اور
معاشی اقتصادی حالات کا ذکر ہے۔

۱۳ جلال الدین عمری
کیا رامچندرجی اور کرشن جی خدا
کے رسول تھے؟
(زندگی، رامپور، جنوری ۶۹، ۹ تا ۲)
یہ ثابت کیا ہے کہ رامچندرجی اور
کرشن جی خدا کے رسول نہ
تھے، یہ لوگ دیندار اور عادل
انسان ضرور کہلائے جاسکتے ہیں

۱۴ جمال احمد، سید
راہ خدا میں سبقت و اولیت
اہل حق کا مطلوب کردار
(زندگی، رامپور، مارچ ۶۹، ۳۱ تا ۴۹)
یہ بتایا ہے کہ خالق کائنات نے ہر
انسان کی فطرت میں یہ بات
ودیعت فرمادی ہے کہ وہ اپنے
محسن و منعم سے محبت کرے۔

۱۵ سعید احمد اکبرآبادی
التقریظ والانتقاد
(برہان، دہلی، مارچ ۶۹، ۲۰۷ تا ۲۱۰)
قرآن مجید کی تفسیر ماجدی (مؤلفہ
مولانا عبدالماجد دریابادی) کی
جلد اول پر تبصرہ۔ بعض قرآنی
آیات کے ترجمہ کی
فروگذاشتوں کی نشان دہی کی

اور مولوی نذیر احمد دہلوی
کےترجمہ قرآن کو سراہا ہے۔

۱۶ سعید اکبرآبادی
الانسان فی القرآن
(برہان، اپریل ٦٩، ۲۲۱ تا ۲۳٦)
کلام ربانی کی روشنی میں یہ بتانے
کی کوشش کی ہے کہ انسان
کون ہے؟ وہ کیوں پیدا کیا گیا
اور اس کی ماہیت کیا ہے؟
اصلی صفات اور کمالات، نقائص
اور کمزوریاں کیا ہیں۔

۱۷ سعید رمضان
نشان راہ (۲)
(فاران، کراچی، اپریل ٦٩، ۳٦ تا ۵۲)
اسلام کے نظام حکومت پر بحث
کی ہے اور بتایا ہے کہ اس
نظام سے بہتر کوئی نظام نہیں
ہے اگر اس پر عمل پیرا ہوجائے۔

۱۸ شمش نوید عثمانی
اللہ کا آخری رسول
خالق اور مخلوق کے ساتھ
(زندگی، رامپور، نومبر ٦٩، ۹ تا ۱۰)
اس مضمون میں حضور رسول مقبول
کے ان تعلقات کا ذکر ہے جو
کہ انہوں نے خالق و مخلوق
کے ساتھ بیک وقت اپنے اندر
فرمائے تھے۔

۱۹ ضیاء الدین اصلاحی
معالم السنن امام خطابی
(معارف، اعظم گڈھ، دسمبر ٦٩)
امام خطابی کی تصنیف معالم السنن
کی خصوصیات مترجمہ اقتباسات
کے ساتھ بتائی ہیں۔

۲۰ عبدالباری
اسلام میں مسئلہ غلامی کی نوعیت
(زندگی، رامپور، دسمبر ٦٩، ۱۷)
یہ بتایا ہے کہ اسلام میں غلامی
کی نوعیت دیگر مذہبوں جیسی
نہ تھی بلکہ ایک رحمت تھی
اور غلاموں کو سب حقوق
حاصل تھے۔

۲۱ عبداللہ منہاس
قرآن ــــ عظیم ترین کتاب
(زندگی، رامپور، جنوری ٦٦، ۲۱ تا ۳۱)
چند مغربی مفکرین کی رایوں کو
جمع کردیا گیا ہے جن میں
قرآن کی عظمت کا اعتراف
کیا گیا ہے۔

۲۲ عماد الحسن آزاد فاروقی
"شعوبیہ"
تاریخ اسلام کی ایک اہم تحریک
(جامعہ، دہلی، جنوری ٦٩)
خلافت بنو اُمیہ کے زوال اور
خلافت بنوعباس کے قیام میں
شعوبیہ تحریک کی اہمیت سے
بحث کی ہے۔

۲۳ مقتدیٰ حسن
مجازات قرآن :۔ شریف رضی
[معارف، اعظم گڈھ، اگست ۶۹]
شریف رضی کی تصنیف مجازات قرآن کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ نیز مجاز کے اصطلاحی مفہوم اور قرآن مجید میں مجاز کے وجود سے بحث کی ہے۔

۲۴ محمد اقبال مجدّدی
علم کلام پر علامہ شبلی کا ایک نایاب لکچر
[معارف، اعظم گڈھ، اکتوبر ۶۹]
یہ لکچر حیدرآباد میں پڑھا گیا تھا اور اس میں علم کلام کی مختصر تاریخ، اہمیت اور ضرورت بتلائی ہے۔

۲۵ محمد اسحاق
چند قراء
[المعارف، لاہور، مارچ ۶۹، ۲۵ تا ۴۰]
قرآن کریم کے چند قاریوں کے مختصر حالات زندگی اور قرأت میں ان کی مہارت کا ذکر ہے۔

۲۶ محمد بدیع الزماں
اقبال اور تصوف
[شیرازہ، دوماہی، سری نگر، شمارہ ۳ سنہ۶۹، ۵۰ تا ۵۷]
بتایا ہے کہ تصوف کے معاملے میں اقبال وحدة الوجود یا ہمہ اوست کے مخالف تھے۔ وہ وحدة الشہود یا «ہمہ ازوست» کے قائل تھے۔

۲۷ محمد تقی امینیؔ
سٹہ بازی اور اسٹاک اکسچینج پر خرید و فروخت
برہان، دہلی، ستمبر ۶۹، ۱۴۹ تا ۱۶۶
اکتوبر ۶۹(۲۴۴ تا ۲۶۱)
اس موضوع پر اسلامی حکم پیش کیا ہے۔

۲۸ محمد تقی امینی
ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر
(برہان، دہلی، نومبر ۶۹، ۲۹۶ تا ۳۱۳)
اس مسئلہ پر کوئی اجتماعی فیصلہ نہ ہو سکا چند باتیں ذکر کی ہیں جو شاید مفید ثابت ہوں۔

۲۹ محمد عبداللہ ایوبی، ڈاکٹر
اسلامی ریاست کا تصور
(زندگی، رامپور، مارچ ۶۹، ص ۹ تا ۱۹)
یہ بتایا ہے کہ اسلامی ریاست کا تصور مغربی ریاست کے تصور سے جدا ہے، اسلامی ریاست میں مذہب حکومت سے جدا نہیں رہ سکتا۔

۳۰ محمد عمر
گرونانک، اسلام اور تصوف
[آجکل، دہلی، نومبر ۶۹، ص ۱۶ تا ۲۱]
گرونانک کی تعلیمات اور اسلامی عقاید میں بڑی حد تک مطابقت بتلائی ہے۔

۳۱ محمد قطب
اسلام اور تہذیب
(زندگی، رامپور ، اگست ۶۹، ص ۴۲ تا ۴۵)
یہ بتایا ہے کہ اسلام کسی ایسی تہذیب کی مخالفت نہیں کرتا جس کا مقصد انسانیت کی خدمت ہے ۔

۳۲ محمد قطب الدین احمد بختیار
قرآن کا منہاج فکر و نظر
(برہان، دہلی ، اگست ۶۹ ، ص ۱۰۵ تا ۱۱۹)
ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی تالیف کا ترجمہ

۳۳ محمد نعیم ندوی
علامہ عینی اور عمدۃ القاری
(معارف ، اعظم گڈھ، جنوری ، مارچ ۶۹)
صحیح بخاری کے حنفی شارح علامہ بدرالدین عینی کے حالات فضل و کمال اور ان کی ممتاز تصانیف کا تعارف ہے ۔ عمدۃ القاری کا تعارف بہ تفصیل درج ہے ۔

۳۴ محمد نعیم ندوی
مولانا امام مالک کے مستند ترین راوی یحییٰ مصمودی
(فاران ، کراچی ، اپریل ۶۹، ص ۱۶ تا ۲۱)
یحییٰ مصمودی کے حالات زندگی اور جامعیت پر بحث کی ہے ۔

۳۵ مشیرالحق ایم ـ اے ، ڈاکٹر
انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیئت شرعی
(برہان ، دہلی ، اکتوبر ۶۹، ص ۲۱۷ تا ۲۲۰)
شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ دارالحرب کا ایک علمی تجزیہ

۳۶ م ـ ع رحمٰن حمیدی
تواضع
(برہان ، دہلی ، جون ۶۹ ، ص ۳۹۵ تا ۴۰۰)
تواضع کی لغوی تشریح اور شرعی مفہوم سمجھایا گیا ہے ۔

۳۷ نجات اللہ صدیقی ، ڈاکٹر
العدالۃ الاجماعیہ
(زندگی ، رامپور ، مئی ۶۹، ص ۲۵ تا ۴۰)
تحریک اسلامی کے داعی سید قطب مصری کے مقدمے کی روداد اور پھانسی کی سزا کا حال بیان کیا ہے ۔

۳۸ نشت چغتائی پروفیسر
مترجم نذیرالدین مینائی
مولود خوانی کی روایت
[مسلمانوں بالخصوص ترکوں میں]
(جامعہ ، دہلی ، اکتوبر ۶۹)
مولود خوانی کی روایت کا آغاز تیسری صدی ہجری میں ہوا پندرہویں صدی عیسوی میں اس کا رواج عام ہوا ایک تاریخی و ادبی جائزہ ہے ۔

۳۹ نعیم صدیقی
دور حاضر کا انسان اور اسلام
(زندگی ، رامپور ، اگست ۶۹، ص ۹ تا ۲۱)
یہ بتایا ہے کہ دور حاضر کا انسان

سب سے بڑا پر اہم ہے اور
اسلام صحیح معنوں میں اس
کے مسائل کا حل ہے ۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۴۰ آغا محمد باقر
آب حیات کے مسودے میں غالب
کے حالات
(صحیفہ، لاہور، جنوری ٦۹، ص ۱٦ تا ٦۰)
غالب کے حالات جو مولانا محمد
حسین آزاد نے آب حیات کے
مسودے میں اپنے ہاتھ سے
تحریر فرمائے ہیں پیش کیا ہے۔

۴۱ آل احمد سرور ، پروفیسر
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
(اردو ادب ، علی گڈھ، (ذاکر نمبر) شمارہ نمبر ۲)
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
گنائی ہیں اور انکا سرسری
تنقیدی جائزہ لیا ہے ۔

۴۲ ابراھیم فکری
دارالعلوم ، دیوبند
(آجکل ، دہلی ، جون ٦۹ ، ص ۴ تا ۴۷)
دارا لعلوم دیوبند کی تاسیس اور
اسکی علمی و دینی خدمات کا
جائزہ ہے ۔ دارالعلوم سے متعلق
اہم شخصیتوں کا بھی ذکر ہے ۔

۴۳ احتشام احمد ندوی ، ڈاکٹر سید
غالب ہندوستانیت کے لباس میں
(سب رس ، حیدر آباد غالب نمبر ستمبر ٦۹)
غالب کے کلام میں بعض مشاہیر
اور مقامات کے نام اور
ہندوستانی ثقافت کی جھلکیاں
ملتی ہیں ۔

۴۴ احتشام احمد ندوی ، ڈاکٹر سیّد
تقریب بھر ملاقات
(سب رس، حیدرآباد ، اپریل ٦۹ ۳۸ تا ۴۰)
مرحوم پروفیسر نجیب اشرف ندوی
سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا
ہے اور تاثرات پیش کئے ہیں ۔

۴۵ احتشام حسین ، سید
پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم
(سب رس ، حیدر آباد، نجیب اشرف ندوی نمبر ٦۹ اپریل)
پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے
علمی و ادبی کارنامے بیان کئے
ہیں ۔

۴٦ احمد شفیع ، سید
مرزا اسداللہ خان غالب
(فروغ اردو، لکھنؤ ، جنوری و فروری ٦۹ ، ۲۲ تا ۳۰)
غالب پر ۱۸۹٦ میں لکھا گیا ایک
مضمون جس میں ان کی زندگی
اورشاعری پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔

۴۷ احمد علی خان ادیب
(سب رس ، حیدرآباد ، ٦۹ مارچ)
حضرت صدق جائیسی مرحوم
شخصیت ۔ معمولات ، تعلقات اور
کلام پر تبصرہ ۔

۴۸ اطہر مبارکپوری
حضرت میر علی عاشقان سرائمیری
(معارف، اعظمگڈھ، ٦٩ نومبر و دسمبر)
حضرت میر علی عاشقان سرائمیری
جونپوری متوفی ۹۵۰ء کے
سوانح حیات۔

۴۹ اعجاز صدیقی
شادِ ناشاد
(شاعر، بمبئی، ٦٩ جولائی)
نریش کمار شاد کے حالاتِ زندگی،
ذاتی تعلقات اور تاثرات

۵۰ افتخار جالب
غالب ہئیت شناس و ہئیت ساز
غالب کی ہئیت شناسی اور ہئیت
سازی کے معجزانہ کمال پر
روشنی ڈالی ہے۔

۵۱ امتیاز علی تاج، سید
جدید سوانح نگاری
(المعارف، لاہور جنوری ٦٩، ۳ تا ۸)
یہ بتایا گیا ہے کہ ادھر پچیس
تیس سال میں سوانح نگاری
کو ایک مستقل صنعت قرار
دے کر لکھا جا رہا ہے۔

۵۲ انور صدیقی
نہرو — ایک ادیب
(جامعہ، دہلی، جنوری ٦٩)
پنڈت نہرو کی ادیبانہ خصوصیات
کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے
کہ نہرو کن کن انگریزی ادیبوں
سے متاثر تھے۔

۵۳ انور صدیقی
اردو کے نئے شاعر — مخمور سعید
(جامعہ، دہلی، ستمبر ٦
مخمور سعیدی میں ماضی کی
اور فکری وابستگیوں اور نـ
جمالیاتی معیاروں کے قبول کر
میں ایک پُر خلوص کشمک
کے نقوش ملتے ہیں۔ مخ
فکر و فن کی راہیں سلاہ
روی سے طے کر رہے ہیں

۵۴ بھٹاچاریہ، بھبانی، ڈاکٹر
رابندر ناتھ ٹیگور
(شاعر، بمبئی گاندھی نمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر
اگرچہ گاندھی جی اور ٹیگور
مختلف نظریات کے نمائند
تھے، پھر بھی یہ نظریئے ایک
دوسرے سے مربوط ومخلوط تھ

۵۵ پروفیسر نریش
غالب اور تلسی داس
(شہزادہ دوماہی، سری نگر، شمارہ ۳، ٦٩، ۲۱ تا ۵
یہ بتایا ہے کہ غالب اور تلسی دا
مختلف زمانوں اور مختلف زبانو
سے تعلق رکھتے ہوئے ذ
طور پر بڑی مماثلت رکھتے ہیں

۵۶ تنویر احمد علوی
غالب اور ذوق کی معاصرانہ چشمک
(تحریک، دہلی، دسمبر ٦٩، ۱۳ تا ۵
غالب اور ذوق کی حریفانہ مسابقہ

نوائے ادب ، بمبئی

سب سے بڑا پر اہم ہے
اسلام صحیح معنوں میں اہ
کے مسائل کا حل ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۴۰ آغا محمد باقر
آب حیات کے مسودے میں غالب
کے حالات
(صحیفہ، لاہور، جنوری ۶۹، ص ۱۶ تا ۶۰)
غالب کے حالات جو مولانا محمد
حسین آزاد نے آب حیات کے
مسودے میں اپنے ہاتھ سے
تحریر فرمائے ہیں پیش کیا ہے۔

۴۱ آل احمد سرور، پروفیسر
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
(اردو ادب، علی گڑھ، (ذاکر نمبر) شمارہ نمبر ۲)
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات
گنائی ہیں اور انکا سرسری
تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

۴۲ ابراھیم فکری
دارالعلوم ، دیوبند
(آجکل، دہلی، جون ۶۹، ص ۴ تا ۴۷)
دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور
اسکی علمی و دینی خدمات کا
جائزہ ہے۔ دارالعلوم سے متعلق
اہم شخصیتوں کا بھی ذکر ہے۔

۴۳ احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سید
غالب ہندوستانیت کے لباس میں

۴۵ ا۔ز
پرو ور
(سب رس، حیـ
پروفیـ
علـ
ہیں

۴۶ احمد شفیـ
مرزا اسداللہ
(فروغ اردو، لکھنو، جنو
غالب پر ۸۹۶
مضمون جس
اورشاعری پر

۴۷ احمد علی خاں ادیـ
(سب رس، حیـ
حضرت صدق جائسی
شخصیت۔ معمولات،
کلام پر تبصرہ۔

٦۴ خواجہ غلام السیدین
ڈاکٹر ذاکر حسین
(اردو ادب، علی گڑھ، ذاکرنمبر، ٦۹، شمارہ ۳)
ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات پر اپنے تأثرات کا اظہار کیا ہے اور ان کے کارہائے نمایاں بیان کئے ہیں۔

حور شید نعمانی
ن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
بی، جنوری ٦۹، مدوی نمبر شمارہ ۱)
ص۔٦ تا ۳۔
۔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام اور کارکردگی کا جائزہ

۲۵)
اسی داس
مختلف زبانوں
ہوئے ذہنی
مماثلت رکھتے ہیں۔

اکٹر
م آزاد
رہ دسمبر)
ات ،

علوی
ذوق کی معاصرانہ چشمک
تحریک، دہلی، دسمبر ٦۹، ۱۳ تا ۱۵)
ب اور ذوق کی حریفانہ مسابقت

شمارہ ۲، ۷۲ تا
ہادی کی زندگی، غزل ا
قصیدوں پر روشنی ڈالی ہے اور زندگی میں انہیں جن مصائ سے دوچار ہونا پڑا ان کا ذکر کیا ہے۔

٦۸ ذوالفقار غلام حسین، ڈاکٹر
غالب، حیات و کلام پر ایک قدیم تحریر
اردو سہ‌ماہی، کراچی، اپریل تا جون ٦۹، شمارہ ۲)
ص ۲٦۱ تا ۲٦۴
اس مضمون میں تذکرہ حضرت غالب دہلوی مصنفہ محمد علی شیر کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ غالب کی وفات کے ۸ سال بعد لکھی گئی ہے۔

٦۹ رشید امجد
غالب، بٹی ہوئی شخصیت کا مسئلہ
(صحیفہ، لاہور، اپریل ٦۹، ۳۲ تا ۳۵)
یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب ایک طرف اپنے دور کی عظمت کی قسم کھاتے ہیں اور دوسری جانب کمال خاموشی سے اس کے کھوکھلے پن پر پڑے ہوئے [illegible]

وصیع
حریفی میں
[illegible]
ن چکاں

(آجکل، دہلی، نومبر ۶۹، ۲۲ تا ۲۴)
یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تمام مذہبی
تفرقوں سے بالاتر تھے اور
انسانی مساوات کے علمبردار تھے۔

۷۲ ریاض الدین شروانی
ذاکر صاحب — ذاتی تاثرات
جامعہ، دہلی، ۶۹ جولائی)
ذاکر صاحب کی شخصیت اور ان
کی تعلیمی ثقافتی اور ملکی
خدمات پر تبصرہ کیا ہے۔

۷۳ ریاض الرحمٰن شروانی
ابوالفرج المعانی الجریری النہروانی
معارف، اعظم گڈھ، ۶۹ مئی
قاضی ابوالفرج کے حالات بتفصیل
درج ہیں۔

۷۴ زہرہ کڈالکر، مس
گاندھی جی، ایک شخصیت
ایک مطالعہ
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)
گاندھی جی کی وسیع النظری،
اصول پرستی اور دیگر خوبیوں
کا تذکرہ کیا ہے۔

۷۵ سخاوت مرزا
دکن کے ایک ... شکاری قدس سرہ
(نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۶۸، شمارہ ۴، ۶۷ تا ۷۳)
دکن کے ایک قدیم گمنام صاحب
دیوان شاعر حضرت الا اللہ
شکاری کے حالات زندگی اور
کلام کا جائزہ لیا ہے۔

۷۶ سعادت علی صدیقی
غالب کا سفر کلکتہ
(فروغ، اردو، لکھنؤ، دسمبر، نومبر ۶۸، ۴۷ تا ۵۲)
زندگی میں غالب کا ایک طویل سفر
جو بسلسلہ بحالی پنشن کیا گیا
اسکی اہمیت بتائی گئی ہے جس
سے دوران سفر اور قیام کلکتہ
کے چند اہم حالات وواقعات کا
پتہ ملتا ہے۔

۷۷ سہیل بخاری، ڈاکٹر
غالب کی دورنگی
(صحیفہ، لاہور، اپریل ۶۹، ۵۲ تا ۶۱)
یہ بتایا ہے کہ تضاد اُن کا وہ من بھاتا
چہیتا ہتھیار ہے جسے غالب نے
اپنے سفروں میں کتنے ہی
ڈھنگ سے برتا ہے

۷۸ شریف احمد
ندوی صاحب اسماعیل کالج میں
(نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۶۹، ندوی نمبر، شمارہ ۱
ص ۳۹ تا ۵۹)
اسماعیل یوسف کالج، بمبئی میں
ندوی صاحب کی خدمات کا
جائزہ لیا ہے۔

۷۹ شریف الحسن عثمانی
غالب غالب کے آئینے میں
(فروغ، اردو، دسمبر و نومبر ۶۸، ۳۱ تا ۳۴)
اردو معلی سے ایسی تمام عبارتیں
انتخاب کر کے یکجا کی گئی ہیں
جن سے غالب کی زندگی کے
حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

۸۰ شکیل احمد عاصم
حضرت حفیظ میرٹھی
سب رس، حیدرآباد، جون سنہ ۱۹۶۹، ص ۳۲ تا ۳۹،
حفیظ ایک سلجھے ہوئے انسان، خوش فکر شاعر اردو، عظیم صحافی ہیں۔ وہ اقبال کے فلسفۂ حیات سے بے انتہا متاثر ہیں۔

۸۱ شہباز حسین
گرو نانک کے حالات زندگی
(آجکل، دہلی، نومبر ۶۹، ص ۷ تا ۸)
گرونانک کی پیدائش ابتدائی زندگی، جوانی اور دنیاوی باتوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے مکتی کی تلاش اور سکھ مذہب کی بنیاد کا ذکر ہے۔

۸۲ شمیم حنفی
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
(آجکل، دہلی، فروری ۶۹، ص ۲۷ تا ۲۹)
اس مضمون میں غالب کی مالی مشکلات اور پریشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۸۳ شہاب الدین دسنوی سیّد
سیّد نجیب اشرف ندوی اور اُنکا خاندان
(سب رس حیدرآباد، نجیب اشرف ندوی نمبر، ۶۹ اپریل)
سیّد نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم اور اُنکے خاندان سے متعلق معلومات۔

۸۴ شہید صفی پوری
غالب کی شخصیت
(فروغ اردو، دسمبر و نومبر ۶۸، ص ۳۵ تا ۳۹)
غالب کے انداز بیان پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُن کے انداز بیان نے ان کو زندگی کا شاعر بنا دیا ہے۔

۸۵ شیخ محمد اکرام
علّامہ شبلی نعمانی اور مغربی علوم سے استفادہ
(المعارف لاہور مارچ ۶۹ ص ۲ تا ۱۷)
بتایا ہے کہ کس طرح مولانا شبلی نے مستشرقین مثلاً سپر نگر اور میور وغیرہ کی کتابوں سے استفادہ حاصل کیا۔

۸۶ صاحبزادہ شوکت علی خاں
کیا مرزا غالب میر ممنون کے ممنون تھے
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
غالب نے سودا اور میر کے ہمعصر میر نظام الدین ممنون سے بندش الفاظ، وضع تراکیب و خیال آفرینی میں استفادہ کیا۔

۸۷ صالحہ عابد حسین
حکایات خوں چکاں

(شاعر بمبئی، فروری، مارچ ۶۹، ص ۳۲۳ تا ۳۳۸)
غالب کی عظمت کی پہچان اور
اسکی مقبولیت کا راز سمجھانے
کی کوشش کی ہے۔

۸۸ صباح الدین عبدالرحمان، سیّد
ذاکر صاحب
(معارف، اعظم گڈھ، ۶۹ جون، جولائی)
ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی سیرت
نگاری ذاتی تاثرات کے ساتھ کی
ہے۔

۸۹ صباح الدین عبدالرحمان
آہ! سید نجیب اشرف ندوی صاحب
(نوائے ادب بمبئی، جنوری ۶۹، ندوی نمبر
ص د تا ۲۰)
سید نجیب اشرف ندوی کے حالات
زندگی اور تصانیف کا جائزہ
لیا ہے۔

۹۰ صفی الدین صدیقی، ڈاکٹر
غالب نما
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر ۶۹، ستمبر)
حیات و کلام غالب پر لکھی گئی
کتابوں اور دقیع مضامین کا
تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

۹۱ ضیاء الدین اصلاحی
ابوالعلاء معری کے فکر و فلسفہ پر
ہندوستانی فلسفہ کے اثرات
(شیرازہ دوماہی سرینگر مارچ ۶۹، شمارہ ۲، ص ۹ تا ۲۲)
مشہور فلسفی ابوالعلاء معری

اپنے فکر و فلسفہ میں ہ
فلسفہ میں ہندوستانی
سے بڑی حد تک متاثر

۹۲ ضیاء الدین احمد بدایونی
نواب ظہوراللہ خان نوا بدایو
نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۶۸، شمارہ ۴، ص
نوا بدایونی کے حالات زن
شاعری کا جائزہ

۹۳ ضیاء حسینی
کوثر چاند پوری - فن اور
سب رس، حیدرآباد،
کوثر چاند پوری کے اف
فنی جائزہ لیا ہے۔
تعلقات کے پیشِ نظر
کا تعارف کر دیا ہے

۹۴ ظ، انصاری
غالب کی تلاش کا ایک
(صبا، حیدرآباد، اگست ۶۹، ص
یہ بتایا ہے کہ غالب کم
اور ان کے آدر
تصادم تھا اور اس
سے ان کا مطالعہ کرنا

۹۵ عالی جعفری، ڈاکٹر
میاں خوب محمد چشتی اح
تعارف
نوائے ادب بمبئی، جولائی ۶۸، شمارہ ۳، ص
میاں خوب محمد چش
حالات زندگی اور
کا تعارف ہے۔

٩٦ عبدالاحد خان خلیل ، ڈاکٹر
سودا اور غالب
(فروغ اردو، دسمبر و نومبر ٦٨، ٣١ تا ٤٦)
سودا اور غالب کا موازنہ کیا گیاہے ۔

٩٧ عبدالستار دلوی ڈاکٹر
ندوی صاحب !
شخصیت اور کردار
(سب رس حیدرآباد، نجیب اشرف ندوی نمبر، اپریل ٦٩)
ندوی صاحب کی زندگی رعنائی خیال سے عبارت تھی۔ وہ مشرقیت اور مغربیت کا حسین امتزاج تھے۔

٩٨ عبدالغفور ، خواجہ
مہاتما گاندھی اور ان کی خوش مذاقی
(شاعر بمبئی گاندھی نمبر، اکتوبر تا دسمبر ٦٩)
مہاتما گاندھی کی خوش مذاقی کی مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ وہ اپنی ظرافت طبع ہی کے باعث مخالفین کا مقابلہ کر نے کے قابل تھے ۰

٩٩ عتیق صدیقی
غالب پر ابولکلام آزاد کا مقالہ
(صحیفہ لاہور، جنوری ٦٩ ١٢٨ تا ١٥٥)
غالب پر ابوالکلام آزاد کی رائے پیش کی ہے ۰

١٠٠ عصمت جاوید
غالب کی عملی سوجھ بوجھ فن کے آئینے میں
(شاعر بمبئی ، فروری و مارچ ٦٩ ص ١٠٣ تا ١١٠)
غالب کے ، اور اسکی شخصیت کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالی ہے ۰

١٠١ عبدالقوی دسنوی
نجیب اشرف ندوی اور انکے نام چند خطوط
(سب رس ، حیدرآباد ، نجیب اشرف ندوی نمبر ، اپریل ٦٩)
پروفیسر ندوی کے علمی کارنامے بیان کئے ہیں اور انکے نام چند مشاہیر کے نام حطوط کی نقلیں پیش کی ہیں ۰

١٠٢ علوی تنویر احمد
بکٹ کہانی
(نوائے ادب، بمبئی ، اپریل ٦٩ ، شمارہ ٢ ، ص د تا ١٩)
بکٹ کہانی مصنفہ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کا تعارف اور جائزہ لیا ہے ۰

١٠٣ غلام رسول مہر
افکار غالب کے نئے زاوئیے
(صحیفہ ، لاہور جنوری ٦٩ ، ص ٤٠ تا ٤٦)
غالب کے اشعار کی تشریح و تفصیل نئے زاوئیے سے کی ہے ۰

١٠٤ فاروقی عباداللہ
ابن سینا
حیات وتصنیفات پر ایک نظر
(المعارف لاہور ، فروری ٦٩ ، ص ٤٢ تا ٦٩)
ابن سینا کی زندگی کو چار

حصّوں میں تقسیم کیا ہے
پہلا دور بخارا میں ان کا قیام
دوسرا دور جرجان (خوارزم)
تیسرا دور ہمدان اور چوتھا
دور اصفہان۔ پہلے تین ادوار کو
شیخ کی تصنیف و تالیف کا
زمانہ بتلایا جاتا ہے اور اصفہان
میں ان کتابوں کی تکمیل کا
زمانہ بتایا ہے۔ ابن سینا کی
چند کتابوں پر بحث کی ہے۔

۱۰۵ فرحت ہاشمی
نجیب اشرف ندوی۔ میرے چچا
(سب رس، حیدرآباد، نجیب اشرف ندوی نمبر، اپریل ۶۹)
نصیرالدین ہاشمی کے خاندان سے
پروفیسر ندوی مرحوم کے ذاتی
تعلقات کا ذکر ہے۔

۱۰۶ کبیر احمد جائسی
احمد کسروی تبریزی
(اردو ادب، علی گڑھ ۶۹، شمارہ ۲)
دورِ جدید کے ایک مشہور ایرانی
عالم و محقق کے تفصیلی حالات
بیان کئے گئے ہیں۔

۱۰۷ کرشن کرپلانی
بہرِ آزادی جئے بہرِ آزادی مرے
(آجکل دہلی، اکتوبر ۶۹، ص ۳ تا ۱۳)
مہاتما گاندھی کی پیدائش سے لیکر
موت تک ان کی زندگی اور
جد و جہد آزادی میں ان کی
کوششوں پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۸ کسریٰ منہاس
غالب کی تاریخ گوئی
(صحیفہ لاہور، جنوری ۶۹، ص ۸۲ تا ۱۰۶)
غالب کے فن تاریخ گوئی پر
روشنی ڈالی ہے۔

۱۰۹ کنور چوہان
آزاد گلاٹی
(تحریک، نومبر ۶۹، ص ۰۰)
ایک جدید ذہن رکھنے والے شاعر
آزاد گلاٹی کا تعارف۔

۱۱۰ گوپال متل
نریش کمار شاد
(تحریک، جون ۶۹، ص ۱۱)
مرحوم نریش کمار شاد کی موت
پر اظہار افسوس کیا ہے۔

۱۱۱ گوپی ناتھ امن
گاندھی جی کے چند مسلمان ساتھی
(آجکل دہلی، اکتوبر ۶۹، ص ۳۳ تا ۳۵)
اس مضمون میں گاندھی جی کے
چند مسلمان ساتھیوں، حکیم
اجمل خاں، مولانا محمد علی،
مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری
وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۱۲ گوری شنکر گپت
ترجمہ: ل، م شاہد
باپو فرصت کے لمحوں میں
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر ۶۹، اکتوبر تا دسمبر)

بتایا ہے کہ گاندھی جی فرصت
کے اوقات میں نئی زبانیں
سیکھتے تھے ۔

۱۱ لطیف حسین ادیب ، ڈاکٹر سیّد
بریلی میں غالب کے تلامذہ
ایک تذکرہ
(معارف ، اعظم گڑھ ، فروری ۶۹ ، ص ۱۳۳ تا ۱۵۰)
بریلی کی شاعری خاص طور پر
دو خاندانوں سے وابستہ تھی ایک
خاندان نوابین روہلیہ تھا اوردوسرا
مفتیان کا تھا غالب کے ٦ بریلوی
شاگردوں میں سے ۴ خاندان
مفتیان سے ہیں ۔ مضمون چھ
تلامذہ پر مشتمل تذکرہ ہے ۔

۱۱۴ مبارزالدین رفعت ، سیّد
گاندھی جی کی یاد میں
(شاعر بمبئی ، گاندھی نمبر ، ٦۹ اکتوبر تا دسمبر)
گاندھی جی کی قومی خدمات اور
انکی نیک سیرتی سے متعلق اپنے
تاثرات پیش کئے ہیں ۔

۱۱۵ محمد اسحاق
امام سفیان ثوریؒ
(المعارف ، لاہور ، اپریل ٦۹ ، ۲۱ تا ۳۴)
امام سفیان ثوریؒ کے نسب ، خاندانی
حالات اور حالات زندگی کا
جائزہ اور انکے زہد و ورع کا
ذکر کیا ہے ۔

۱۱٦ محمد اسماعیل پانی پتی ، شیخ
غالب آلام و امراض کے نرغے میں
(سب رس ، حیدرآباد ، غالب نمبر ، ستمبر ٦۹)
غالب کے آلام و مصائب و امراض
کا سلسلہ وار ذکر کیا ہے ۔

۱۱۷ محمد اکبرالدین ، صدیقی
غالب اور دکن
(سب رس ، حیدرآباد ، غالب نمبر ، ستمبر ٦۹)
غالب کے والد ، بہنوئی ، اور بھائی نے
حیدرآباد میں ملازمت کی ۔ صلے
کی امید میں غالب نے حیدرآباد
کے بہتیرے زعماء کی شان میں
قصیدے لکھے ، غالب کے کئی
شاگرد حیدرآباد آئے ۔

۱۱۸ محمد ایوب واقف
ندوی صاحب — چند یادیں
(سب رس ، حیدرآباد ، اپریل ٦۹ ، ۳۲ تا ۳۰)
مرحوم پروفیسر نجیب اشرف ندوی
کے مزاج ، عمق مطالعہ اورعلمی
و ادبی خدمات کو سراہا ہے ۔

۱۱۹ محمد حفیظ الرحمٰن
مدرسہ شمس الدین الہدی ، پٹنہ
(آجکل ، دہلی ، جولائی ٦۹ ، ۱۰ تا ٦۹)
پٹنہ کے مشہور عربی مدرسہ کی
سرگزشت بیان کی ہے ۔

۱۲۰ محمد حمید اللہ ، ڈاکٹر
امام محمد کی بارہ سو سالہ یادگار
وفات ترکی میں

(معارف ، اعظم گڈھ ، جون ۶۹)
امام محمد کے جشن کے جو
ترکی میں منایا گیا مختصر
حالات اور امام محمد کے فضل
و کمال کا ذکر۔

۱۰۱ محمد ضامن کنتوری سید
غالب اور بیدل
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ستمبر ۶۹)
غالب اور بیدل کے اشعار کا تقابلی
جائزہ لیکر بتایا ہے کہ غالب
طرز بیدل میں ریختہ کہنے میں
کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

۱۲۲ محمد ایوب واقف
گاندھی جی، اسلامیات کی روشنی میں
(شاعر ، بمبئی ، گاندھی جی نمبر ، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)
گاندھی جی کا دستور العمل قرآن مجید
کا دستورالعمل تھا۔

۱۲۳ محمد عبد الرزاق بسمل
محمد حبیب اللہ ذکا
غالب کے حیدرآبادی شاگرد
(سب رس ، غالب نمبر ، ستمبر ۶۹)
غالب کے ایک شاگرد کا تفصیلی
تعارف اور کلام پر تبصرہ۔

۱۲۴ محمد محفوظ الحسین
(شاعر ، بمبئی ، فروری مارچ ۶۹ ، ۲۰۰ تا ۲۰۲)
یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ
غالب صوفی ہرگز نہیں ہوسکتا
مگر وہ شاعر تصوف ہوسکتاہے۔

۱۲۵ محمود حسین میر
عابد میسوری اور نقشِ مُراد
(سب رس ، حیدرآباد ، مئی ۶۹)
میسور کے پہلے اردو شاعر کا
تعارف اور ان کی تصنیف مثنوی
نقش مراد کا تنقیدی جائزہ۔

۱۲۶ مخمور سعیدی
شکیل مظہری
(تحریک ، دہلی ، دسمبر ۶۹ ، ۴۳)
ایک نئے شاعر شکیل مظہری کو
متعارف کرایا ہے۔

۱۲۷ مناظر عاشق ہرگانوی
غالب اور غدر
(شاعر ، بمبئی ، فروری مارچ ۶۹ ، ص۲۹۵ تا ۲۹۸)
اردوئے معلیٰ ، دستنبو ، گلستان نثر
اور خطوط غالب کی مدد سے
غدر کےمتعلق غالب کے خود
نوشتہ حالات پیش کئے ہیں۔

۱۲۸ منظور الحسن برکاتی
رسالہ سوالات عبد الکریم کا مصنف
(آجکل ، دہلی ، فروری ۶۷ ، ۴۰ تا ۴۳)
یہ بتایا ہے کہ رسالہ سوالات
عبدالکریم کے مصنف خود
غالب تھے۔

۱۲۹ میمونہ دلوی ، ڈاکٹر
گاندھی جی اور ہندوستانی عورت
(شاعر ، بمبئی ، گاندھی نمبر ، اکتوبر تا دسمبر ۶۹)
گاندھی جی کے بیانات اور سیاسی
تحریکوں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا

ہے کہ گاندھی جی ہندوستانی
عورت کے لئے کس قسم کی
زندگی کے متمنّی تھے ۔

۱۳۰　میمونہ دلوی
بمبئی کے چند قدیم اردو اخبار
(نوائے ادب ،بمبئی ، اکتوبر ۶۸ ، شمارہ ۴-۴ تا ۶۷)
بمبئی کے چند قدیم اخباروں کا ذکر
ہے ۔

۱۳۱　میکش اکبر آبادی
منصور
(آجکل ، دہلی ، نومبر ۶۹ ، ۳۸ تا ۴۳)
منصور بن حلاّج اور اس کے
نعرہ اناالحق پر بحث کی ہے ۔

۱۳۲　نادم سیتاپوری
غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات
(اردو سہ ماہی ، کراچی ، جنوری تا مارچ ۶۹ ، شمارہ ۱)
غالب نمبر (۱۳۱ تا ۱۶۰)
غالب کے متعلق چند غیر معتبر
روایات کا ذکر کیا ہے اور
بتایا ہے کہ ان کی بذلہ سنج
و شوخ طبیعت کے باوجود
بعض روایات بالکل غلط ہیں ۔

۱۳۳　نثار احمد فاروقی
دیوان غالب کا ایک نادر مخطوطہ
(خود غالب کے قلم سے)
(آجکل دہلی ، جون ۶۹ ، ۲۷ تا ۳۴)
امروہہ کے ایک تاجر کتب
- جناب توفیق احمد قادری چشتی
کے پاس دیوان غالب کا نادر
مخطوطہ ہے جس کو خود غالب
نے ترتیب دیا ہے

۱۳۴　نذیر احمد ڈاکٹر
عبدالقادر نورس اور اسکا کلام
(معارف ، اعظم گڈھ ، جون ، جولائی ۶۹)
عادل شاہی دور کے ایک فارسی
گو شاعر سے متعلق معلومات
جو کتب خانہ مدراس کے ایک
مخطوطہ کے مطالعہ سے اخذ
کی ہیں ۔

۱۳۵　نسیم احمد فریدی
حضرت شیخ شہلب سہروردی قدس
سرہ
وصایا اور نصائح کے آئینے میں
(الفرقان ، لکھنؤ ، فروری تا جون ۶۹)
سہروردیؒ کی تعلیمات و ہدایات
کا ذکر جو انھوں نے اپنے خاص
خاص مریدین کو دی ہیں ۔
ان تعلیمات سے طریقۂ سہروردیہ
کے اصول اور خود شیخ کے
کردار کا علم ہوتا ہے

۱۳۶　نظام الدین ایس گوریکر ، پروفیسر
یاد گار زمانہ ہیں یہ لوگ
(سب رس ، حیدرآباد ، اپریل ۶۹ ، ۵۰ تا ۵۱)
مرحوم پروفیسر نجیب اشرف ندوی
کے علمی و ادبی کارناموں کا
تذکرہ ۔

۱۳۷ نورالسعید اختر ، ڈاکٹر
گاندھی جی کا تصورِ حیات
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹، اکتوبر، نومبر و دسمبر)
گاندھی جی کے تصورِ حیات کے
چند مظاہر کی وضاحت کی ہے ۔

۱۳۸ وثیر امین‌اللہ
احمد ابن زیدون
(المعارف، لاہور، مارچ ۶۹، ۱۱ تا ۲۴)
اندلس کے اسلامی عہد کے نامور
شاعر اور ادیب ابوالولید احمد
زیدون کے حالات زندگی اور
شاعری کا جائزہ لیا ہے ۔

۱۳۹ یونس اگاسکر
گاندھی جی کے عمرانی نظریات
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)
گاندھی جی کے بعض بنیادی خیالات
کا ہندوستانی عمرانیات کے تناظر
میں جائزہ لےکر ہندوستانی
معاشرت پر انکے اطلاق سے
بحث کی ہے ۔

تنقید، ادب و لسانیات

۱۴۰ آزاد جگن ناتھ
غالب اور اقبال
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، جنوری و مارچ، شمارہ ۱ و ۲)
صفحات: ۵ تا ۲۶) علی الترتیب ۱ ۷ تا ۸۱)
غالب اور اقبال کے کلام میں مماثلت
کے روشن پہلو اجاگر کیے ہیں ۔

۱۴۱ ابومحمد سحر ڈاکٹر
کچھ نسخۂ حمیدیہ کے
(شاعر بمبئی، فروری و مارچ ،
دیوان غالب کے ن
کی اہمیت پر روشن

۱۴۲ ابومحمد سحر (ڈاکٹر
« نسخۂ حمیدیہ »
چند غلطیوں کا ازالہ
(اردو ادب، غالب نمبر
نسخۂ حمیدیہ کی
انوارالحق نے کی
بجنوری کا اس سے
نہیں ۔ یہ نسخہ ، نہ
متداول دیوان او
مطبوعہ کلام پر ،

۱۴۳ احمد علی‌خان ادیب
لغات غالب
(سب رس، حیدرآباد، غالب
اُن فارسی الفاظ ، محاو
کی تشریح کی ہ
کے کلام میں
متصرّف ہیں ۔ ہ
تدوین لغاتِ غالب کا

۱۴۴ احمدابراہیم علوی
مکاتیب غالب اور انکی
(اردو ادب، غالب نـ
خطوطِ غالب کا ادبی نـ
جائزہ لیا ہے ن

ہے کہ یہ خطوط کلام غالب
کے سمجھنے میں معاون ہیں ۔

۱۴۵　احمر لاری
«آفتابِ ہند»
(نوائے ادب، بمبئی، اپریل، شمارہ ۲ ۵۸ تا ۶۸)
انیسویں صدی کے وسط میں بنارس
سے شائع ہونے والے اردو
اخبار «آفتاب ہند» کی زبان
و انداز بیان کا جائزہ لیا ہے ۔

۱۴۶　احمر لاری
غالب کا تنقیدی شعور
(فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر، نومبر ۶۸ ۲۲۳ تا ۲۲۹)
غالب نے اپنے تنقیدی نظریات و
خیالات کے اظہار میں اجتہاد
سے کام لے کر زبان و بیان
کو ایک نئی راہ دکھائی ہے
اور شعر و ادب کو ایک نیا
موڑ دیا ہے ۔

۱۴۷　احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سیّد
ادبی تنقید میں فن برائے فن کا نظریہ
(سب رس، حیدرآباد، مئی ۱۹۶۹، ۱۷ تا ۱۸)
ایک ایسے احساس جمال کی باز
آفرینی جسمیں تعلیمی مقاصد
مفقود ہوں اورجذبات کا غیر
معمولی غلبہ بھی نہ ہو لیکن
روحِ انسانی کو مسرت بخشتا
ہو، فن برائے فن کا صحیح
نمونہ ہے ۔

۱۴۸　احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سیّد
ادبی تنقید کا تاثراتی نظریہ
(سب رس، حیدرآباد، جولائی ۶۹، ۲۴ تا ۲۶)
تاثراتی تنقید کی بنیاد نظریات و
اصول پر نہیں بلکہ ناقد کے
اپنے ذوق جمال او وجدان پر
ہوتی ہے ۔
تاریخی، سماجی اور اجتماعی
حالات کے پس منظر کے
مطالعے کے ساتھ جو تنقید
ہوتی ہے وہ صحیح تنقید نہیں
ہے ۔

۱۴۹　احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سیّد
غالب اور متنّبی کا تقابلی مطالعہ
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ستمبر ۶۹)
غالب اور متنّبی کے حالات زندگی
اور کلام میں توارد پایا جاتا
ہے ۔ دونوں کی انا نیت ایک
جیسی تھی ۔

۱۵۰　احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سیّد
ادبی تنقید کا تاریخی نظریہ
(سب رس، حیدرآباد ۶۹ مارچ)
ادب اور تاریخ کا رشتہ بتایا ہے
اور تاریخ کے تناظر میں ادب
کا جائزہ لینے کی اہمیت و
ضرورت بیان کی ہے

۱۵۱　احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر سیّد
(ادب میں تحریکِ رومانیت)
(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ فروری)

یورپ میں تحریکِ رومانیت کا آغاز
و ارتقاء بتایا ہے رومانیت کا مفہوم
سمجھایا ہے اور اردو میں اسکی
نشاندہی کی ہے۔

۱۵۲ احتشام حسین
غالب کا تفکر
(فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر و نومبر ۶۹، ۲۵ تا ۴۴)
غالب کے شعور کی جستجو اس
پس منظر میں کرنے کی کوشش
کی گئی ہے جس سے غالب
متاثر ہوئے اور جس کو غالب
نے متاثر کیا۔

۱۵۳ اختر اورینوی
اردو شاعری اور غالب۔ ایک مطالعہ
(فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر و نومبر ۶۹، ۱۱۳ تا ۱۱۷)
یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے
کہ غالب ایشیا کے عظیم کلچر
کا مظہر ہے۔

۱۵۴ اختر اقبال کمالی
کلام غالب میں تمثالِ شعری کا مقام
(صحیفہ لاہور، جنوری ۶۹، ۳۴۲ تا ۳۶۹)
Poetic Image کا مفہوم ادا کرنے
کے لئے تمثالِ شعری کی اصطلاح
اختیار کی ہے اور کلام غالب
میں تمثالِ شعری کا مقام دکھلایا
ہے۔

۱۵۵ اسلوب احمد انصاری
ابوخاں کی بکری اور چودہ اور
کہانیاں
(اردوادب، علی گڑھ، ذاکر نمبر ۹
ڈاکٹر ذاکر حسین ک
کی بکری اور دیگ
کہانیوں پر تنقید ی

۱۵۶ اسلوب احمد انصاری
ابر گہر بار کا ایک پہل
(صحیفہ، لاہور جنوری ۶۹
غالب کی ناتمام مثنو
کافی تجزیہ کیا ہے

۱۵۷ اظہر علی فاروقی
خطوط نگاری میں مرزا
ایک پیشرو
(سب رس، حیدرآباد، غالب
غالب سے پہلے رجب
سرور اور خواجہ
پیغمبر نے اردو
لکھے ہیں۔ مقالہ
کی خطوط نگاری کا

۱۵۸ اعجاز اختر
نئی شاعری کا مثبت
(شاخسار، دوماہی کٹک، شمارہ ۲۴،
بتایا ہے کہ نئی شاعری
کا الزام غلط اور
موجودہ شاعر حالاد
کے عزائم بھی رکھتے

۱۵۹ اعظمی فیض الرحمان
نوادرات شبلی
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، شمارہ ۳، ۹
شبلی کے فارسی کلا

جائزہ انکے دواوین دستۂ گل
و بوئے گل کو سامنے رکھ
کر کیا ہے۔

۱۶۰ اکمل یزدانی جامعی
شوکت جنگ اور سراج الدولہ کی
جنگ بلدیہ باڑی
(سور نامہ کی روشنی میں)
(معارف، اعظم گڈھ، ۶۹ نومبر)
۱۷۵۶ء کا ایک تاریخی واقعہ
جو آلہا اودل کے طرز پر
لکھے گئے "سو نامہ شوکت
جنگ بہادر" میں ملتا ہے۔

۱۶۱ اکمل ایوبی ڈاکٹر
اردو میں ترکی زبان کے الفاظ
(معارف اعظم گڈھ دسمبر ۶۹)
اردو میں ترکی زبان کے الفاظ
کی چھان بین کی ہے۔

۱۶۲ اکبر حیدری ڈاکٹر
ناسخ اور انکا قدیم ترین دیوان
مطبوعہ
(شیرازہ دوماہی سرینگر جنوری ۶۹ شمارہ ۱ ۶۴ تا ۸۷،
مارچ ۶۹ شمارہ ۲ ۸۸ تا ۱۰۲)
کتب خانہ آصفیہ میں موجود
مطبوعہ دیوان کو ناسخ کا قدیم
ترین مطبوعہ دیوان قرار دیا ہے
اور انکی قادرالکلامی سے
بحث کی ہے۔

۱۶۳ اکبر علی خان
غالب کا دریافت طلب مخطوطۂ
دیوانِ اردو
(تحریک دہلی ستمبر ۶۹ (۱۶ تا ۹)
دیوان غالب کا ایک مخطوطہ
ملا ہے اس کا تفصیلی مطالعہ کر
کے اس تیسرے نسخے کا وجود
تسلیم کرنے کے وجوہ پیش
کئے ہیں۔

۱۶۴ امیر حسن نورانی
غالب کی فارسی نثر
(جامعہ دہلی، غالب نمبر فروری مارچ ۶۹)
ایک تنقیدی جائزہ ہے۔

۱۶۵ امیراللہ شاہین
اردو ناول کے عظیم کردار
(آجکل، دہلی، ستمبر ۶۹، ۳۶ تا ۴۰)
اردو ناول کے ان چند عظیم
کرداروں کا ذکر کیا ہے، جو کہ
ہماری معاشرتی تبدیلیوں اور سیاسی
معاشی حالات کے غماز ہیں۔

۱۶۶ انور صدیقی
غالب
ارضیت اور عینیت کی کشمکش میں
(جامعہ، دہلی، غالب نمبر، فروری، مارچ ۶۹)
کلام غالب کا نفسیاتی تجزیہ
کرتے ہوئے بتایا ہے کہ غالب
زمین سے زیادہ وابستہ ہے اور
زندگی کے اثباتی پہلو کو اپنائے
ہوئے ہے۔

۱۶۷ انعام الحق کوثر ڈاکٹر
غالب و ناطق

(افکار، کراچی، غالب نمبر)
آپسی تعلقات، خط و کتابت،
اور کلام میں مماثلت پر روشنی
ڈالی ہے۔

۱۶۸ ایڈورڈ کرن
ارشد علی خاں
سوویت ادیبوں کی بے چینی
(تحریک، دہلی، جنوری ۶۹، ۳۰ تا ۲۹)
اس مضمون میں ترجمہ نگار
نے روسی ادب اور حکومت کی
آپسی کشمکش کا پس منظر بتاتے
ہوئے اسکی مختلف منزلوں کو بتایا
ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ ادیبوں
کی سرکشی پر کس طرح حکومت
کی پالیسی سخت ہوتی گئی اور
اسٹالین نے اس میں کیسا رول
ادا کیا۔

۱۶۹ باقر مہدی
بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے
میں ذاکر صاحب کے کچھ خیالات
(اردو ادب، علی گڑھ، ذاکر نمبر ۶۹، شمارہ ۲)
ذاکر صاحب کے خیالات کا
خلاصہ مختلف تقریروں سے یکجا
کرکے پیش کیا ہے۔

۱۷۰ بدیع الزماں خاور
مراٹھی ادب: ایک تعارف
(شاعر، بمبئی، ۶۹ مئی، جون)
مراٹھی ادب کی سات سو سالہ
تاریخ پر ایک تعارفی مضمون ہے۔

۱۷۱ بدیع الزماں
جدید ہندی افسانہ
تحریک، دہلی، ۶۹،
ہندی کہانی کی دنیا
عصر یا عصریت کا چرچا
شور سے ہورہا ہے

۱۷۲ بشر نواز
اردو شاعری کے دو رجہ
(میر و غالب)
(شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۶۹، ۱۲
میر اور غالب کا
مذاق شعر ایک دوسرے
مختلف تھا

۱۷۳ بشیر احمد ڈار
غالب اور اقبال
(سہ ماہی اردو، کراچی، اپریل تا جون ۶۹،
یہ بتایا ہے کہ اقبال غالب
بلند خیالی سے متاثر
اور کلام غالب میں ا
بننے پر بھی زور دیا گ

۱۷۴ بشیر الدین بشیر
خطوط غالب کی
تاریخی اور ادبی حیثیت
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹
اردو خطوط پچاس سال
کے بعد لکھے گئے ہیں ا
بنیاد بنا کر سوانحی نتائج
اختلافی مسئلے کا باعث

۱۷۵　تاش مرزا خال مرزائیف
اردو اخبارات کی زبان
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، شمارہ ۳، ۲۶ تا ۴۹)
اردو اخبارات میں استعمال ہونے والے الفاظ کا مفصل جائزہ لیا ہے۔

۱۷۶　تنویر احمد علوی، ڈاکٹر
غالب اور شعور حیات
(صحیفہ، لاہور، اپریل ۶۹، ۸۶ تا ۹۷)
غالب کی شخصی آنا اور شعوری انفرادیت کا جائزہ لیا ہے۔

۱۷۷　جعفر حسین مرزا
خمریات غالب
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، جنوری ۶۹، شمارہ ۱، ۴۴ تا ۵۴)
غالب کی شراب نوشی سے بحث کی ہے اور خمریات سے متعلق اشعار کا جائزہ لیا ہے

۱۷۸　جعفر صادق سید
پیروڈی اور کنہیالال کپور
سب رس، حیدرآباد، ۶۹ جنوری
پیروڈی کی تعریف کی ہے اردو پیروڈی نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور کنہیالال کپور کی پیروڈیوں پر تنقید کی ہے۔

۱۷۹　جلیل قدوائی
حضرت سیماب اکبرآبادی
(شاعر، بمبئی، ۶۹ جنوری)
شخصیت اور کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

۱۸۰　جلیل جالبی
طرز غالب
(اردو سہ ماہی، کراچی، اپریل تا جون ۶۹، شمارہ۲ ص ۲۰۹ تا ۲۲۰)
یہ بتایا ہے کہ غالب کے انداز بیان میں مختلف عوامل کی کارکردگی سے انکا مزاج بنا ہوگا اور جب یہ مزاج اظہار کے روپ میں آیا تو اس سے غالب کا طرز وجود میں آیا۔

۱۸۱　چوہان دیوی سنگھ
کلمتہ الحقائق کا لسانیاتی مطالعہ
(نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۶۸، شمارہ ۳، ۲۷ تا ۶۰)
سید شاہ برہان الدین جانم بیجا پوری کی دکھنی ہندی کی تصنیف کلمتہ الحقائق کالسانی جائزہ لیا ہے۔

۱۸۲　چوہان دیوی سنگھ
لفظ گرتی کی قرأت
(نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۶۹، شمارہ ۲، ۲۰ تا ۲۷)
لفظ گرتی جس کے معنی باعصمت عورت کے ہیں صحیح قرأت متعین کی ہے۔

۱۸۳　حباب ہاشمی
نیاز فتح پوری اور جذبات بھاشا
(سب رس، حیدرآباد، جون ۶۹، ۲۶ تا ۳۲)
«جذبات بھاشا» نیاز فتحپوری کی ایک تالیف ہے جس میں زبان

بھاشا کے مشاہیر کے کلام کے
نمونے پیش کرکے بھاشا کی
خصوصیات مثلاً جنس لطیف
کی طرف سے تخاطب نرم و
نازک الفاظ اور روزمرہ کے
محسوسات سے متعلق تشبیہات
و استعارات کی وضاحت کی
ہے۔ ایک تنقیدی جائزہ ہے۔

۱۸۴ حسن عباس فطرت
اردو میں مرقع نگاری
(آہنگ، لکھنؤ، اکتوبر ۶۹، ۲۷ تا ۳۴)
اردوادب میں مرقع نگاری کا جائزہ
لیتے ہوئے ممتاز مرقع نگاروں کی
تحریریں پیش کی ہیں۔

۱۸۵ حسن عسکری پلکھنوی
بیدل اور غالب
(اردوادب، غالب نمبر، علی گڑھ، ۶۹)
بیدل اور غالب کا تقابلی مطالعہ
بحوالہ اقبال کیا ہے، نیز
دونوں کا تاریخی و تہذیبی پس
منظر پیش کیا ہے اور دونوں
کی ذہنی ساخت اور کلام کا
مقابلہ و موازنہ کیا ہے۔

۱۸۶ حسینی شاہد، ڈاکٹر
اردو کا پہلا ساقی نامہ اور اسکا مصنف
(اردو سہ ماہی، کراچی، اپریل تا جون ۶۹، شمارہ ۲)
ص ۲۲ تا ۳۸)
شاہ معظم کو اردو کا پہلا ساقی
نامہ لکھنے والا بتایا
ساقی نامہ کا نام ساقی نامہ
مالا بتایا ہے۔

۱۸۷ حسینی خواجہ سید
نوراللغات کا تقابلی مطالعہ
(اردو ادب، علی گڑھ، ۱۰۰
امیراللغات اور فرہنگِ آ
ساتھ نوراللغات کا تقا
کرکے بتایا ہے کہ نو
جامع اور مبسوط ا
اضافہ کا باعث ہے لیکن
کو آگے بڑھانے میں
کوئی مدد نہیں ملتی۔

۱۸۸ حشم الرمضان
غالب کی شعری بول چال
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر
بول چال اور لب و لہجہ ک
کی تشریح کرتے ہو
کے انداز بیان کی ا
کی طرف اشارہ کیا

۱۸۹ حنیف نقوی ڈاکٹر
ریاض الفصحا
(اردو ادب، علی گڑھ، ۹۰
مصحفی کے تیسرے اور
تذکرے ریاض الفصحا
جائزہ لیکر بتایا ہے ک
سوانح نگاری اور
کے نکتۂ نظر سے
معیار پیش نہیں ک

۱۹ حفیظ قتیل ڈاکٹر
غالب کی وارستہ مزاجی
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
غالب کی وارستہ مزاجی ہر قسم کی روایت پرستی سے بغاوت کرتی ہے اور طرفہ یہ کہ بغاوت کے رجحان سے بھی بغاوت کرتی ہے۔

۱۹ حامداللہ ندوی
غالب کی اک سعیِ لاحاصل
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
غالب کے فارسی کلام کی غیر مقبولیت اور اردو کلام کی مقبولیت کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹ حامداللہ ندوی
سبدچین اور غالب کے انگریز ممدوح
(شاعر، بمبئی، فروری، مارچ ۶۹، ۲۹۲ تا ۲۹۴)
غالب کے فارسی اشعار کے مختصر مجموعہ سبدچین میں ان قصاید یا قطعات کا ذکر کیا ہے جن میں انگریزوں کی مدح ہے۔

۱ حامداللہ افسر
غالب کے ساتھ نا انصافی
(فروغ اردو، دسمبر و نومبر ۶۸، ۱۵ تا ۱۸)
رشک و حسد کو غالب کی زندگی کا فلسفہ قرار دینے والوں پر تنقید کی ہے۔

۱ حامد حسین ڈاکٹر سید
دیوانِ غالب
(نسخۂ بھوپال) پر
ثبت دستخط اور مہریں
(شاعر، بمبئی، ۶۹ جولائی)
نسخۂ بھوپال پر ثبت دستخطوں اور مہروں کے پیش نظر بعض نتائج اخذ کئے ہیں۔

۱۹۵ حامد حسین سید ڈاکٹر
دیوان غالب (نسخۂ بھوپال) کی کہانی کتابت سے گمشدگی تک
(اردو ادب، غالب نمبر، علی گڑھ، ۶۹)
مضمون نگار کا خیال ہے کہ یہ نسخہ ابتداً غالب کے برادر نسبتی مرزا علی بخش خاں رنجور کے پاس رہا ہوگا۔ اس نسخہ سے متعلق دیگر معلومات درج ہیں۔

۱۹۶ حامد حسین، سید ڈاکٹر
میاں فوجدار محمد خاں اور غالب
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
میاں فوجدار محمد خاں کے حالات زندگی نیز غالب اور «نسخۂ حمیدیہ» سے ان کے تعلق سے متعلق تحقیق طلب امور پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۷ خالمرزائیف تاش مرزا
اردو اخبارات میں ہندی الفاظ
(آجکل، دہلی، دسمبر ۶۹، ۱۳ تا ۱۸)
تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو اخبارات

میں ہندی الفاظ کے استعمال
کا جائزہ۔

۱۹۸ خان عبد المجید
غالب کی نثر کا تاریخی پس منظر
(شیرازہ دوماہی ، سرینگر ، جنوری ۶۹ ، شمارہ ۱۰
۲۰ تا ۳۸)
یہ بتایا ہے کہ غالب نے سادہ نثر
اس لئے اختیار کی کیونکہ اسے
فارسی انشاء کی نکتہ آفرینیوں
کے لئے اپنی جسمانی صحت
کے سرچشموں پر اعتماد نہ رہا تھا۔

۱۹۹ خواجہ احمد فاروقی ، ڈاکٹر
غالب کا سکّہ شعر
(صحیفہ ، لاہور ، جنوری ۶۹ ، ۲۶۰ تا ۲۷۲)
دو شعر جو سکے پر لکھے ہوئے
ہیں اور جو غالب سے منسوب
کئے جاتے ہیں غالب اُن کی
تصنیف کے منکر ہیں اس پر
روشنی ڈالی ہے۔

۲۰۰ خورشید احمد فاروق
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان
قسط ۱۶
(برہان ، اپریل ۶۹ ، ۲۳۷ تا ۲۵۴)
گذشتہ سے پیوستہ

۲۰۱ داؤد کاشمیری ، پروفیسر
غالب ۔ اردو کا پہلا ترقی پسند شاعر
(شاعر ، بمبئی ، ۶۹ جولائی)
وسیع معنوں میں غالب کو ترقی
پسند شاعر بتایا ہے اور بتایا ہے
کہ فیض و جعفری کس حد تک
غالب سے متاثر ہیں۔

۲۰۲ دلوی ڈاکٹر عبدالستار
اردو مین دخیل آوازیں
(نوائے ادب ، بمبئی ، جولائی ۶۸ ، شمارہ ۳ ، ۵ تا ۱۱)
بتایا ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان
ہے اور اسکی تشکیل میں فارسی ،
عربی و ہندی و سنسکرت کی
بولیوں کو بڑا دخل ہے۔

۲۰۳ ذکیہ انجم
کشمیر اور اردو شاعری
(آجکل ، دہلی ، جون ۶۹ ، ۳۵ تا ۳۹)
کشمیر کی تعریف اردو شاعروں کی
زبانی ، سب شاعروں کے افکار
کو جمع کردیا گیا ہے۔

۲۰۴ رحم علی الهاشمی
سیمویل ٹیلر کولرج
(تعارف)
(اردو ادب ، علی گڑھ ، ۶۷ ، شمارہ ۴)
مشہور انگریز شاعر کی شخصیت
اور کلام کا تعارف مع ترجمہ
ان شنٹ میرینر

۲۰۵ رشید الدین
غالب کے کلام میں طنز کا پہلو
(شاعر ، بمبئی ، فروری ، مارچ ۶۹ ، ۲۷۸ تا ۲۸۶)
یہ بتایا ہے کہ غالب کے طنز میں
پھکڑپن نہیں بلکہ وقار ، سطحیت

نہیں بلکہ گہرائی، جھنجھلاہٹ
نہیں بلکہ زیرلب مسکراہٹ،
قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت اور
عامیانہ پن نہیں بلکہ معیاری وقار
ملتا ہے۔

۲۰۶ رضی الدین احمد، ڈاکٹر
غالب اور ابو الکلام
اردو کے دو بڑے انانیت پسند
(سب رس، حیدرآباد۔ غالب نمبر، ۶۹ نومبر، دسمبر)
ابوالکلام کی انا کو غالب کی انا
سے اعلیٰ بتایا ہے

۲۰۷ زیدی علی جواد
غالبیات کا جائزہ
فروغ اردو، لکھنؤ، مئی ۶۹، ۷ تا ۱۰)
غالب پر لکھی جانے والی اہم تصانیف
کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۸ زیدی علی جواد
داستاں کہتے کہتے . . .
(آجکل، دہلی، دسمبر ۶۹، ۲ تا ۸)
علی عباس حسینی کی زندگی اور
ان کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔

۲۰۹ سحر انصاری
غالب کے تین نقاد
(حالی، بجنوری، لطیف)
(افکار، کراچی، غالب نمبر)
تینوں نقادوں کی تنقیدوں کا ناقدانہ
جائزہ لیا ہے۔

۲۱۰ سخی حسن نقوی
دلی کی سماجی زندگی
خطوط غالب کے آئینے میں
(آجکل، دہلی، فروری ۶۹، ۱۶ تا ۲۱)
بتایا ہے کہ خطوط غالب دلی کی
ہم عصر سماجی زندگی پر
دلچسپ و کارآمد روشنی ڈالتے ہیں۔

۲۱۱ سلام سندیلوی ڈاکٹر
غالب کی شاعری میں نرگسیت
شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹، ۳۰ تا ۸۹)
ایک نئی اصطلاح نرگسیت (خود
آرائی) کی تشریح کی ہے اور
غالب کی نرگسیت کا جائزہ
لیا ہے۔

۲۱۲ سلام سندیلوی ڈاکٹر
غالب کے کلام میں پیکریت
(فروغ اردو، نومبر و دسمبر ۶۸، ۹۷ تا ۹۹)
انگریزی لفظ (Imagmary) کا مفہوم
اردو میں مصوری یا محاکات
کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے
مگر مقالہ نگار نے اسکا ترجمہ
پیکر ہی کیا ہے اور غالب کی
غزلوں میں پیکریت دکھانے
کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۱۳ سلام سندیلوی ڈاکٹر
شخصیت کا مفہوم
(اردو ادب، علی گڑھ، ۶۹، شمارہ ۲)
شخصیت کے مفہوم کی وضاحت
کی ہے، مکمل اور ناچیز
شخصیتوں کے نفسیاتی عوامل
کی علم نفسیات کی روشنی میں

نشریح کی ہے ۔

۲۱۴ سلیمان اطہر جاوید ڈاکٹر

مرزافرحت اللہ بیگ کا طنزومزاح

(سب رس ، حیدرآباد ، ٦٩ جنوری)

تہذیبی اقدار کا رچاؤ ، سماجی مطالعہ ، روایت سے ہم آہنگی اور زبان و بیان پر قابو فرحت اللہ بیگ کے فن طنزومزاح نگاری کے عناصر اربعہ ہیں ۔

۲۱۵ سلیمان اطہر جاوید ، ڈاکٹر

مکاتیب غالب میں سماجی اور تہذیبی پس منظر

(سب رس ، حیدرآباد ، غالب نمبر ، ٦٩ ستمبر

مکاتیب میں غالب کی نجی زندگی اور شخصیت کا پرتو ہی نہیں بلکہ تاریخی واقعات اور سماجی اور تہذیبی حالات کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔

۲۱٦ سہیل بخاری ، ڈاکٹر

غالب کے شعروں کی اردو

(شاعر ، بمبئی ، فروری ، و مارچ ٦٩ ، ٦۴ تا ۷۲)

یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو میں غالب نے دلی کی بول چال استعمال کی ہے جو اردو کے ٹھیٹھ محاورے میں ہریانی بولی کا پٹ ملانے سے بنی ہے ۔

۲۱۷ سید احتشام ندوی

جاحظ کے تنقیدی افکار

(برہان ، دہلی ، جون ٦٩ ، ۳۸۷ تا ۳۹۴)

تیسری صدی کے نصف اول ہی میں عربی ادیب جاحظ نے جو تنقیدی و ادبی کارنامے انجام دئیے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے ۔

۲۱۸ سید حامد حسین ڈاکٹر

غالب کے دو قلمی دیوان اور میر علی بخش خاں رنجور

(اردو سہ ماہی ، کراچی ، اپریل تا جون ٦٩ ، ۱۱ تا ۱۲۵)

غالب کے قلمی دیوان نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کی اہمیت بتائی ہے اور میر علی بخش خاں رنجور کی فرمائش پر لکھے جانے والے رسالے کا ذکر ہے جو کہ رسالہ "پنج آہنگ" میں آہنگ اول کی صورت میں شامل ہے ۔

۲۱۹ سید اختر علی تلہری

عربی کے مستند کتب لغت کے بعض لطیف مسامح

(برہان ، دہلی ، جون ٦٩ ، ۴۲۴ تا ۴۲٦)

قاموس اللغات و منتہی الادب لغات کے دو لطیف مگر سنگین مسامحوں کا تذکرہ کیا ہے ۔

۲۲۰ سید صمد حسین رضوی

غالب کی صحیح تاریخ پیدائش

(اردو سہ ماہی ، کراچی ، جنوری تا مارچ ٦٩ ، شمارہ ۱ غالب نمبر ، ۱۰ تا ۴۸)

غالب کی صحیح تاریخ پیدائش ۸
رجب ۱۲۱۱ هجری مطابق ۸
جنوری۱۷۹۷ع بروزیکشنبہ ہے۔

۲۲۱ سید صمد حسین رضوی
اوج قبول
(غالب کا منجمانہ کلام)
(اردو سہ ماہی، کراچی، اپریل تا جون ٦۹، ۷۴ تا ۸۲)
غالب کے کلام میں علم ہیئت و
نجوم کے جواہر پاروں کی
نشاندہی کی ہے۔

۲۲۲ سید عبداللہ ڈاکٹر
مرزا غالب کا حاسہ انتقاد
فن کا ایسا پختہ شعور جس سے
فن کے کچھ تنقیدی اصول
مرتب کئے جاسکیں اسی کا نام
حاسہ انتقاد رکھا ہے اور اس
حاسہ انتقاد کو غالب کے کلام
میں تلاش کیا ہے۔

۲۲۳ سید محمد محسن
انشائیہ کی چند اہم خصوصیات
(تحریک، دہلی، جولائی ٦۹، ۲۰ تا ۲۹)
انشائیہ کی چند خصوصیات پر
روشنی ڈالی ہے۔

۲۲۴ سید محمودالحسن ڈاکٹر
غالب کی شاعری پر خارجی اثرات
(فروغ اردو، نومبر دسمبر ٦۸ ع، ۱۱۱ تا ۱۲۲)
غالب کی شاعری پر زندگی کے
ان خارجی اثرات کو دکھایا

گیا ہے جن سے داخلے
ترتیب پاتی ہے۔

۲۲۵ شانتی رجن بھٹاچاریہ کلکتہ، ڈا
غالب اور بنگلہ ادب
(فروغ اردو، لکھنؤ دسمبر و نومبر ٦۸، ٦۷ تا ۱
یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بن
زبان میں غالب کے سلسلے
کیا لکھا گیا ہے۔

۲۲٦ شاہد بڈگامی
معرج صلاح منہاخ فلاح
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، شمارہ ۳، ٦۹، ۸۳ تا
معراج صلاح منہاج فلاح کو کشمی
نثر کا اولین مجموعہ قرار
ہے۔

۲۲۷ سجاعت علی سندیلوی ڈاکٹر
غالب کے کلام میں حزنیہ عن
(فروغ اردو، نومبر دسمبر ٦۸ ع، ۵۷ـ تا
مقالہ نگار نے بتلایا ہے کہ غا
کا کلام نشاط غم اور
نشاط کا حسین پیکر ہے
میں غم ہستی اور غم نیستی
فراق غم وصال غم جاناں
غم دوراں سب ہی کچھ ہ

۲۲۸ شریف احمد شرافت نوشاہی
پنجاب میں اردو غزل کی نام
حضرت نوشہ گنج بخش قدس
کا اردو کلام
(معارف، اعظم گڈھ، نومبر ۱۹٦۹ ع صفحہ ۲۸۳ تا ۹۰

حضرت نوشہ گنج بخش متوفی
۱۰۶۴ھ کو دیگر تمام اوّلین
شعراء پر جو بعض محققین کے
ہاتھوں غزل کی تاسیس کے
دعویدار ہیں، زمانی فوقیت
حاصل ہے۔ حضرت کی دو
اردو غزلیں بھی پیش کی ہیں۔

۲۲۹ شعیب اعظمی
شبلی ۔ منکر غالب
(جامعہ دہلی، غالب نمبر، ۶۹، فروری ۔ مارچ)
شبلی، غالب سے حد درجہ متأثر تھے
اگرچہ وہ غالب کو اہل زبان
نہیں جانتے تھے۔

۲۳۰ صالحہ عابد حسین
غبار کارواں
(آجکل، دہلی، دسمبر ۶۹، ۱۰ تا ۱۲ و ۱۸)
صالحہ عابد حسین نے اس مضمون
میں ان افراد، واقعات اور کتابوں
کا ذکر کیا ہے جو کہ ان کی
شخصیت کی تعمیر میں کارفرما
رہی ہیں۔

۲۳۱ صباح الدین عبدالرحمن سیّد
غالب ۱۷۹۷ ۔ ۱۸۶۹ ع
مدح و قدح کی روشنی میں
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ فروری، مارچ، اپریل، مئی)
گذشتہ سو سال میں غالب سے
متعلق بصورت مدح و قدح جو
اہم تحریریں منظر عام پر آئی
ہیں ان کا جائزہ لیا ہے۔

۲۳۲ صدیقی سعادت علی
غالبیات ایک نظر میں
فروغ اردو، لکھنؤ، مئی ۶۹ (۱۳ تا ۱۹)
غالب کی اردو فارسی تصانیف،
ان کے مختلف ایڈیشن، اردو
دیوان کی شرحیں، غالب سے
متعلق تصانیف، ادبی و تنقیدی
کتابوں میں غالب پر مضامین
اور غالب صدی کے غالب
نمبروں پر مشتمل شماریہ

۲۳۳ صدیقی ظہیر احمد ڈاکٹر
فانی کا تصوف
(نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۶۸، شمارہ ۳، ۶۱ تا ۷۶)
فانی کی شاعری میں تصوف کے
عنصر کا جائزہ لیا ہے۔

۲۳۴ ضیا احمد بدایونی
محاورات غالب
(آجکل، دہلی فروری ۶۹ ۸ تا ۱۳)
غالب نے محاورات کا استعمال اپنے
کلام میں توسیع زبان کے لئے
کیا ہے۔

۲۳۵ ضیاء الحسن فاروقی
ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی
ایک موحد، ایک عالم
(جامعہ، دہلی، ۶۹ ستمبر)
بنگالی عالم محقق اور ماہر لسانیات
کا تعارف اور ان کے سات
مضامین کا تنقیدی جائزہ۔

۲۳٦ ضیاءالحسن فاروقی
متاع از دست رفتہ
(جامعہ ، دہلی ، غالب نمبر ، ٦۹ ، فروری ۔ مارچ)
غالب کا فارسی کلام فارسی کی تمام تر شعری روایات کا حامل ہے اور ان میں گرانقدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

۲۳۷ طاہر محسن علوی
چند اصطلاحاتِ غالب
(فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر و نومبر ٦۸ ، ۳۵ تا ۵۸)
غالب کی چند اصطلاحیں مثلاً « خطاب دولگی » « رہ آورد » « رواں پروری ، « ارزش » « کاغذی پیرہن » اور » پیام نومیدیِ جاوید » وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے ۔

۲۳۸ طیب انصاری
معراج العاشقین کا مصنف
(سب رس ، حیدرآباد ۔ ٦۹ مارچ)
ڈاکٹر حفیظ قتیل کی اس تحقیق کو صحیح بتایا ہے کہ معراج العاشقین حضرت خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ حضرت مخدوم شاہ حسینی کی گیارھویں اور بارھویں صدی کی درمیانی تصنیف ہے ۔

۲۳۹ ظاہر حسین سیّد
عظمتِ انسانی پر اقبال کی دو نظمیں
(شاعر ، بمبئی ، ٦۹ جنوری)
« فرشتے آدم کو جنّت سے رخصت کرتے ہیں » اور « روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے » ان دو نظموں کا تنقیدی جائزہ ۔

۲۴۰ عابد حسین ڈاکٹر سیّد
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
(جامعہ ، دہلی ، غالب نمبر ، ٦۹ ، فروری ۔ مارچ)
غالب سلبی نہیں بلکہ ایجابی تصوف کے قائل تھے جو دنیا کے ذرے ذرے کو سرچشمۂ حقیقت اور قوت عمل سے معمور جانتا ہے ۔

۲۴۱ عابدی امیر حسن سید
فارسی ادب میں بھارت کا حصہ
(فروغ اردو ، لکھنؤ ، ستمبر ٦۹ ، ۷ تا ۱۱)
ازمنۂ وسطی میں بھارت میں فارسی کے عروج و ارتقا کا ذکر کیا ہے ۔

۲۴۲ عالی جعفری
مثنوی خوب ترنگ کی فنی و ادبی خصوصیات
(نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ٦۸ ، شمارہ ۴ ۔ ۵ تا ۲۰)
خوب محمد کی مثنوی خوب ترنگ کی فنی و ادبی خصوصیات کا جائزہ لیا ہے ۔

۲۴۳ عبدالحلیم ساحل
ندوی صاحب کی طرز تحریر

(نوائے ادب ، بمبئی، جنوری ۶۹، ندوی نمبر ، شمارہ ۱
۲۶ تا ۳۸)

ندوی صاحب کی تصانیف کو سامنے رکھ کر ان کی طرز تحریر کا جائزہ لیا ہے اور ان کی انشا پردازی پر بحث کی ہے ۔

۲۴۴ عبدالرزاق قریشی

استاد مرحوم

(نوائے ادب ، بمبئی ، جنوری ۶۹ ندوی نمبر شمارہ ۱
۵۶ تا ۶۶)

ندوی صاحب کے حالات زندگی اور تصانیف کا اجمالی جائزہ لیا ہے اور ان کی طبیعت کی بو قلمونی اور رنگا رنگی سے بحث کی ہے ۔

۲۴۵ عبدالسلام خورشید ڈاکٹر

غالب اور ان کی ہم عصر صحافت

(صحیفہ ، لاہور، جنوری ۶۹ ، ۱۰۷ تا ۱۴۵)

اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ غالب کو انکی ہم عصر صحافت نے کس نظر سے دیکھا اور صحافت کے بارے میں غالب کا اپنا طراز عمل کیا تھا ۔

۲۴۶ عبد اللہ چغتائی ڈاکٹر

غالب ، مرات الاشباہ اور حکیم احسن اللہ

(اردو سہ ماہی ، کراچی ، جنوری تا مارچ ۶۹ ، شمارہ ۱ ، غالب نمبر ، ۱۹۱ تا ۲۰۵)

یہ کتاب فرنرماوایان ہند معہ مختصر حالات وزرائے اودھ کا ذکر ہے جس کے مصنف حکیم احسن اللہ خاں تھے اور غالب سے مراسم خاص رکھتے تھے ۔

۲۴۷ عبد اللہ فاروقی ، حافظ

غالب اور فلسفۂ ویدانت

(صحیفہ ، لاہور ، اپریل ۶۹ ، ۱۲۳ تا ۱۲۸)

غالب کے کلام میں آئے ویدانتی فلسفے پر بحث کی ہے ۔

۲۴۸ عبد اللہ ولی بخش قادری

غالب کا کلام — نفسیاتی زاویہ

(جامعہ ، دہلی ، غالب نمبر ، ۶۹ فروری و مارچ)

داخلی کیفیات پر علمی بحث کرتے ہوئے غالب کے اشعار کی تشریح کی ہے ۔

۲۴۹ عبد الستار دلوی ، ڈاکٹر

ہندوستان کا لسانی مسئلہ اور گاندھی جی

(شاعر ، بمبئی ، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)

ہندوستان کے لسانی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گاندھی جی کا حل کس قدر مناسب اور موزوں تھا ۔

۲۵۰ عبدالقوی دسنوی

ابوالفضل محمد عباس رفعت شروانی مرزا غالب کے ایک فاضل شاگرد

(جامعہ ، دہلی ، غالب نمبر، ۶۹ فروری و مارچ)

۲۵۱ عبداللطیف اعظمی
عود ہندی کا پہلا ایڈیشن
جو غالب کی زندگی میں شائع ہوا
(جامعہ، دہلی، غالب نمبر، ۶۹ فروری و مارچ)
سرورق اور دیباچے کا چربہ معہ
تعارف پیش کیا ہے۔

۲۵۲ عبداللطیف اعظمی
غالب — اہم تاریخیں
(جامعہ، دہلی، غالب نمبر، ۶۹ فروری و مارچ)
غالب سے متعلق اہم سن و سال کی
نشاندہی کی ہے۔

۲۵۳ عبداللطیف اعظمی
مخدوم محی الدین
(جامعہ، دہلی، ۶۹ ستمبر)
مخدوم کے کلام پر تبصرہ کیا ہے
اور حالات زندگی بیان کیے ہیں۔

۲۵۴ عبدالودود قاضی
قاطع القاطع
(صحیفہ، لاہور، جنوری ۶۹، ۲۳۷ تا ۲۶۹)
غالب نے قاطع برہان پر جو
اعتراضات کیے ہیں ان پر
روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۵۵ عتیق احمد
غالب کا شعور کائنات
(صحیفہ، لاہور، اپریل ۶۹، ۶۸ تا ۸۵)
غالب کے کائنات کے شعوری ادراک
کا جائزہ لیا ہے

۲۵۶ عتیق احمد
غالب کا ذہن
(افکار، کراچی، غالب نمبر)
الفاظ، تشبیہات اور استعارات کی
حد تک غالب مغل تہذیب کی
نمائندگی کرتا ہے لیکن معانی
اور خیال کے اعتبار سے وہ
اپنے دور سے بہت آگے ہے۔
وہ صاحب نظر ہے، بت شکن ہے۔

۲۵۷ عبدالماجد دریابادی
غالب کا فلسفہ
(فروغ اردو، لکھنو، دسمبر و نومبر ۶۹، ۳۷ تا ۴۲)
غالب کو فطرت بشری کا رازدار،
حکمت ومعرفت کا شیدائی،
معنویت کے بول اور لطافت
و ظرافت کے سروں میں الاپنے
والا بتلایا ہے۔

۲۵۸ عبدالمجید مولوی
عربی زبان و ادبیات
میں ہندی کے اثرات
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ اپریل و مئی)
عربی میں (۱) ہندی و سنسکرت کے
الفاظ و اسماء (۲) امثال و حکم
اور (۳) قصص وحکایات موجود
ہیں جن کی وضاحت اس مضمون
میں ہے۔

۲۵۹ عبد القوی دسنوی
خمخانۂ جاوید اور غالب

(اردو ادب، غالب نمبر، علی گڑھ، ۶۹)
لالہ سری رام کی تصنیف خمخانۂ
جاوید میں غالب کے معاصرین
اور تلامذہ کے سلسلے میں جو
مواد متعلقہ غالب تحریر ہے وہ
سب یک جا کردیا گیا ہے۔

۲۶۰ عبد القوی دسنوی
سید ہاشمی اور نسخۂ حمیدیہ
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
سید ہاشمی کے حاصل مطالعہ کا
خلاصہ اور مضمون نگار کے
ریمارکس۔

۲۶۱ عبد الودود قاضی
مجموعہ دہلی اور غالب
(سہ ماہی اردو، کراچی، جنوری تا مارچ ۶۹، شمارہ ۱
۱۰۳ تا ۱۴۰)
ایک مجموعہ فارسی کا ذکر ہے جو
کہ نیشنل آرکایوز دہلی میں ہے
یہ خطوط کا مجموعہ ہے، خطوط
کی اکثریت محمد علی خاں کے
نام ہے، باقی خطوط علی اکبر
خاں طباطبائی کے نام ہیں۔

[illegible]

اردو اشعار بطور مثا
کیے ہیں۔

۲۶۳ عرش ملسیانی
شاعر گمشدہ
(شاعر، بمبئی، ۹
شاگرد جوش ملسیانی، نر
«شاد» کے والد «درد»
کے حالات زندگی،
اور ادبی کاوشوں کا

۲۶۴ عصمت جاوید
نسخۂ حمیدیہ — ایک جائز
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر
نسخۂ حمیدیہ کا دوسرے نـ
ساتھ تقابلی مطالعہ
پیش کیا ہے۔

۲۶۵ علی جواد زیدی
نجیب اشرف ندوی،
(نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۲۹،

ندوی صاحب کے مـ
کا اظہار کیا ہـ
اردو کی ترویج
کے کارناموں پر

۲۶۶ علی عباس حسینی
غالب نغزگو
(اردو، لکھنؤ
سہ ماہی

کے کلام کی دھوم ملکی
سرحدوں کو پار کر کے دیارغیر
تک پہونچ گئی۔

۲۶۷ عندلیب شادانی
مرزا کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ میں)
(صحیفہ، لاہور، جنوری ۶۹ ، ۱۶۶ تا ۱۸۳)
غالب کی فارسی نثر کے متعلق چند
باتیں لکھی ہیں۔

۲۶۸ عنوان چشتی
غالب اور غالب فہمی
(جامعہ، دہلی، غالب نمبر، ۶۹ فروری و مارچ)
غالب کی شخصیت اور فکر و فن کا
تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے شخصیت
کے تضاد اور فکر وفن کی ژولیدگی
کی طرف اشارے کئے ہیں۔

۲۶۹ غلام احمد فرقت
محسن کاکوروی
(آجکل، دہلی، دسمبر ۶۹ ، ۳۰ تا ۳۴)
اردو کے مشہور نعت گو شاعر محسن
کاکوروی کی زندگی اور شاعری
پر بحث کی ہے۔

۲۷۰ غلام حسین ذوالفقار ، ڈاکٹر
محاسن خطوط غالب
(صحیفہ ، لاہور، جنوری ۶۹، ۲۱۴ تا ۲۳۶)
خطوط غالب کی فنی قدر و قیمت کا
جائزہ لیا ہے۔
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر
اجتماعی احساس

(اردو سہ ماہی، کراچی، جنوری تا مارچ ۶۹، شمارہ ۱،
غالب نمبر ۱۷۵ تا ۱۸۹)
غالب کے اجتماعی احساس کا جائزہ
ان کو خطوط کو سامنے رکھ
کر کیا ہے۔

۲۷۲ غلام رسول مہر
غالب کا تصور جنت و دوزخ
(فروغ ، اردو لکھنؤ، دسمبر و نومبر ۶۹ ، ۳ تا ۷)
یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے
کہ غالب کے کلام میں بھی
ایسے اشعار ملتے ہیں جنھیں جزا
و سزا و آخرت کے متعلق
غالب کے مستقل فلسفے سے کوئی
مناسبت نہیں بلکہ شاعر کی شوخی
طبع کے کرشمے ہیں۔

۲۷۳ غلام رسول مہر
غدر ۱۸۵۷ء خطوط غالب کے
آئینے میں
(تحریک دہلی مارچ ۶۹ ، ۱۹ تا ۲۵)
مضمون نگار نے خطوط غالب کی
روشنی میں غدر کے اسباب پر
روشنی ڈالی ہے۔

۲۷۴ غلام رسول
اُردو املا میں مرزا غالب کا اجتہاد
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر ، ۶۹، نومبر و دسمبر)
ذ ، ہ ، نون غنہ ، ت، ط اور
ہمزہ کے استعمال میں غالب

جو احتیاط برتتے تھے اس کا
ذکر کیا ہے .

۲۷۵ غلام رسول مہر
مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے
(المعارف ، لاہور ، فروری ۶۹ ۲۰ تا ۱۰)
غالب کی نقد و نظر کی صلاحیت
پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی
مختلف تقریظوں کا ذکر کیا ہے
اور فارسی شعراء کے کلام پر
نقد کے نمونے پیش کئے ہیں .

۲۷۶ غلام رسول مہر
غالب کے ہم معنی اردو اور فارسی
کے اشعار
(اردو سہ ماہی کراچی ، جنوری تا مارچ ۶۹ ، شمارہ ۱ ، غالب
نمبر ۲۰۸ تا ۲۲۵)
غالب کے ہم معنی اردو اور فارسی
اشعار مضمون ، بیان اور زبان
کی مناسبت سے جمع کئے ہیں .

۲۷۷ فاروقی اظہر علی
دہے - عوامی مرثیے .
(شاخسار دو ماہی ، کٹک ، شمارہ ۲۴ ، ۲۵ ، ۳۶ تا ۴۰)
دہے ، عوامی مرثیے جو کہ عشرہ
محرم میں دیہاتی عورتیں گاتی اور
روتی ہیں کا جائزہ لیا ہے .

۲۷۸ فریدہ زین
فانی - الم پرست شاعر
(سب رس ، حیدرآباد ، ۶۹ ، جولائی)
فانی کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے
بتایا ہے کہ مہر کا دل اور غالب
کا دماغ یکجا ہوکر فانی کے
قالب میں ڈھل گئے ہیں .

۲۷۹ فریدہ زین
امجد - ایک صوفی - ایک شاعر
(سب رس ، حیدرآباد ، فروری ۶۹ ، صفحہ ۲۵ تا ۳۱)
دکن کے رباعی گو شاعر احمد
حسین امجد کی رباعیات کا
سرسری تنقیدی جائزہ لیا ہے .
رباعیات بصیرت افروز ہیں .
گویا قرآن و حدیث کے مطالب
کی شاعرانہ تفسیر ہیں .

۲۸۰ قدرت نقوی سید
غالب اور ذال معجم
(صحیفہ ، لاہور جنوری ۶۹ ۱۸۴ تا ۲۱۳)
غالب کی یہ رائے کہ فارسی میں ذال
معجمہ نہیں ہے .

۲۸۱ قیصر زیدی
متاعِ بُردہ
دیوانِ غالب کا دوسرا جرمن ایڈیشن
(جامعہ دہلی ، غالب نمبر ۶۹ ، فروری - مارچ)
دیوان غالب کے دو جرمن ایڈیشنوں
سے متعلق تفصیلات

۲۸۲ کبیر احمد جائسی
« غالب ایک ایرانی کی نظر میں »
(اردو ادب ، غالب نمبر ، علی گڑھ ، ۶۹)
ایک ایرانی فاضل ڈاکٹر شفیع
کدکنی کے مقالے کا آزاد ترجمہ .

۲۸۳ کبیر احمد جائسی

مجیر بیلقانی کی غزلیں

(معارف، اعظم گڈھ، اگست ۱۹۶۹ صفحہ ۱۰۵ تا ۱۲۶)

مجیر خاقانی کا شاگرد تھا لیکن امیر خسرو نے غرۃالکمال کی دیباچے میں اس کو خاقانی پر ترجیح دی ہے۔ خاقانی کے کلام میں علوم و فنون کی اصطلاحات بکثرت ہیں اور مجیر اپنے مافی‌الضمیر کو سلیس زبان میں پیش کرتا ہے۔ مجیر کے حالات زندگی بھی مختصراً پیش کئے ہیں۔ باقی

۲۸۴ کمال احمد صدیقی

«اسرار خودی»

(شیرازہ دوماہی، کراچی، شمارہ ۳ ۶۷ تا ۸۲)

اقبال کے فلسفہ خودی کا جائزہ اور ان کی مثنوی «اسرارخودی» پر بحث کی ہے۔

۲۸۵ کنہیا لال کپور

غالب کے اڑیں گے پرزے

(شاعر بمبئی فروری مارچ ۶۹ ۳۷۱تا ۳۷۲)

غالب شکنوں اور غالب پرستوں دونوں کا مذاق اڑایا ہے۔

۲۸۶ گیان چند

تحقیق کے مسائل

(نوائے ادب بمبئی، اپریل ۶۹، شمارہ ۲ (۲۸ تا ۴۱)

اردو میں تحقیق کے مسائل سے بحث کی ہے اور چند عملی تجویزیں تحقیق کی بہتری کے لئے پیش کی ہیں۔

۲۸۷ گیان چند ڈاکٹر

مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال

(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹، اکتوبر، نومبر، دسمبر)

بھاشا سے متعلق گاندھی جی کے وچاروں کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ راشٹر بھاشا کے لئے ہندوستانی چاہتے تھے۔

۲۸۸ گیان چند (ڈاکٹر)

«ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں»

(اردو ادب، علی گڈھ، غالب نمبر، علی گڈھ ۶۹)

غالب نے اردو کے ہندستانی کردار کو مجروح کیا۔ وہ غزل کی روایات کو چھوڑ نہ سکے لہٰذا غالب کا دیوان بین‌الاقوامی شہرت کے معیاری کلاموں کے مقابلے میں پیش کئے جانے کا مستحق نہیں۔

۲۸۹ مالک رام

ذکرِ غالب (کچھ نئے حالات)

(النگار، کراچی غالب نمبر)

پنشن کے مقدمے سے متعلق غالب کی پہلی درخواست کا اردو ترجمہ۔

۲۹۰ مالک رام

تصنیفاتِ غالب

(فروغ اردو ، لکھنؤ ، دسمبر و نومبر ۶۹ (۷۳ تا ۸۱)
غالب کی تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے ۔

۲۹۱ مالک رام
غالب ــــ شخصیت اور شاعری
(فروغ اردو ، لکھنؤ مارچ ۶۹ ۴ تا ۸)
غالب کی شخصیت ۔ شاعری اور شاعری کے ذریعہ انہوں نے اصلاح کی جو کوشش کی اس کا جائزہ لیا ہے ۔

۲۹۲ مبارزالدین رفعت سیّد
غالب کا سماجی شعور
(سب رس ، حیدرآباد ، غالب نمبر ، ۶۹ ستمبر)
غالب وسیع القلب تھے ، سماجی شعور رکھتے تھے ، نئی قدروں کو پسند کرتے تھے اور صاحب نظر بن کو قاعدۂ آسمان » بدلنے کی باتیں سوچتے تھے ۔

۲۹۳ مبارک علی سیّد
عروض اور غالب
(شاعر ، بمبئی فروری مارچ ۶۹ ۱۸۸ تا ۱۹۹)
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب بے مثال شاعر ہونے کے ساتھ بہترین عروضی شعور رکھتے تھے ۔

۲۹۴ متین الدین قاضی
اورنگ آباد میں اردو افسانہ نگاری
(سب رس ، حیدرآباد ، ۶۹ جنوری)
اورنگ آباد کی ادبی سرگرمیوں کا

تاریخی جائزہ لیا ہے ا
افسانہ نگاروں کا تعارف

۲۹۵ محمد اسلم پروفیسر
مبلغ الرجال
(برہان دہلی مئی ۶۹
خواجہ عبیداللہ المعروف ؛ بن خواجہ باقی باللہ نادرفارسی تصنیف کے مخطوطہ پر روش

۲۹۶ محمد انصار اللہ
« حیاتِ غالب ــــ ایک
(اردو ادب ، غالب نمبر ، ،
حالی کی یادگارِ غالب کی محمد میرزا موج کی شائع ہوئی جو آب غالب سے متعلق مض ہے اور ناقص ہے ۔

۲۹۷ محمد انصار اللہ
نکات الشعرا سے متعلق
(اردو ادب ، علی گڈھ
میر کے نکات الشعرا سے حقائق منظرِ تحقیق پیش کئے ہیں ۔

۹۸ محمّد بدیع الزّمان
اقبال کے کلام میں طلســـم آفرینی
(شاعر ، بمبئی ، ،
الفاظ سازی ، الفاظ

استعمال اور رکھ رکھاؤ سے
متعلق اقبال کی دس خصوصیات
گنائی ہیں اور اُن کی تشریح
کی ہے ۔

۲۹۹ محمد بدیع الزّمان
اقبال کا نظریۂ شاعری
(شاعر، بمبئی '٦٩ اپریل)
زبان و بیان سے متعلق اقبال کے
خیالات کی وضاحت کی ہے ۔
نیز اقبال کے نظریۂ شاعری کے
افادی و مقصدی پہلو کی کلام
اقبال سے اقتباسات پیش کرتے
ہوئے تشریح کی ہے ۔

۳۰۰ محمد حفیظ اللہ پھلواروی
سلطان ایلتمش کے جانشینوں کا
علمی ذوق
(فاران، کراچی، فروری ٦٩ ۱۰ تا ۱۵)
رکن الدین فیروز شاہ، رضیہ سلطانہ،
بہرام شاہ، ناصر الدین وغیرہ
کے علمی ذوق کا جائزہ لیا ہے ۔

۳۰۱ محمد حنیف شاہد
سر عبدالقادر اور دیوانِ غالب
(سب رس حیدرآباد، (غالب نمبر ٦٩ ستمبر)
سر عبدالقادر نے غالب کا ایک دیوان
۱۹۱۹ع میں شائع کیا تھا۔
اس سے متعلق تفصیلی معلومات ۔

۳۰۲ محمد حنیف شاہد
مرزا غالب کی چکنی ڈلی
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ٦٩ ستمبر)
چکنی ڈلی پر غالب نے کلکتہ میں
فی البدیہہ تیرہ شعر کہے تھے۔
اس واقعہ کا تفصیلی ذکر ہے اور
میر نثار علی صاحب شہرت کا
اجمالی تعارف۔

۳۰۳ محمد شکیل احمد صدیقی
فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ
رنگ
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ٦٩ ستمبر)
اردو و فارسی کلام کا تقابلی جائزہ
لینے کے بعد بتایا ہے کہ غالب
دونوں اقلیموں کے فرمانروا ہیں۔

۳۰۴ محمد عرفان نگینوی
غالب کے الفاظ میں تکرار صوت
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ٦٩ ستمبر)
تکرارِ لفظ اور تکرارِ صوت سے
غالب حسن معانی، رمزیت اور
ایمائیت پیدا کرتے ہیں۔ اشعار
نقل کرکے اس خیال کی وضاحت
کی ہے۔

۳۰۵ محمد اکرم، شیخ
غالب کا فلسفہ
(فروغ اردو، لکھنو، دسمبر و نومبر ٦٩، ۵۱ تا ۴۲)
غالب کے فلسفہ غم، فلسفہ زندگی اور
دیگر فلسفیانہ حقائق پر روشنی
ڈالی ہے۔

۳۰۶ محمد ایوب واقف
مقدمہ «رقعات عالمگیر» پر ایک نظر
(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ جون)
۴۸۷ صفحات پر مشتمل یہ ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں اورنگ‌زیب کے صحیح کردار کی تصویر کشی کی ہے اور اس بادشاہ پر لگائے ہوئے بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے۔

۳۰۷ محمد بدیع الزمان
اقبال اور طنز
(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ جون)
اقبال کے کلام سے طنز و تعریض کی مثالیں پیش کر کے کلام اقبال کے ایک اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۰۸ محمد ذاکر
اردوی معلّیٰ کا ایک ایڈیشن
(جامعہ، دہلی (غالب نمبر) ۶۹ فروری و مارچ)
اردوی معلی کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ اردو گائیڈ کلکتہ کا تعارف۔

۳۰۹ محمد سید پروفیسر
غالب خستہ جاں
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
غالب شناسی کا تدریجی ارتقاء پیش کیا ہے اور غالب کی خستہ حالی کی داستان ان کے خطوط کی مدد سے پیش کی ہے۔

۳۱۰ محمد عظیم فیروزآبادی
غالب اور فانی
(شاعر، بمبئی، ۶۹ مئی، جون)
غالب اور فانی ایک جیسی مسرفانہ عادات کے شکار تھے، دونوں مقروض رہے لیکن فانی اپنی شکست کی آواز ہوکر رہ گئے اور غالب کی سپاہیانہ تگ و دو آخر تک قائم رہی:

۳۱۱ محمد مجیب پروفیسر
ایک مترجم کی سرگذشت
(جامعہ، دہلی، غالب نمبر، ۶۹ فروری و مارچ)
زبان، بیان اور مطالب کے انوکھے پن کی وجہ سے پروفیسر موصوف کو اشعارِ غالب کے ترجمے میں جو دقتیں پیش آئیں ان کا ذکر ہے۔

۳۱۲ محمد منوّر
مرزا غالب کی فارسی غزل
(صحیفہ، لاہور، جنوری ۶۹، ۲۹۲ تا ۳۳۲)
غالب کے فارسی کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

۳۱۳ محمد یوسف ٹینگ
مہجور کی انسان دوستی
(شیرازہ دوماہی، سرینگر، مارچ ۶۹، شمارہ ۲، ۸۲ تا ۸۷)
یہ بتایا ہے کہ مہجور کی شاعری میں انسان دوستی کا عنصر غالب حیثیت رکھتا ہے۔

۳۱۴ معزالدین قادری الملتانی
غالب اور تصوف
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ، کالے میاںؒ اور حضرت غمگینؒ گوالیاری سے غالب کے تعلقات کی روشنی میں بتایا ہے کہ غالب واقعتاً صوفی تھے۔

۳۱۵ مسعود حسین خان
کلام غالب کے صوتی آہنگ کا ایک پہلو
(آجکل، دہلی، فروری ۶۹، ۴ تا ۶)
غالب کے کلام میں صوتی ہم آہنگی کا جائزہ لیا ہے۔

۳۱۶ مسلم ضیائی
غالب اور حیدرآباد
(صبا، حیدرآباد، اگست ۶۹، ۱۲ تا ۱۹)
حیدرآباد میں غالب اور ان کی شاعری پر جو کام کیا گیا ہے اس کا جائزہ لیا ہے۔

۳۱۷ مسیح الزماں، ڈاکٹر
غالب کے طرفدار نہیں
(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹، ۵۵ تا ۶۴)
غالب کی قتیل دشمنی پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۱۸ مسیح الزماں، ڈاکٹر
غالب شہید جستجو
(فروغ اردو، لکھنؤ، نومبر و دسمبر ۶۸، ۱۹ تا ۲۵)
اس مقالہ میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب احساس کمتری کی کونپلوں سے مسلمات کے انحراف اور جستجو و تعقل کے شگوفوں تک پہنچے۔

۳۱۹ مغنی تبسم، ڈاکٹر
غالب کا آہنگِ شعر اور بحروں کا استعمال
(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹، ۱۱۱ تا ۱۲۵)
غالب کے اشعار میں مستعمل بحروں پر بحث۔

۳۲۰ منظر عباس نقوی، ڈاکٹر
اسلوب اور اس کی شکل
(اردو ادب، علی گڑھ، ۶۷، شمارہ ۴)
اسلوب کی تعریف، توضیح کی ہے اور اس کے تشکیلی عناصر کا تجزیہ کیا ہے۔

۳۲۱ میر سراج الدین علی خاں
مرزا قربان علی بیگ سالک
(سب رس، حیدرآباد، غالب نمبر، ۶۹ ستمبر)
غالب کے چہیتے شاگرد، ابو الاعلیٰ مودودی کے نانا سالک کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ۔

۳۲۲ ممتاز حسین
غالب کا آئینہ فن
(اردو سہ ماہی، کراچی، جنوری تا مارچ ۶۹، شمارہ ۱، غالب نمبر، ۲۴۵ تا ۲۷۵)

بتایا ہے کہ غالب نے اپنی شاعری
میں دائمی صداقتوں ، آفاقی
تجربات اور حیات و کائنات کے
متنوع مسائل کی وہ روح نچوڑ
لی ہے جو اس وقت تک زندہ
رہے گی جب تک جدید طرز
احساس زندہ ہے ۔

۳۲۲ موسی مجروح
غالب کا تصور عشق
(فروغ اردو ، نومبر و دسمبر ۶۸ ، ۱۴۲ تا ۱۸۸)
غالب نے عشق کا ایک مخصوص
تصور پیش کیا ہے جس کی
بنیادیں عقلیت مادیت اور مذہبیت
پر استوار ہیں ۔

۳۲۳ مقتدی حسن اعظمی
جدید عربی شاعری کا امام محمود سامی
(برہان ، دہلی ، مئی ۶۹ ، ۲۹۰ تا ۲۹۲)
دور جدید کی عربی شاعری میں
نئی روح پھونکنے والے شاعر
محمود البارودی جس کے ہاتھوں
عربی شاعری کو نیا موڑ ملا کے
حالات زندگی اور شاعری پر
روشنی ڈالی ہے ۔

۳۲۴ مہاتما گاندھی
ہندوستان کی قومی زبان — ہندوستانی
(جامعہ ، دہلی ، گاندھی نمبر ، ۶۹ نومبر)
قومی زبان سے متعلق گاندھی جی
کے بیانات کے کچھ حصے
منتخب کر کے تاریخ وار اصل
حوالوں کے ساتھ پیش کئے ہیں ۔

۳۲۵ میرزا یگانہ چنگیزی
غالب شکن
(افکار ، کراچی ، غالب نمبر)
کلام غالب پر تبصرہ ۔

۳۲۶ میکش اکبر آبادی
مرزا غالب کا مذہب
(شاعر ، بمبئی ، فروری ۶۹ ، ۵۱ تا ۵۴)
غالب کے مذہبی عقاید پر روشنی
ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا ہے
کہ وہ آزاد رو تھے اور تقلید
کو شاعری کی طرح مذہب میں
بھی روا نہیں رکھتے تھے ۔

۳۲۷ میمونہ دلوی ، ڈاکٹر
غالب کی تشبیہیں اور استعارے
(شاعر ، بمبئی ، فروری و مارچ ۶۹ ، ۳۳۸ تا ۳۳۹)
غالب کے کلام میں تشبیہوں اور
استعاروں کے استعمال پر روشنی
ڈالی ہے ۔

۳۲۸ نادم سیتاپوری
غالب ـ تحقیق ـ اپریل فول
(اردو ادب ، غالب نمبر ، علی گڑھ ، ۶۹)
دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں
« بھوپال والی » غزل کی شمولیت
سے متعلق ایک بحث ۔

۳۲۹ نادم سیتاپوری
غالب کے کلام میں تحریف و تصرف

(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹)
غالب کے کلام میں تحریف و
تصرف سے کام لیا گیا ہے اور
اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۳۰ نامی انصاری
غالب کی آنا
کلام غالب کے آئینے میں
(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹، ۲۶۳ تا ۲۶۶)
یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ
غالب کی فکری انفرادیت کا
جوش کلام غالب میں کسطرح
عکس ریز ہے۔

۳۳۱ نجم الاسلام
مختصات نثر غالب
(صحیفہ، لاہور، جنوری ۶۹، ۱۵۵ تا ۱۶۵)
غالب کی اردو نثر کا تجزیہ کرکے
بعض مختصاتِ نثر کی نشان
دہی کی گئی ہے۔

۳۳۲ ندا فاضلی
شاد ــ ایک المیّہ
(شاعر، بمبئی، ۶۹ جولائی)
فریش کمار شاد سے متعلق اپنے
خیالات وتاثرات کا اظہار کیاہے۔

۳۳۳ نذیر الدین میائی
ہوبز کے سیاسی افکار
(جامعہ، دہلی، ۶۹ جولائی)
تاریخی جائزے کے ساتھ سترھویں
صدی کے انگریز مفکر ہوبز
کے افکار پر تبصرہ کیا ہے۔

۳۳۴ نذیر حسین شیخ
ابوالفرج الاصبہانی اور کتاب الاغانی
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ اکتوبر)
چوتھی صدی ھجری کے مشہور
عربی ادیب ابوالفرج اور اس
کی تصنیف کتاب الاغانی کا
تفصیلی تعارف۔

۳۳۵ نور الحسن، ڈاکٹر
غالب کی فارسی شاعری
(فروغ اردو، دسمبر و نومبر ۶۹، ۸۱ تا ۹۲)
غالب کی فارسی شاعری پر روشنی
ڈالی ہے۔

۳۳۶ نورالسعید اختر، ڈاکٹر
تاج الحقائق کا اصلی مصنف
(نوائے ادب، بمبئی، اکتوبر ۶۸، شمارہ ۴، ۲۵ تا ۳۴)
تاج الحقائق کے اصلی مصنف ملا
اسد اللہ وجہی ہیں یہ مدلل طور
پر پیش کیا ہے۔

۳۳۷ نورالسعید اختر، ڈاکٹر
قصہ حسن و دل مختلف زبانوں میں
(شیرازہ دو ماہی، سرینگر، مارچ ۶۹، شمارہ ۲، ۵۱ تا ۶۰)
قصہ حسن و دل جو کہ سنسکرت،
گجراتی، فارسی، ترکی،
دکھنی، اردو اور مراٹھی وغیرہ
میں شائع ہوا ہے اس کی اہمیت
اور ماہیت پر بڑی اچھی روشنی
ڈالی ہے۔

۳۲۹ نور السعید اختر ، ڈاکٹر

مُلا وجہی کی فارسی شاعری

(سب رس ، حیدرآباد ، مئی ۶۹ ، ۳۷ تا ۴۲)

وجہی کی فارسی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے . پہلے دور کی شاعری حقائق کی ترجمانی کرتی ہے اور اس میں جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہے دوسرے دور میں جبکہ وہ شاہی سرپرستی سے محروم ہو گئے تھے « دولت دنیا » سے زیادہ « دولت دین » کے طالب نظر آتے ہیں تیسرے دور میں جب کہ دوبارہ شاہی سرپرستی حاصل ہوئی ان کے کلام میں شعری محاسن اور پختگی پائی جاتی ہے

۳۳۰ نور السعید اختر ، ڈاکٹر

تاج الحقائق کا فنی تجزیہ

(سب رس ، حیدرآباد ، ۶۹ اگست)

تصوف کے موضوع کو وجہی نے تشبیہوں استعاروں اور تمثیلوں سے دلچسپ بنایا ہے .

۳۳۱ نیر اقبال

دریائے لطافت

(شیرازہ دوملی ، سری نگر ، جنوری ۶۹ ، شمارہ ۱ ۵۶ تا ۶۲)

سید انشا کی کتاب دریائے لطافت کو سامنے رکھ کر اس کی لسانی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے .

۳۳۲ ڈیٹر امین اللہ

لاہور میں ابن عربی کے مخطوطات

(المعارف ، لاہور ، فروری ۶۹ ، ۲۷ تا ۴۴)

لاہور میں ابن عربی کے مخطوطات کی نشاندہی کرتے ہوئے ۴۸ مخطوطوں اور ۱۲ مصادر کی فہرست دی ہے .

۳۳۳ وحید اختر ، ڈاکٹر

غالب کا فکری مزاج

(صبا ، حیدرآباد ، اگست ۶۹ ، ۴۱ تا ۵۱)

یہ بتایا ہے کہ غالب کی شاعری کا احساس تو عام ہے لیکن عرفان عام نہیں ہے اور اسے عام کرنے کی ضرورت بتائی ہے .

۳۳۴ وحید قریشی

یادگار غالب میں مولوی محمد حسین آزاد کا حصہ .

(تحریک ، دہلی ، مارچ ۶۹ ، ۵۳ تا ۵۵)

یادگار غالب تیار کرنے میں واقعۃً صرف حالی ہی کا ہاتھ ہے یا اور لوگ بھی شامل ہیں .

۳۳۵ وحید قریشی ، ڈاکٹر

تحقیقاتی کارنامے — ایک جائزہ

(سب رس ، حیدرآباد ۶۹ مارچ)

اردو تحقیق و تدقیق کے میدان میں ہندوستان و پاکستان میں جو کام ہوئے ہیں ان کی خوبیاں اور خامیاں بیان کی ہیں [illegible] [illegible] کا جائزہ لیا ہے .

(برہان، دہلی، اپریل ۶۹، ۲۵۵ تا ۲۷۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

۳۵۵ ابو النصر محمد خالدی، ڈاکٹر
قاموس الوفیات لاعیان الاسلام
(برہان، دہلی، مارچ ۶۹، ۱۶۹ تا ۱۸۴)
فروری ۹۶ کے مقالے کا سلسلہ

۳۵۶ ابو النصر محمد خالدی، ڈاکٹر
قاموس الوفیات لاعیان الاسلام
(برہان، دہلی، فروری ۶۹، ۷۷ تا ۹۲)
شہر اصفہان سے تعلق رکھنے والے
محدثوں کی فہرست بالکل
عصری قاموس کی ترتیب کے
مطابق تیار کی ہے

۳۵۷ احمد خاں صاحب
جغرافیا بطلیموس کے عربی تراجم
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ جنوری)
بتلایا ہے کہ بطلیموس کی کتاب
جغرافیہ کا کوئی صحیح عربی
ترجمہ اس وقت دنیا میں غالباً
موجود نہیں ہے۔

۳۵۸ اصلاحی صدر الدین
تحریک اسلامی اور اس کے مخالفین
(زندگی، رامپور، فروری ۶۹، ۹ تا ۲۶)
غلط فہمی کی بنا پر تحریک جماعت
اسلامی کے خلاف لوگوں کے
دلوں میں جو شکوک و شبہات
پیدا ہوتے ہیں ان کے ازالہ کی
کوشش کی ہے اور مدلل
جواب دئیے ہیں۔

۳۵۹ اطہر مبارکپوری، قاضی
فاتح ہند محمد بن قاسم ثقفیؒ
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ جون و جولائی)
فاتح ہند محمد بن قاسم اور اُس
کے لڑکے عمرو بن محمد قاسم
سے متعلق جو بھی معلومات
پندرہ کتابوں کے مطالعہ سے
ملی ہیں وہ نقل کردی گئی ہیں۔

۳۶۰ انور احمد سوپاروی
(معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۶۹، ۴۴۵ تا ۴۵۹)
کوکن سے متعلق سب سے قدیم
ترین حوالہ بطلیموس (۱۵۰ع)
کی تصنیف سے ملتا ہے۔
عہد عتیق سے لیکر چودھویں
صدی عیسوی تک کے کوکن
کی تاریخ کتب تاریخ اور سکوں
کی مدد سے بیان کی ہیں۔

۳۶۱ ایچ، این کنزرو، ڈاکٹر
گوپال کرشن گوکھلے
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)
گوکھلے اور گاندھی جی کے باہمی
تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۶۲ پیارے لال
نواکھالی میں گاندھی شانتی مشن
(جامعہ دہلی، گاندھی نمبر، ۶۹ نومبر)
نواکھالی کے شانتی مشن میں گاندھی
جی نے جن اصولوں اور کاموں
پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی
اُن کی تشریح

۳۶۳ جعفر رضا بلگرامی ڈاکٹر سید
جمہوریت کا بحرانی دور
(جامعہ، دہلی، ۶۹ اکتوبر)
سیاست ایک پیشہ بن گیا ہے جو پیشہ ورانہ اقدار سے عاری ہو کر جمہوریت کے لئے خطرہ بن گیا ہے۔ یہ اور دیگر جمہوریت منافی عوامل کا جائزہ لیا ہے۔

۳۶۴ جمال الدین، سید
ابن خلدون کا نظریۂ عصبیت
(جامعہ دہلی ستمبر ۶۹)
ابن خلدون کے نظریۂ عصبیت کی تشریح کرتے ہوئے اس سے اتفاق کیا ہے

۳۶۵ جون کارڈیل
سوویٹ یونین میں تاریخ پر نئی نظر ثانی
(تحریک، دسمبر ۶۹، ص ۱۹ و ۴۹)
اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ سوویٹ یونین میں مؤرخ کا پیشہ کافی خطرناک ہے۔

۳۶۶ خورشید احمد فاروق ڈاکٹر
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان
(برہان، دہلی، جولائی ۶۹، ۵ تا ۳۱)
گذشتہ سے پیوستہ

۳۶۷ خورشید احمد فاروق
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان
(برہان، دہلی، مارچ ۶۹، ۱۴۹ تا ۱۶۸)
عربی ادب کے حوالے سے قدیم ہندوستان کی پیداوار، پان، کشمیر کا الماس، برآمد باٹ، پیمانے، سکے، ٹیکس، مشک عنبر، صندل اور گرم مصالحے کے متعلق لکھا ہے۔

۳۶۸ ذکاء صدیقی
سکندر لودھی کے ہندوستان کا علمی، عمرانی اور ثقافتی مطالعہ
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ اگست)
سکندر لودھی کی تخت نشنی کے تاریخی واقعات اور اس کے دور کا علمی، عمرانی اور ثقافتی مطالعہ

۳۶۹ ریاض الحسن، ڈاکٹر
تورانی کون تھے؟
(اردو سہ ماہی، کراچی، اپریل تا جون ۶۹، ۵ تا ۱۰)
سلطنت توران شاہنامہ میں ایک علاحدہ ملک دکھایا گیا ہے جو کہ ایران سے مختلف ہے، اس مضمون میں تحقیق سے یہ ثابت کیا گیا ہے دراصل یہ «بیرونی ایران» کا علاقہ تھی۔

۳۷۰ ظ انصاری، ڈاکٹر
گاندھی جی اور ہندوستانی مسلمان
چند سوالوں کے جواب
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر تا دسمبر)
ہندوستانی مسلمانوں میں گاندھی جی کی مقبولیت اور بعد ازاں ان

سے بدظنی سے متعلق تاریخی
وسیاسی واقعات کا تنقیدی جائزہ۔

۳۷۱ سعید انصاری
مہاتما گاندھی اور خلافت تحریک
(آجکل، دہلی، اکتوبر ۶۹، ۳۶ تا ۴۰)
یہ بتایا ہے کہ گاندھی جی خلافت
کے مسئلہ کو مسلمانوں کا جائز
مسئلہ سمجھتے تھے اور انہوں
نے اسی لئے اس کی حمایت
کی

۳۷۲ شرت کمارچند، ڈاکٹر
گاندھی جی کے اصول فکر کا
معاشی پہلو
(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر، نومبر و دسمبر)
گاندھی جی کے اصول فکر کے معاشی
پہلو کی وضاحت کی ہے اور
موجودہ حالات میں اُس کے
وجوب سے بحث کی ہے۔

۳۷۳ شیخ فرید برہان پوری
کتبۂ مارگلہ
(برہان، دہلی، نومبر ۶۹، ۳۱۴ تا ۳۳۸)
کتبۂ مارگلہ پر ایک معلمانہ نظر
ڈالی گئی ہے۔

۳۷۴ شیخ فرید برہانپوری
آہو خانہ
ممتاز محل کا عارضی مدفن
(آجکل، دہلی، مئی ۶۹، ۲۵ تا ۳۰)
زین آباد، برہان پور دار السرور کے
نواح کی چھوٹی سی بستی ہے
جہاں ممتاز محل کو عارضی طور
پر دفن کیا گیا تھا اس کی
تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۷۵ صاحبزادہ شوکت علی خاں صاحب
سعیدیہ کتب خانے کے نادر مخطوطات
(معارف، اعظم گڈھ، جون، جولائی، نومبر ۶۹
صفحات ۴۲۴ تا ۴۴۳، ۳۳ تا ۴۵ و ۳۵۸ تا ۳۶۲)
ٹونک کے سعیدیہ کتب خانے کے
تقریبا ۴۵ نادر تاریخی مخطوطات
کا تعارف ہے، جن میں بیشتر
فارسی کے ہیں اور دور مغلیہ
اور اوائل دور انگلیسیہ کے
تاریخی ماخذ ہیں نیز حضور اکرم
اور ابتدائے اسلام سے متعلق
تصنیفات کے مخطوطات بھی ہیں۔

۳۷۶ صلاح الدین محمد ایوب
مدرسہ محمدی کے «اماسی» کتب
خانہ میں فنون حرف کے رسالوں
کا ایک مجموعہ
(برہان، دہلی، جون ۶۹، ۴۰۱ تا ۴۰۵)
فنون حرف کے موضوع پر ایک
مجموعۂ رسائل جو محفوظ ہے
اس کے متعلق اہل علم کی
آگاہی کے لئے ضروری امور
قلمبند کئے ہیں۔

۳۷۷ علی جواد زیدی
ایک نئی معنویت

(شاعر، بمبئی، گاندھی نمبر، ۶۹ اکتوبر، نومبر و دسمبر)
بتایا ہے کہ گاندھی جی نے تحریک
آزادی کو کس طرح ایک نئی
معنویت دیکر عوام میں اسے
مقبول کیا۔

۳۷۸ علی محسن صدیقی
قتل حجر بن عدی
(برہان، جنوری ۶۹، د تا ۲۴)
جولیس ولہاؤزن کی جرمن زبان کی
تصنیف « صدر اسلام میں سیاسی
مذہبی مخالف جماعتیں » سے
قتل حجر بن عدی کے واقعات
کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے
اور بتایے کی کوشش کی ہے
کہ حضرت معاویہ نے جب
حجر بن عدی کو قتل کرادیا
تو اس قتل سے طاقتور یمنی
قبائل خصوصا شیعوں کا غصہ
بڑھ گیا۔

۳۷۹ عمری جلال الدین
رامائن اور مہابھارت کی تاریخی حیثیت
(زندگی، رامپور، فروری ۶۹، ۲۷ تا ۳۷)
یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتابیں آسمانی
نہیں ہیں، ان میں بیان کردہ
واقعات ناقابل اعتماد اور افسانوں
سے پر ہیں۔

۳۸۰ فرینک موریس
قیام ہندوستان کے دوران سوتیلانہ
کے تجربے
تحریک، دہلی، نومبر ۶۹، ۳۹ تا ۴۱)
اسٹالن کی بیٹی سوتیلانہ کی نئی
کتاب « صرف ایک برس » کی
روشنی میں بھارت کے متعلق
روسیوں کے حقیقی جذبات کا
انکشاف کیا ہے۔

۳۸۱ گوپال متل
روز الکزمبرگ — لینن کی ایک
ہم‌عصر انقلابی شخصیت
(تحریک، دہلی، مئی ۶۹، ۱۳ تا ۱۵)
بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کی
بانیوں میں سے ایک شخصیت
جو لینن کی دوست اور ساتھی
لیکن وہ اسکی نکتہ چین بھی
تھی اس سے لوگوں کو متعارف
کرایا ہے۔

۳۸۲ گوپال متل
انجمن ترقی پسند مصنفین کے احیاء
کی نئی کوشش
تحریک، دہلی، فروری ۶۹ ۱۱ تا ۱۲)
اس میں مضمون نگار نے کمیونسٹ
ادبی محاذ انجمن ترقی پسند مصنفین
کے احیاء کی کوششوں اور
ڈاکٹر احتشام حسین اور سجاد
ظہیر کی شخصیت پر ادبی بحث
کی گئی ہے۔

۳۸۳ محمد اکبر الدین صدیقی
کتبۂ امین درگاہ بیجاپور

(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ اگست)
امین الدین اعلیٰ سے متعلق تحقیقی
مواد پیش کیا ہے اور ان کی
درگاہ کے کتبات اور دکھنی
کتبے کی تحریریں پیش کی ہیں۔

۳۸۴ محمد اسلم، پروفیسر
اکبر اور نقطوی تحریک
(الفرقان، لکھنؤ، جولائی ۶۹)
اس مضمون میں فاضل مضمون نگار
نے نقطوی فرقہ کی تاریخ اور
عقائد پر بحث کرتے ہوئے اکبر
کی اس تحریک سے دلچسپی
اور لگاؤ کو ثابت کرنے کی
کوشش کی ہے۔

۳۸۵ محمد اسلم
اکبر کا دین الٰہی اور اس کا پس منظر
(المعارف، لاہور، جنوری ۶۹، ۲۵ تا ۵۵)
یہ بتایا ہے کہ اکبر شروع میں
مشائخ کو مانتا تھا لیکن بعد
میں علمائے مذہب سے برگشتہ
ہوکر دین الہی کی بنیاد ایسے
وقت رکھی جبکہ اس کے لئے
ہندوستان کی فضا سازگار تھی۔

۳۸۶ محمد باقر، ڈاکٹر
پاکستانی ثقافت
(المعارف، لاہور، جنوری ۶۹، ۹ تا ۱۶)
یہ بتایا ہے کہ پاکستان میں ثقافت
کے منفی پہلوؤں کی وجہ سے
انتشار بڑھ رہا ہے اور ضرورت
ہے کہ اسے سربلند کرنے کے
لئے ایک نمونہ کا کام انجام
دیا جائے۔

۳۸۷ محمد تقی صاحب
تہذیب کی تشکیل جدید
(معارف، اعظم گڑھ، ۶۹ جنوری تا مئی)
ایک طویل مضمون کی پانچویں تا
نویں قسط۔ قرآن و حدیث اور
مشاہیر کے حوالوں سے نیز دلائل
و براہین سے تہذیب کی بنیادی
اقدار سے بحث کی ہے۔

۳۸۸ محمد خالد صدیقی، ڈاکٹر
"تاریخ قطبی" تصحیح ڈاکٹر مجاہد
حسین زیدی پر ایک نظر
(برہان، دہلی، اگست ۶۹، ۱۲۰ تا ۱۲۸
ستمبر ۶۹، ۱۶۷ تا ۱۸۶)
تاریخ کی ایک اہم کتاب تاریخ
قطبی مولفہ خورشاہ کی اہمیت
کے پیش نظر جامعہ ملیہ اسلامیہ
کے استاد ڈاکٹر سید مجاہد
حسین زیدی نے اسکی تصحیح
کی ذمہ داری اپنے سر لی مقالہ
نگار نے ایک تفصیلی یادداشت
پیش کی ہے۔

۳۸۹ محمد رحمت علی
ہندوستانی معیشت اور بنک کاری
(جامعہ، دہلی، ۶۹ اکتوبر)

ہندوستانی معیشت پر بنکوں کے
قومیانے کے اثرات ، نتائج اور
امکانات کا جائزہ لیا ہے ۔

۳۹۰ محمد عبد المنان ، ڈاکٹر
عصامی اور اس کی تاریخ فتوح
السلاطین
(معارف ، اعظم گڑھ ، ۶۹ اکتوبر و نومبر)
علاء الدین حسن بہمنی کے دور کے
ایک عظیم مصنف اور بلند
پایہ شاعر عصامی اور اس کی
تصنیف فتوح السلاطین کا
تفصیلی تعارف ۔

۳۹۱ محمد عبدالمنان ڈاکٹر
عہد بہمنیہ کی حیاتِ اجتماعی کا
ایک جائزہ
(سب رس ، حیدرآباد نجیب اشرف ندوی نمبر) ۶۹ مئی
اور جون)
مختلف کتب تاریخ کے حوالوں سے
عہد بہمنیہ کی حیاتِ اجتماعی
کا جائزہ لیا ہے ۔

۳۹۲ محمد عبدالمنان ، ڈاکٹر
عہدِ بہمنیہ کے چند تاریخی کتبات
(سب رس ، حیدرآباد ، فروری ۱۹۶۹ ص ۲ تا ۸)
عہدِ بہمنیہ کے تاریخی کتبات کو
دو حصوں میں تقسیم کیا ہے
(الف) عہدِ گلبرگہ کے کتبات
اور (ب) عہدِ بیدر کے کتبات ۔
عہدِ گلبرگہ کے دو کتبات اور
عہدِ بیدر کے نو مقامات کے
کتبات کی عبارتیں مختصر تاریخی
حوالہ جات کے ساتھ پیش
کی ہیں

۳۹۳ محمدعمر ڈاکٹر استاذ تاریخ جامعہ
ملیہ دہلی
ہندو تہذیب اور مسلمان قسط ۱۴
(برہان دہلی اپریل ۶۹ (۲۷۱ تا ۲۸۳)
گذشتہ سے پیوستہ ۔

۳۹۴ محمد عمر ڈاکٹر استاذ تاریخ
جامعہ ملیہ
ہندو تہذیب اور مسلمان قسط نمبر۱۲
برہان دہلی فروری ۶۹ (۱۲۶ تا ۱۳۷)
ہند میں مسلمان ہندو تہذیب سے متاثر
ہو کر کون کون رسومات اور
تقریبات ادا کرنے لگے ۔ اس پر
روشنی ڈالی ہے ۔

۳۹۵ محمد عمر ڈاکٹر استاذ تاریخ
جامعہ ملیہ
ہندو تہذیب اور مسلمان قسط نمبر۱۳
برہان دہلی مارچ ۶۹ ، ۱۹۶ تا ۲۰۶
گذشتہ سے پیوستہ ۔

۳۹۶ محمد عمر ڈاکٹر
غالب کا عہد
(جامعہ ، دہلی ، ۶۹ اپریل)
غالب کے عہد کی معاشی بدحالی ،
سیاسی افرا تفری اور انگریزوں
کی غارت گری کا نقشہ کھینچا ہے ۔

۲۴۶ وحید النساء
چند دکھنی مرثیہ گو شعراء
(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ جولائی)
ایک دکھنی شاعر «سالک» کے مرثیوں کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۲۴۷ وزیر آغا ڈاکٹر
غالب کا ذوقِ تماشا
(شاعر، بمبئی، فروری و مارچ ۶۹. ۲۳۵ تا ۲۴۰)
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب حیات و کائنات کا تماشہ کرنے کے لئے فاصلے کا نہیں قرب کا قائل ہے اور زندگی کے ہر مظہر میں اس کے خاص وصف کی نسبت سے دلچسپی لیتا ہے۔

۲۴۸ وزیر آغا، ڈاکٹر
غالب — ایک جدید شاعر
(صحیفہ، لاہور جنوری ۶۹ ۲۰۱ تا ۲۳۱)
غالب کو جدید شاعر ثابت کیا ہے۔

۲۴۹ وصی احمد علیگ، ڈاکٹر
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر
(فروغ اردو، لکھنؤ، دسمبر و نومبر ۶۸، ۵۹ تا ۶۶)
نمونے کے طور پر چند الحاقی عناصر جو کلام غالب کے ساتھ روا رکھے گئے ہیں پیش کئے ہیں۔

۲۵۰ یوسف علی خاں میر
غالب کی اصلاحیں خود اپنے کلام پر
(سب رس، حیدرآباد، ۶۹ فروری)
غالب کی اصلاحوں کے نمونے بتائے ہیں اور ان کی مناسبت پر اظہار خیال کیا ہے۔

۲۵۱ یوسف جمال انصاری
کلام غالب میں طنز و ظرافت
(قسط اول)
(صحیفہ، لاہور، اپریل ۶۹، ۹۸ تا ۱۰۸)
غالب کے طنز و مزاح پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۵۲ یونس جعفری، ڈاکٹر
خطوط سرور
(نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۶۸، شمارہ ۳، ۱۲ تا ۲۶)
رجب علی بیگ سرور کے ۸ غیر مطبوعہ خطوط پیش کئے ہیں جو کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مربیوں کو لکھے تھے۔

تاریخ و سیاسیات

۲۵۳ آصف فیضی
گاندھی جی اور اقلیتیں
(آجکل، دہلی، اکتوبر ۶۹، ۲۹ تا ۳۲)
یہ بتایا ہے کہ گاندھی جی کی نظر میں ہندو مسلمان سب برابر تھے، اقلیتوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے جان کی بازی لگا دی۔

۲۵۴ ابو النصر محمد خالدی
قاموس الوفیات لاعیان الاسلام

کے نوشتہ کا ترجمہ پیش کیا ہے
اس قسط میں الـطبری نے
ابن الکلبی سے جو کچھ نقل
کیا ہے اس کی نشان دہی کی ہے۔

۴۰۵ نثار احمد فاروقی
تاریخ طبری کے ماخذ
(برہان، دہلی، جون ۶۹ ، ۱۲ تا ۳۲۳)
گذشتہ سے پیوستہ

۴۰۶ نثار احمد فاروقی
تاریخ طبری کے مآخذ
(برہان، دہلی، مارچ ۶۹ ، ۱۸۵ تا ۱۹۵)
گذشتہ سے پیوستہ

۴۰۷ نورالحسن انصاری، ڈاکٹر
نگار نامہ — عہد اورنگ زیب کی
اہم تالیف
(برہان، دہلی، فروری ۶۹ ، ۱۰۵ تا ۱۱۵)
یہ نگار نامہ عہد عالمگیر کے امراء
اور حکام کے خطوط اور
عریضے، شاہزادوں اور بیگمات
کے مراسلات اور خود منشی
لال چند اور دیگر منشیوں کے
ذاتی خطوط پر مشتمل ہے۔

۴۰۸ نیازی برکس، پروفیسر
مترجم ڈاکٹر محمود الحسن صدیقی
ضیاء گوکلپ اور ترک قومیت کی تشکیل
(جامعہ، دہلی۔ ۶۹ جنوری)
ایک ترک مفکر کے افکار و خیالات
کی تشریح کی ہے، سیاسی
پس منظر پیش کیا ہے اور اُس کے
خیالات کا رد عمل بتایا ہے،
نیز ضیاء گوکلپ کے حالات
زندگی بیان کیے ہیں۔

۴۰۹ وحید احمد مسعود
کیا سلطان بلبن کی کوئی بیٹی
حضرت بابا صاحبؒ سے
منسوب تھی؟
(برہان، دہلی، فروری ۶۹ ، ۱۲۸ تا ۱۳۹)
یہ روایت کہ حضرت بابا صاحب
کی شادی بلبن کی صاحبزادی
سے ہوئی تھی اس کی تردید
کی ہے۔

۴۱۰ ونوبا بھاوے
ستیہ اور اہنسا
(جامعہ، دہلی، گاندھی نمبر، ۶۹ نومبر)
گاندھی جی کے ستیہ اور اہنسا کے
اصولوں اور گاندھی جی کی
شہادت پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۱۱ ہمایوں کبیر، پروفیسر
ترجمہ: عبد اللطیف اعظمی
عرب و ہند کے تعلقات
(جامعہ، دہلی، ۶۹ ستمبر)
دور قدیم اور دور حال عرب و ہند
کے تعلقات، ثقافتی و تجارتی
لین دین اور سیاسی یگانگت کا
جائزہ لیا ہے۔

۴۱۲ ہمایوں کبیر، پروفیسر
گاندھی جی اور انقلاب ہند
(جامعہ، دہلی، گاندھی نمبر، ۶۹ نومبر)
اُن نظریاتی عوامل کا تجزیہ کیا ہے جنہیں معمولات میں برت کر گاندھی جی نے ہندوستانی سیاست میں ایک انقلاب برپا کیا۔

۴۱۳ یوسف کمال بخاری، سید
داستان مخطوطات ہند
(سب رس، حیدرآباد، مئی و جولائی ۶۹، ۱۰ تا ۱۶ و ۳ تا ۹)
مختصر تاریخ مخطوطات نویس، زبانیں مقامات، رسم الخطوط موضوعات نقش ونگار و تصاویر، مخطوطات کی جلدیں، اشیائے کتب نویس، آلات مخطوطات سازی، ہندوستان کے موجودہ قلمی کتابوں کے کتب خانے اور ہندوستان کے معروف مخطوطات وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت مواد فراہم کیا ہے۔

۴۱۴ نثار احمد فاروقی
تاریخ طبری کے مآخذ
(برہان، دہلی، مئی ۶۹، ۳۴۸ تا ۳۵۵)
گذشتہ سے پیوستہ

۵ متفرقات

۴۱۵ جنگ بہادر سنگھ
سکھوں کے مقدس مقامات
(آجکل، دہلی، نومبر ۶۹، ۲۸ تا ۳۷)
اس مضمون میں ہند و پاک میں سکھوں کے مقدس گردواروں کا مفصل ذکر ہے۔

۴۱۶ محمد عمر
ہندوستان کے بازی گر
(آجکل، دہلی، اپریل و مئی ۶۹، ۲۲ تا ۲۷ و ۴۲ تا ۴۶)
ہندوستان میں قدیم زمانے سے بازی گری کے فن کا رواج رہا ہے اس مضمون میں اس فن سے تی مفصل بحث کی گئی ہے۔

ایڈیٹر: عبدالرزاق قریشی
پرنٹر پبلشر سید شہاب الدین دسنوی نے اوبی پرنٹنگ پریس، ۸، شیفرڈ روڈ، بمبئی ۸ میں چھپوا کر مالکان انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ۹۲، دادا بھائی نوروجی روڈ کے لئے شائع کیا۔

۳۹۷ محمد عمر ڈاکٹر
ہندو تہذیب اور مسلمان قسط
نمبر ۱۶ - ۱۷
(برہان اگست ۶۹، ۱۲۹ تا ۱۲۸، ستمبر ۶۹، ۲.۳ تا ۲۱۱)
(اکتوبر ۶۹، ۲۰۰ تا ۲۸۲، نومبر ۶۹، ۳۳۹ تا ۳۴۹)
گذشتہ سے پیوستہ۔

۳۹۸ محمد عمر ڈاکٹر
ہندو تہذیب اور مسلمان
(برہان دہلی جولائی ۶۹، ۵۷ تا ۷۰)
گدشتہ سے پیوستہ۔

۳۹۹ محمد عمر (ڈاکٹر)
ہندو تہذیب اور مسلمان قسط نمبر ۱۱
(برہان دہلی جنوری ۶۹، ۶۵ تا ۶۸)
ہندو تہذیب سے متاثر نو مسلموں میں دختر کشی اور رسم جوہر کی رسمیں پائی جاتی تھیں، تاریخ کی روشنی میں اس کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔

۴۰۰ محمد عثمان
سر سید اور دو قومی نظریہ
(المعارف، لاہور، جنوری ۶۹، ۵۶ تا ۶۱)
یہ بتاتا ہے کہ جس سیاسی فکر اور نقطۂ نظر کی بدولت پاکستان معرض وجود میں آیا اسکی داغ بیل سر سید نے ڈالی تھی

۴۰۱ محمد نعیم ندوی حافظ
مراکش ــــ آئینۂ ایام میں
(معارف، اعظم گڈھ، ۶۹ اکتوبر)
مراکش کی قدیم و جدید تاریخ اور اسلامی علوم و ثقافت کے پھیلاؤ کا بیان

۴۰۲ محمود الٰہی ڈاکٹر
غالب کا سفر کلکتہ (ایک غلط فہمی کا ازالہ)
(اردو سہ ماہی کراچی، اپریل، مئی، جون ۶۹، ۸۳ تا ۸۸)
یہ ثابت کیا ہے کہ غالب جب ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش کی میت میں بھرت پور روانہ ہوئے تو پھر دہلی واپس نہیں لوٹے بلکہ فیروز پور، لکھنؤ باندہ وغیرہ قیام کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔

۴۰۳ محمود حسن قیصر امروہوی
جہان نامہ تاریخ ہند کا ایک گم شدہ ماخذ
(برہان دہلی فروری ۶۹، ۹۳ تا ۱۰۴)
فارسی زبان میں جغرافیہ کی ایک مختصر کتاب جہان نامہ جس کا مؤلف محمد بن نجیب مکران ہے جو ۱۲۰۸ ع میں بقید حیات تھا تاریخ ہند کے ایک گم شدہ ماخذ ہے۔

۴۰۴ نثار احمد فاروقی
تاریخ طبری کے مآخذ قسط نمبر ۱۲
(گذشتہ سے پیوستہ)
(برہان دہلی فروری ۶۹، ۱۱۶ تا ۱۲۵)
ڈاکٹر جواد علی عراق اکادمی بغداد